رخسانہ نگار عدنان

دل آئینوں کا شہر

”کنا سوہناں تینوں رب نے بنایا، جی کرے ویکھدا رہواں۔

”او کنا سوہنا.....“ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی مسلسل گنگنائے جا رہی تھی۔ اس کے بار بار ایک ہی مصرع دہرانے پر صوفیہ نے اکتا کر اسے دیکھا۔ وہ ایک آنکھ بند کیے دوسری آنکھ سے اس بند آنکھ پر بھی احتیاط سے آئی لائنر لگا رہی تھی۔ بند آنکھ کا پپوٹا اور پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ کالج کے سفید یونیفارم میں لمبے بالوں کی دو چوٹیاں آگے ڈالے وہ کب سے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی تھی۔

”بس کرو مینا! تم کالج جا رہی ہو، کسی فیشن پریڈ میں حصہ لینے نہیں اور پھر تمہیں ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔ خدا نے اتنا حسین چہرہ دے رکھا ہے تمہیں کہ اگر تم اس پر کبھی بھی کچھ نہ لگاؤ تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ صوفیہ نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کالج جاتیں ناں تو آپ کا پتا چلتا لڑکیاں وہاں پورن پوری میک اپ کٹ لے کر آتی ہیں، سارا دن ایک دوسرے کا چہرہ بنا سنوار کر دیکھتی رہتی ہیں کہ کس پر کیسا میک اپ سوٹ کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کی تھریڈنگ کرتی ہیں، پلکنگ کرتی ہیں۔ میں تو بس یہ لائنر لگاتی ہوں۔ صائمہ کہتی ہے کہ اس سے میری آنکھیں خوابناک سی لگتی ہیں۔“

اس نے ذرا سی آنکھ کھول کر لائنر کے خشک ہونے کا اندازہ کیا۔ صوفیہ حیران سی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”اور ڈیر آپی! بات ضرورت کی نہیں ہے، بات ٹرینڈ (رجحان) کی ہے اور خود کو ان رکھنے کی ہے۔ ہمارے کالج میں مجھ جیسی سینکڑوں ہیں، قدرتی حسن و دلکشی کا مرقع مگر آج کل اسی حسن کا سکہ چلتا ہے جسے اپنے وجود کا احساس ہو اور وہ دوسروں کو بھی کھن کھن بج کر اس کا احساس دلا سکے جیسے ابھی ٹکسال

سے نکل کر آیا ہو۔ ایک دم سے نیا نکور لشکارے مارتا ہوا۔ اب یہ خالی گلابی شہابی رنگت کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کے ہونے کا احساس دلانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔'' اس نے دوسری آنکھ بند کرتے ہوئے احتیاط سے باریک لائن کھینچی۔

''توبہ کیسی باتیں کرتی ہو۔'' صوفیہ نے جھرجھری سی لی۔ ''اور پھر اگر یہ باتیں ایسے ہی ہیں، جیسے تم کہہ رہی ہو تو بھی گڑیا، ہمارا ماحول، ہمارا گھرانہ ان باتوں کو بالکل بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ تم یہ بات کیوں بھول جاتی ہو۔ شکر کرو، تایا جی نے تمہیں کالج میں ایڈمیشن دلوا دیا تھا۔ مجھے بھی تو دیکھو، میٹرک کے بعد سے جو گھر میں بیٹھی ہوں۔ پرائیویٹ ایف اے، بی اے اور اب ایم اے۔ اگر تایا جی اور بھیا تمہارے جذبات کا خیال رکھتے ہیں تو تمہیں بھی ان کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے۔'' صوفیہ اٹھ کر اس کے پاس بیڈ کے دوسرے کنارے پر آ بیٹھی اور پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''آپی! حد کرتی ہیں آپ بھی۔ بھلا ایک میرے معمولی سا لائنر لگانے سے ان کے جذبات مجروح ہونے لگیں گے۔ ان کے جذبات کا احترام ہی میں تو میں کالج ایسے جاتی ہوں جیسے کوئی چور تنبو (شامیانہ) اوڑھ کر جاتا ہے۔ کالا سیاہ سر سے پاؤں تک لبادہ کہ آنکھیں بھی نظر نہ آئیں۔ اگر آنکھوں سے رستہ دیکھنے کا کام نہ لینا ہو تو شاید ان کو بھی ملفوف کر دیا جاتا۔ اس گنجی کانی آزادی کا میں کیا شکر ادا کروں۔'' وہ آنکھیں بند کیے لائنر کے خشک ہونے کا انتظار میں بولے جا رہی تھی۔

''آہستہ بولو، تایا جی سن لیں گے۔ وہ ابھی گھر پر ہی ہیں۔'' صوفیہ نے اسے جھڑکا۔

''آہستہ ہی تو بول رہی ہوں۔'' اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر میں اونچا بول بھی لوں تو کون سنے گا یہاں۔ سب بہرے ہیں صرف اپنے مطلب کی بات سننا چاہتے ہیں۔ دوسروں کے حقوق سے متعلق جتنی باتیں ہوتی ہیں، یہ لوگ سن کر بھی بہرے بن جاتے ہیں۔'' وہ اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ برش اٹھا کر دونوں چوٹیوں کے ربر بینڈ سے نیچے چھوڑے ہوئے بالوں میں پھیرنے لگی۔

''آمنہ! بہت بدتمیز ہوتی جا رہی ہو تم، کیا کالج میں یہی پڑھائی ہوتی ہے؟'' صوفیہ خفگی سے بولی۔

''ارے آپ سے کس نے کہا کہ کالج میں پڑھائی ہوتی ہے۔ پڑھائی تو اکیڈمیز میں ہوتی ہے یا پھر ٹیوشن سینٹرز میں کالج میں تو بس فیشن ٹرینڈز کا جائزہ لیا جاتا ہے، گپ شپ ہوتی ہے۔ کوئی کتنی بھی پڑھاکو لڑکی کیوں نہ ہو، فیشن کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور لیتی ہے۔''

''تم سے بحث کرنا فضول ہے۔ اب جاؤ۔ کالج سے دیر نہیں ہو رہی تمہیں۔'' صوفیہ نے کچھ اکتا کر کہا۔

''آپی! یہ ٹاپس اچھے ہیں ناں؟'' اس نے صوفیہ کی توجہ اپنے کانوں میں بڑے خوبصورت سفید نگوں والے ٹاپس کی طرف دلائی۔

''بہت خوبصورت ہیں۔ کہاں سے لیے تم نے؟'' صوفیہ نے تعریف کرتے ہوئے پوچھا۔

''بہت بری عادت ہے آپی! آپ کی بھی۔ کبھی آم سکون سے نہ خود کھائیے گا نہ کسی کو کھانے دیجئے گا۔ ہمیشہ کہاں، کیوں کے چکروں میں پڑی رہتی ہیں؟'' اس نے بیڈ کے دوسرے کونے پر پڑا ایڑا سا کلف شدہ دوپٹہ اٹھایا اور احتیاط سے تہہ کرنے لگی۔

''ہاں تو کیا مجھے پوچھنا نہیں چاہیے کیونکہ تم نے یہ ٹاپس میرے ساتھ تو خریدے نہیں تھے پھر کہاں سے آئے؟''

''ڈائمنڈ کے ہیں نا، کسی بینک کا لاکر توڑ کر اڑائے ہیں میں نے۔ یا کسی جیولر کے شوکیس میں سے پار کیے ہیں۔'' وہ جل کر بولی۔ ''فائزہ نے دیے ہیں مجھے۔ وہ اپنے لیے لائی تھی مجھے اچھے لگے، میں نے تعریف کی تو اس نے مجھے دے دیئے۔ بس ہوگئی تسلی آپ کی؟'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں جتایا۔

''یہ بات ٹھیک ہے۔ اب میں نہ پوچھتی نہ تم بتاتیں۔ میں پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی۔'' صوفیہ نے اطمینان سے کہا۔

''آپی! آپ میں میری امی کی روح حلول کر گئی ہے۔ ہر وقت وہم، فکر، وسوسے جیسے میں کوئی چودہ پندرہ سال کی الہڑ مٹیار ہوں۔ جسے کوئی ایک اشارہ کرے گا اور میں اس کے پیچھے چل پڑوں گی۔ فضول کی فکریں نہ پالا کریں اور غم کیا کم ہیں زمانے میں۔ اور آپ کیا سوچتیں۔'' اس نے دوپٹہ بیگ کے اندر رکھا۔ ''یہی نا کہ یہ ٹاپس مجھے کسی بوائے فرینڈ نے گفٹ کیے ہیں۔ ہیں نا؟''

''توبہ ہے آمنہ! تم تو پیچھے پڑ جاتی ہو۔ ویسے تمہاری خبر گیری کرنا، تمہارے بارے میں فکر مند ہونا مجھے اچھا لگتا ہے۔ ایک تمہی تو ہو میری دوست، میری بہن اور سب کچھ۔'' وہ کچھ اداسی سے بولی۔

''پھر وہی اداسی۔ خبردار آپ اداس ہوئیں تو؟'' اس نے انہیں دھمکی دی اور ان کے پاس بیٹھ کر بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ ''اگر آپ میرے بارے میں فکر مندی ہوتی ہیں تو مجھے اچھا لگتا ہے۔''

''دونوں کو اچھا لگتا ہے تو پھر فکر کیا بات؟'' صوفیہ ہنس دی۔ ''چلو، تمہیں کالج سے دیر نہیں ہو رہی۔ دیکھو بھیا تیار ہو گئے ہوں گے۔'' صوفیہ کی بات پر وہ کھڑی ہو گئی۔

''ہاں دیکھتی ہوں۔ رات کو بھیا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اب نائلہ بھابھی انہیں صحت کے تمام بنیادی حفاظتی اقدامات کرنے کے بعد ہی بھیجیں گی۔'' اس نے بلیک گاؤن پہنتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھے لگ رہے ہیں ٹاپس تم پر؟'' صوفیہ نے اس کے صبیح چہرے پر جگمگ جگمگ کرتے ٹاپس دیکھ کر ایک بار پھر تعریف کی۔ ''اور ویسے تمہیں کسی جیولر کے شوکیس سے ایسی چیزیں پار کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ چند ماہ بعد اس طرح کے نہ جانے کتنے ٹاپس تمہارے قدموں میں ہوں گے۔'' صوفیہ کی بات پر اس کا منہ بن گیا۔

''آپی! صبح صبح یہ فضول ذکر کرنا ضروری ہے۔ ہونہہ!'' اس نے جھک کر بیگ اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا اور حجاب اٹھا کر باہر کی طرف بڑھی۔

''اس ذکر پر اتنا چڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو حقیقت بتا رہی ہوں۔'' صوفیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''ضروری نہیں کہ ہر وقت ہی حقیقت کا زہر پیتے رہو۔ کبھی کبھی اس زہر کو کم اثر کرنے کے لیے انسان کو کوئی حسین سا سپنا بھی دیکھ لینا چاہیے اور خواب دیکھنا تو ہر انسان کا حق ہے۔'' وہ رک کر بولی۔

''بے شک! ہر انسان کا حق ہے، مگر میری جان کبھی بھی خواہش کو اپنے اوپر اس قدر طاری مت کرنا کہ پھر حقیقت واقعی زہر بن جائے۔'' صوفیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور اگر کبھی ایسا ہو گیا؟'' آمنہ نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر کہا۔

''خدا نہ کرے مینا گڑیا کہ ایسا ہو؟'' صوفیہ نے کچھ ڈر کر کہا۔ ''اور اب چھوڑو یہ فضول کی باتیں اور خوش خوش کالج جاؤ۔ میرا خیال ہے، بھیا گاڑی کا ہارن بجا رہے ہیں۔''

''چلیں۔ آپ دعا کیجیے گا۔ ویسے اگر ایسا ہو گیا تو آپی! خوب مزہ رہے گا ایڈونچر ہی سہی۔ اس روکھی بے رونق اور بے مزہ سی زندگی کے لیے ہے نا؟'' وہ دلچسپی سے بولی۔

''مینا! بس کرو۔ چلو جاؤ دیر ہو رہی ہے۔ تمہیں۔'' صوفیہ نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

''او کے پھر۔ خدا حافظ۔'' وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

''خدا حافظ!'' صوفیہ نے مدھم آواز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت بے وقوف ہے یہ۔'' وہ خود سے کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

اس روز اس کا پانچواں اور چھٹا پیریڈ فری تھا۔ مسز حق دو پیریڈ کے بعد گھر چلی گئی تھیں۔

صائمہ اور فائزہ دونوں ہی نہیں آئی تھیں۔ ان دونوں کے ساتھ ہی اس کی زیادہ فرینڈ شپ تھی۔ اب وہ بور ہو رہی تھی۔

''اگر صبح پتا ہوتا تو میں بھیا سے کہہ دیتی کہ مجھے جلدی آ کر لے جائیں، وہ تو اب وقت پر ہی آئیں گے، اب انہوں نے تو اپنے وقت پر ہی آنا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ اتنے بکواس موسم میں بندہ لائبریری میں بیٹھ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ستمبر کے مہینے میں بھی حبس ہو رہا ہے۔'' وہ کلاس روم سے نکلتے وقت سوچ رہی تھی۔ ''پورا ایک گھنٹہ ہے۔'' وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی۔ ادھر ادھر آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ کچھ دیر بعد ہی جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور سست قدموں سے گیٹ کی طرف چلنے لگی۔

''حالانکہ ایسا کون سا گھر دور ہے۔ قریب ہی تو اسٹاپ ہے اور کالج کے بھی دو پوائنٹ ادھر جاتے ہیں۔ آگے صرف ایک سڑک ہی تو کراس کرنا ہوتی ہے، لیکن یہ ہمارے گھر والے ابھی بھی سترہویں صدی کے برقعوں اور روایتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر اکیلی گھر بھی جاؤں گی تو خدانخواستہ قیامت کا ظہور وقت سے پہلے ہو جائے گا، ہونہہ!'' اس نے روڈ پر چلتے ہوئے چھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر ماری۔ ''آپی بے چاری کتنے سالوں سے اس چار دیواری میں مقید ہیں اور پتا نہیں کب تک رہیں گی۔ جب تک کوئی سید گھرانے کا شریف، خاندانی، وضع دار سید زادہ کہیں سے دستیاب نہ ہوگا وہ ایسے ہی بیٹھی رہیں گی اور خاندان میں تو دور دور تک ان کی ''[illegible]ب'' کا کوئی Authentic Gentle Men (مستند شریف زادہ) ہے ہی نہیں تو ان کے ہاتھ کہاں۔ [illegible]ے پہلے ہوں گے اور جو ہیں خدا کرے کہ نہ ہوتے۔''

اس نے دھوپ کی تلخی سے گھبرا کر قدم تیز کر دیے۔ گیٹ کے پاس بنے شیڈ کے نیچے پہنچ کر اس نے کندھے سے بیگ اتارا اور اس میں رکھا گاؤن باہر نکال کر پہننے لگی۔ ''چاہے مارے گرمی کے بندہ کباب کی طرح دھوپ میں تلا جا رہا ہو مگر نقاب بہت ضروری ہے۔''

اس نے حجاب میں اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے سوچا۔ آج پھر اس پر باغیانہ خیالات کا حملہ ہو رہا تھا۔ اس نے چہرہ ڈھانپ کر گیٹ سے باہر جھانکا۔ باہر گاڑیوں اور بسوں کا ہجوم تھا۔ چھٹی کا ٹائم تقریباً ہو چلا تھا۔ لڑکیاں اب گھروں کو جانا شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے سڑک پر دور تک نگاہ دوڑائی۔

''بھیا بھلا وقت سے پہلے آ سکتے ہیں، توبہ کرو!'' اس نے اکتا کر منہ اندر کر لیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گیٹ پر رش بڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک لڑکی اسی کی طرح گاؤن پہن

رہی تھی۔ وہ فورتھ ایر کی اسٹوڈنٹ لگ رہی تھی۔ اس نے گرین کلر کا دوپٹہ تہہ لگا کر بیگ میں رکھا اور حجاب پہننے لگی۔ وہ اچھی خاصی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کی خوبصورت گوری رنگت دھوپ میں تمتا رہی تھی۔ اس نے ایک نظر مسکرا کر آمنہ کو دیکھا اور پھر باہر جانے لگی کہ پیچھے سے کسی لڑکی نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"وہ تمہیں میڈم فریحہ بلا رہی ہیں۔ جلدی چلو۔ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔" تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

آمنہ نے پھر باہر دیکھا تو اسے لگا، ان کی گرے کرولا کافی دور کھڑی ہے۔ بھیا اتنی دور تو گاڑی پارک نہیں کرتے۔" وہ ذرا سا گیٹ سے باہر نکل آئی، اور ذرا غور سے بھیا کی تلاش میں گاڑی کی آس پاس نظریں دوڑائیں۔ وہ تو اسے نظر نہ آئے مگر اس کی نظریں واپس آتے آتے کسی اور ہی چہرے میں الجھ کر رہ گئیں اور اس کے قدم جیسے اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔ وہ ایک ٹک سے اس چہرے کو دیکھنے لگی کہ پیچھے سے ایک لڑکی اس کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی تو اسے لگا جیسے وہ نیند سے جاگی ہو۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی اور اس چہرے کی تلاش میں نظریں اسی جگہ جمائیں جہاں وہ اسے کھڑا نظر آیا تھا۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ اسے شاید کسی کا انتظار تھا۔ وائٹ شیراڈ سے ٹیک لگائے وہ بار بار رومال سے چہرہ صاف کر رہا تھا جس سے اس کا سرخ و سپید چہرہ اور بھی دہکنے لگتا۔ آمنہ ذرا سا سائیڈ سے ہو کر کالج کی بیرونی دیوار کی طرف بڑھی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ یہ جگہ نسبتاً پرسکون تھی اس کے آگے دو گاڑیاں کھڑی تھیں جس کی وجہ سے وہ خود بھی تقریباً چھپ گئی تھی۔ اب وہ سکون سے اس کو دیکھ سکتی تھی۔

حسن نسوانی ہو تو راہ چلتے دم رک جاتے ہیں، نظریں پلٹ پلٹ کر آتی ہیں۔ اس بات کا اسے اندازہ تھا کیونکہ قدرت نے اس کو بھی ایک ایسا ہی پرکشش...... چہرہ عطا کیا تھا کہ ایک بار جو دیکھ لیتا تھا وہ دوسری بار ضرور ہی دیکھتا تھا۔ پہلی نظر اگر اتفاقیہ ہوتی ہے تو دوسری نظر ہمیشہ تحسین کی ہوتی ہے جو اس حسن کا خراج ہوتی ہے اور اس طرح کا خراج اس نے بھی کئی بار وصول کیا تھا۔

مگر مردانہ حسن و وجاہت میں اس قدر کشش ہو سکتی ہے۔ اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ حالانک اس کے گھر میں بھیا اور ابا جی دونوں ہی بلاشبہ مردانہ خوبصورتی کا شاہکار تھے مگر یہ چہرہ؟ اس پر نظر پلٹ پلٹ کر نہیں آ رہی تھی بلکہ پہلی ہی نظر ٹھہر گئی تھی۔

وہ پلک جھپکے بغیر قدرت کی صناعی کا کرشمہ دیکھ رہی تھی۔ سفید بے داغ شرٹ میں چھ فٹ سے نکلتا ہوا دراز قد، گھنگھریالے اخروٹی رنگ کے بال جو دھوپ میں سونے کی طرح چمک رہے تھے اسی رنگ کی بڑی بڑی براؤن آنکھیں اور تلوار کی طرح کھڑی تیکھی ناک۔ شاید اس کے چہرے کا سب

سے خوبصورت حصہ اس کی ناک تھی جو باقی تمام چہرے کو عجیب شان اور رعب سے ہم آہنگ کر رہی تھی۔ اگر اس کی پیشانی اتنی کشادہ اور ناک اتنی خوبصورت نہ ہوتی تو شاید یہ بھی عام سا مرد ہوتا۔ براؤن آنکھوں والا اور بس۔ اس نے سوچا مگر ان دونوں چیزوں نے اسے کیا بنا دیا تھا۔ بھلا کیا؟ اس نے سوچا۔

"اپالو۔ ہاں اپالو ایسا ہی ہوگا۔ یونانی دیو مالائی کہانیوں کا سب سے حسین کردار۔ اگر اس جیسا نہیں تھا تو بالکل فضول ہوگا کیونکہ کوئی دیوتا بھی دیوتا، کوئی بھی انسان شاید اس سے زیادہ مکمل حسن کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل نے ایک دم سے فیصلہ سنا دیا۔

اسی وقت سیاہ گاؤن اور حجاب میں چھپی ایک لڑکی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں میں کچھ بات ہوئی اور پھر وہ گاڑی کا لاک کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور لڑکی دوسری طرف سے جا کر اس کے ساتھ جا بیٹھی۔

"شاید اس کی بہن ہوگی۔ یا شاید......" اس سے آگے اس کا دل خواہ مخواہ دھڑک اٹھا۔ تھوڑی دیر میں رش میں سست روی سے رستہ بناتی ہوئی گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مگر اس چہرے کا عکس جیسے اس کی آنکھ کی پتلیوں پر ثبت ہو کر رہ گیا۔

"کتنی دیر سے ہارن بجا رہا ہوں، سن کیوں نہیں رہیں؟" بھیا کی تیز آواز پر اس نے سٹپٹا کر ان کی طرف انجان نظروں سے دیکھا جیسے انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

"اور یہ باہر نکل کر کیوں کھڑی تھیں؟ پتا نہیں تھا کہ مجھے ٹائم پر ہی آنا ہے۔" وہ کچھ خفگی سے کہتے ہوئے آگے بڑھے تو وہ بھی بے جان قدموں سے ان کے پیچھے چلنے لگی۔

☆☆☆

گھر آ کر بھی اس کی حالت میں کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ اسے ایک دم سے سب کچھ خالی لگنے لگا تھا۔ بے مقصد اور بے وجہ سا۔ اس نے بے دلی سے دو چار لقمے کھائے اور چپ چاپ کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ صوفیہ چائے لے کر کمرے آئی تو وہ سوتی بن گئی۔ شام بھی خاصی دیر تک وہ ایسے ہی پڑی رہی تو صوفیہ نے اسے آوازیں دے دے کر اٹھایا۔ اس پر عجیب بیزاری سی طاری تھی۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ اس کی دونوں بھتیجیاں ہوم ورک کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک دو بار اسے متوجہ کرنا چاہا مگر پھر اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر اپنے کام میں لگ گئیں۔ نائلہ بھابھی نے اسے چائے لا کر دی۔ اس نے چپ چاپ گھونٹ گھونٹ چائے کو اندر اتارا۔ کپ سائڈ پر رکھ کر پھر بیٹھ گئی۔

"آمنہ! کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟" نائلہ بھابھی اس کے پاس آ کر بولی۔

"ٹھیک ہوں بھابھی۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور زبردستی چہرے کو بشاش کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے تو نہیں لگ رہا کہ تم ٹھیک ہو۔" وہ تشویش سے بولیں۔

"نہیں، بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ تھوڑا سا مسکرائی۔

"تو پھر ذرا کچن میں آجاؤ، میرے ساتھ۔ وہ صوفیہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ ابھی آدھ گھنٹے میں۔ تمہارے بھیا کا فون آیا تھا۔ ان کے کسی دوست کے جاننے والے ہیں۔ صوفیہ کو میں نے کپڑے تبدیل کرنے بھیج دیا ہے۔ تم آکر ذرا کچن میں میرے ساتھ تھوڑا ہاتھ بٹا دو۔" وہ کھڑے کھڑے بولیں۔

"بھابھی! کیا ہے، یہ روز کا تماشا۔ آخر آپی بھی انسان ہیں۔ کب تک یہ سب جھیلتی رہیں گی۔ آپ بھیا کو سمجھائیں کہ وہ اباجی سے بات کریں۔ اگر لڑکا غیر سید ہوگا تو وہ امت مسلمہ سے نکل نہیں جائے گا۔ وہ چودہ سو سال پہلے جس ذات پات، خاندان، قبیلے کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے خاتم الرسل ﷺ کو بھیجا گیا تھا ہم تو آج بھی وہیں کھڑے ہیں بلکہ قریش سے زیادہ ہٹ دھرمی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ تو جانا نہیں چاہتے تھے اور ہم سب کچھ جان کر انجان بنے ہوتے ہیں۔ کیا سید پیدائشی جنتی ہوتے ہیں۔ کیا ان کی فطرت ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہوتی ہے۔ کیا ان کی جبلت ہر گناہ سے مبرا ہوتی ہے۔ وہ بھی تو انسان ہوتے ہیں۔ سب انسانوں جیسے پھر یہ لکیریں یوں یہ ذات پات کا امتیاز کیوں؟"

کدھر کا غبار کدھر نکل گیا۔ اس کی ذہنی فرسٹریشن کو جیسے رستہ مل گیا۔ وہ بولے چلی گئی۔

"آمنہ! کیا تم یہ بات اپنے اباجی کو سمجھا سکتی ہو یا میں تمہارے بھیا کو سمجھا سکتی ہوں، نہیں نا۔" وہ اس کے پاس بیٹھ کر بولیں۔ "تو پھر فضول میں خون جلانے سے فائدہ؟ جو جس طرح ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔ یونہی جلنے کڑھنے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ صوفیہ کوئی پہلی لڑکی نہیں ہے ہمارے خاندان میں جس کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اب تو بہت لچک پیدا ہو گئی ہے رویوں میں ورنہ خاندان سے باہر کا تو تصور بھی نہیں تھا۔ یہاں۔ اب چلو اتنا تو ہوا کہ بات ذات قبیلے تک آگئی ہے۔ کچھ تو ذہنوں کا کینوس وسیع ہوا ہے۔ اللہ نے چاہا تو کچھ عرصے تک ان کے ذہن اور وسیع ہو جائیں گے۔ ویسے یہ تقریباً ہر ذات کا اصول ہے کہ وہ مشکل ہی سے اپنے سے باہر رشتے ناتے کرتے ہیں۔ سید بے چارے تو مفت میں بدنام ہو گئے ہیں ورنہ ہر ذات برادری اس معاملے میں متعصبانہ ذہنیت کی مالک ہے۔ چلو تم شکر کرو، تمہارے لیے یہ چھان پھٹک نہیں کرنی پڑے گی۔ صوفیہ کا مسئلہ آج حل ہو جائے گا،

کل اباجی دونوں کی رخصتی کی تیاری پکڑلیں۔" نائلہ کی بات پر وہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھابھی! بھابھی! اباجی سے کہہ دیں آپ......" وہ غصے سے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا کہہ دوں......" وہ حیرانی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

"کچھ نہیں۔" اس نے غصے کا گھونٹ بھرا۔

"یہی کہ صوفیہ کو چھوڑیں، میری تیاری تو کریں۔ اسے کیوں میری راہ کا روڑہ بنا رہے ہیں۔" نائلہ نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

"ہونہہ!" وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

تقریباً گھنٹے بعد ہی وہ لوگ آگئے۔ ایک مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مرد تو بھیا کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ وہ صوفیہ کے ساتھ چائے لے کر اندر آگئی۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی، جس نے دونوں ہاتھوں میں موٹی موٹی سونے کی ڈھیر ساری چوڑیاں پہن رکھی تھیں جو اس کی صحت مند کلائیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اسے بار بار بازو ہلا کر انہیں کھنکھنانا پڑ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی تین انگلیوں میں بھاری انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں بھاری گلوبند، عجیب سا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شادی میں آئی ہو حالانکہ اس کی رنگت اچھی خاصی سانولی تھی مگر پھر بھی اس نے تیز گلابی رنگ کا قیمتی فینسی سوٹ پہن رکھا تھا۔ دونوں لڑکیاں بھی ناک نقشے میں ماں کی کاپی تھیں۔ بس انہوں نے زیور ماں کی نسبت آدھا پہن رکھا تھا۔ آمنہ نے تینوں کو پہلی نظر میں ہی ریجیکٹ کر دیا اور بیزاری شکل بنا کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں لڑکیاں بڑا بن بن کر بول رہی تھیں۔

"میرا بیٹا دوبئی میں ہوتا ہے۔ پہلے تو وہاں کام سیکھتا رہا تھا اب ماشاء اللہ سے اپنی اتنی بڑی دوکان ہے سونے کے زیورات کی۔ حالانکہ یہاں بھی اپنا کام ہے پر وہ کہتا ہے جو مزہ وہاں ہے کام میں، یہاں کہاں؟" وہ عورت بولی تو صوفیہ نے نیچی نظروں سے مسکرا کر آمنہ کو دیکھا اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"آپ دونوں بہنیں ہیں؟" ایک لڑکی نے آمنہ سے پوچھا۔

"جی!" اس نے [illegible] چتون سے کہا۔

"پر ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ لڑکی کے ماں باپ مر چکے ہیں اور اس کا کوئی بہن بھائی نہیں۔" وہ عورت فوراً سنگ دلی سے بولی تو صوفیہ کا سر اور نیچے ہو گیا۔

"جن کے ماں باپ مر جاتے ہیں، کیا دنیا میں ان کا کوئی اور نہیں ہوتا۔ چچا، تایا بھی باپ جیسے ہوتے ہیں۔ یہ میری چچا زاد ضرور ہیں لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے سگی بہنوں سے بڑھ کر

ہیں۔'' آمنہ تلخی سے تیز آواز میں بولی تو نائلہ گھبرا گئیں۔

''آمنہ! ذرا کچن میں دیکھنا۔ میں دودھ چولہے پر رکھ کر آئی تھی۔'' نائلہ نے کچھ گھورتے ہوئے اس سے کہا تو وہ خفگی سے سر ہلا کر کھڑی ہو گئی اور باہر نکل گئی۔

جب رات کو دونوں اپنے اپنے بستر پر لیٹیں تو اسے کتنی دیر تک نیند ہی نہ آئی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ جبکہ صوفیہ دوسری طرف کروٹ لیے کب سے بے حس لیٹی تھی۔

''آپی! سو گئی ہیں؟'' اس نے کچھ دیر بعد پوچھا تو اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

''آپی!'' اس نے پھر پکارا۔

''کیا ہے؟'' صوفیہ نے اسی طرح لیٹے مدھم آواز میں کہا۔

''اتنی جلدی نیند آ گئی آپ کو؟'' اس نے تکیہ بیڈ کی پشت سے لگایا اور سر اونچا کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں، نیند آ رہی ہے۔'' وہ اسی کروٹ پر لیٹی تھی۔

''اتنی جلدی نیند نہیں آتی آپ کو، مجھے پتا ہے۔ آپی وہ تینوں کتنی فضول تھیں، چھچھوری سی۔''

اس نے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی۔

''پتا نہیں، بھیا کو بھی اتنے فضول سے لوگ کہاں سے مل جاتے ہیں۔ چھچھورے اور نودولتیے۔'' وہ پھر بولی۔ صوفیہ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

''اچھا، سیدھی ہو کر تو لیٹیں۔'' وہ صوفیہ سے بولی۔

''ٹھیک ہوں میں۔ مینا، مجھے نیند آ رہی ہے۔ سونے دو مجھے۔'' وہ بھیگی بھیگی آواز میں بولی۔

''آپی! ایسے لوگوں کے لیے رونا نہیں چاہیے بلکہ ایسے لوگوں پر ہنسنا چاہیے۔ یہ تو بے چارے بڑے قابل رحم لوگ ہوتے ہیں جنہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ سونا چاندی پہنے بغیر آئینہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ انہیں اپنی شکلیں اس تانبے پیتل کے بغیر نظر ہی نہیں آتیں تو جو اپنی شکل کو نہ پہچانتا ہو، اسے دوسروں کی پہچان کیا ہو گی۔ یہ آنکھوں والے اندھے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے رونا نہیں چاہیے بلکہ ان پر رونا چاہیے کہ جو خود سے بھی بے خبر ہوتے ہیں۔'' اس کی باتوں نے صوفیہ کو سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟'' اس نے مسکرا کر صوفیہ کو دیکھا۔

''ہاں بالکل!'' صوفیہ نے آنکھیں جھپکائیں اور گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھیں۔''

''وقت سے بڑا استاد کوئی نہیں ہوتا آپی! یہ کتابیں اور کالجز وغیرہ ٹھیک ہیں یہ گائیڈ لائن دیتے ہیں لیکن ہمارا صحیح استاد وقت ہے۔ آپ کو جو کچھ وقت سکھا رہا ہے، اسے سنبھال کر رکھیے اور پھر وقت آنے پر دھیان سے خرچ کیجئے گا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب؟'' صوفیہ نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

''یہ دنیا تو مکافات عمل کی جگہ ہے۔ آج آپ کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے کل آپ کو بھی یقیناً موقع دیا جائے گا کہ آپ اس پوزیشن پر آ کر کھیلیں پھر وہ وقت ہو گا جب آپ اپنے اس سیکھے ہوئے سبق کو سامنے لائیں گی، اپنے حساب سے۔ میری بات سمجھ رہی ہیں نا آپ؟''

''مینو! تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟'' صوفیہ نے پھر اچنبھے سے پوچھا۔

''کم از کم کالج سے نہیں۔ مشاہدے سے اور وقت سے آپ کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے کیا یہ پتھر صرف آپ کو لگتے ہیں۔ نہیں آپی! اس کی چوٹ میرے دل پر بھی لگتی ہے۔ مجھے بھی آپ کا درد محسوس ہوتا ہے۔ غصہ بھی آتا ہے مگر آپ کی طرح میں بھی مجبور ہوں۔ سب کچھ سہنے پر اور چپ رہنے پر۔'' وہ افسردہ آواز میں بولی۔

''بے وقوف! یہ بھی کوئی باتیں ہیں افسردہ ہونے کی۔ یہ تو سب زندگی کا حصہ ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔'' وہ اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ ''اللہ کا شکر ہے اس نے ہمیں مسلمان بنایا۔ دین اور دنیا کی سمجھ دی۔ شکر کرنے کا طریقہ بتایا۔ نیک والدین کی اولاد بنایا، کھانے کو ہر قسم کی نعمتیں عطا کیں اور رہنے کو یہ مضبوط اور محفوظ گھر عطا کیا۔ ان اتنی بڑی بڑی نعمتوں کے مقابلے میں تکلیفیں اور رنج تو بہت معمولی ہیں اور یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم سے بالاتر بھی ایک ہستی ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہم سب کی تقدیروں کے فیصلے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو حاکم ہے، وہی ہمارا خالق ہے تو خالق کبھی مخلوق کا برا نہ چاہے گا۔ اس لیے فکر کی کیا بات ہے۔ اس لیے میں فکر نہیں کر رہی تھی بس لوگوں کے رویے دکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ مال و دولت تو اڑتا پرندہ ہے کبھی اس منڈیر تو کبھی اس منڈیر۔ اس کو اڑنے سے کون روک سکتا ہے اور پرندوں کو کوئی کتنی دیر تک باندھ سکتا ہے۔ اس لیے ان پر گمان کیسا؟'' صوفیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر آپ اداس کیوں ہیں؟'' وہ بولی۔

''اداس میں نہیں تم تھیں۔ آج جب سے کالج سے آئی ہو، اس طرح منہ لٹکا کر بیٹھی ہو۔ کھوئی کھوئی سی۔ کیا بات ہے؟'' صوفیہ کی بات پر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"کچھ نہیں آپی! ویسے ہی سر میں درد تھا۔" وہ مڑ کر تکیہ درست کرنے لگی۔

"نہیں۔ یہ بات تو نہیں تھی۔ کوئی اور بات تھی۔ مجھے نہیں بتاؤ گی؟" اس نے رک کر ایک پل کو اسے دیکھا۔

"بتانے سے بوجھ ہلکے ہو جاتے ہیں۔ کیا پتا میرا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے۔ یا ہو سکتا ہے یہ وہم ہی ہو، بتانے سے دور ہو جائے۔" اس نے سوچا۔

"آپی! کوئی خاص بات نہیں۔ اگر آج کے زمانے میں آپ کو کہیں 'اپالو' نظر آ جائے تو کیا کچھ دیر کے لیے آپ کے احساسات منجمد نہیں ہو جائیں گے؟"

اس نے حتی الامکان لہجے کو ہلکا پھلکا بناتے ہوئے کہا۔

"اپالو! You mean Sun god! (تمہارا مطلب ہے سورج دیوتا)" صوفیہ کچھ حیرت سے بولی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا تم نے کہاں سے دیکھ لیا اپالو۔" وہ دلچسپی سے بولی۔

"کالج سے باہر یونہی نظر پڑ گئی آپی! اتنا مکمل مردانہ حسن، اف توبہ! میں تو جیسے دنگ ہی رہ گئی۔ میں نے تو جھٹ سے اس کا نام اپالو رکھ دیا۔" وہ خواب سا منظر پھر اس کی آنکھوں کے آگے پھرنے لگا۔

"صرف نام ہی رکھا یا......" صوفیہ نے مسکراتے ہوئے اسے ٹٹولا۔

"ایک حسین چہرہ دیکھا اور ایک نام رکھ دیا اور پھر آپ سے شیئر کر لیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اب مجھے نیند آ رہی ہے صبح کالج بھی جانا ہے۔" وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹتے ہوئے بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ سو جاؤ اور ایسی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں کرتے۔ یہ دنیا ہے، یہاں رنگ رنگ کے لوگ ہیں۔ انسان کس کس چہرے کو رک کر دیکھے۔" صوفیہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور جو کوئی چہرہ کسی کے قدم جکڑ لے۔ بصارت گروی رکھ لے، زندگی سے ہر رنگ نچوڑ کر اسی ایک منظر میں بھر دے تو پھر کوئی کیا کرے آپی؟" اس نے آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے بے بسی سے سوچا۔ "پتا نہیں صبح کب ہو گی۔" اس نے بے چینی سے کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

اگلا دن کالج میں بھی اس کا کچھ بے چین ہی گزرا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جیسے کچھ کھو گیا ہو اور نظریں اس کی تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ وہ چوتھے پیریڈ کے بعد ہی باہر آ گئی۔ ابھی تو ساڑھے گیارہ بھی نہیں ہوئے۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"ارے آمنہ! تم یہاں پھر رہی ہو تم نے ایجوکیشن کا پیریڈ نہیں لیا۔" عقب سے ندا نے اسے پکارا۔

"نہیں، ویسے ہی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔ گھر جا رہی ہوں۔" اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے جواب دیا۔

"اچھا خیریت تو ہے؟" وہ اس کے برابر چلتے ہوئے بولی۔

"ہاں بس ویسے ہی۔ تم میری اٹینڈینس لگوا دینا۔" اسے خیال آیا تو اس نے ندا سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ دیکھو میں بھی پیریڈ لیتی ہوں یا نہیں۔ وہ تھرڈ ایر کی عاصمہ اپنی انگیجمنٹ کی تصویریں لائی ہوئی ہے۔ بڑی زبردست ہے۔ میں تو وہ دیکھنے جا رہی ہوں۔ تم بھی چلو۔" اس نے آمنہ کو بھی دعوت دے ڈالی۔

"نہیں شکریہ۔ میں تو گھر جا رہی ہوں۔" اس نے قدم کچھ تیز کیے۔

"اوکے پھر خدا حافظ۔" ندا وہیں سے ہاتھ ہلاتے ہوئے پلٹ گئی۔

وہ خدا حافظ کہتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

"کچھ دیر وہ گیٹ کی روش پر یونہی ٹہلتی رہی۔

"یہ کیا حماقت ہے آمنہ! بھلا کوئی ایسے کرتا ہے۔ محض کسی کو دیکھا اور خود پر اختیار کھو بیٹھے۔" اس نے چلتے چلتے رک کر خود سے کہا مگر جس سے کہا اسے شاید ان باتوں کی پروا نہیں تھی، اس لیے رکے ہوئے قدم پھر گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ گیٹ سے باہر ابھی اکا دکا گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے ڈرائیور بھی ستا رہے تھے۔ "وہ" اسے کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے اندر ہو کر گاؤن پہنا اور پھر حجاب پہن کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ باہر جھانک لیتی۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں مگر "وہ" اسے نظر نہ آیا۔ ایک گھنٹہ بعد بھیا اسے دور سے آتے دکھائی دیے۔ وہ گیٹ کے اندر ہو کر کھڑی ہو گئی۔ کافی دیر ایسے ہی کھڑی رہی۔ اب گیٹ کے اطراف بھی رش بڑھ گیا تھا لڑکیوں کا ہجوم اندر باہر تھا۔

آخر تھک کر وہ باہر نکل ہی آئی۔ ست قدموں کے ساتھ وہ گاڑی تک پہنچی۔ راستے میں وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ بھیا سے ڈانٹ بھی پڑی کہ وہ پورے پندرہ منٹ سے وہاں کھڑے ہیں۔ وہ خاموشی سے ان کی خفگی سہہ گئی۔

پھر تین دن اسی بے کلی سے گزرے، اسے اپنی حالت پر حیرانی ہو رہی تھی۔ کسی پل چین نہیں تھا۔ رات کو صبح کے انتظار میں گزار رہی تھی اور جب اگلی دوپہر وہ کالج گیٹ پر اسے نظر نہ آتا تو وہ اگلے دن کی آس پر اپنے دل کو تسلیاں دینے لگتی۔

"کیا میں اتنی کمزور ہوں کہ کسی کو دیکھا اور اپنا چین سکون غارت کر لیا۔" وہ اٹھتے بیٹھتے خود سے سوال کرتی۔ عجب سا محشر بدن کی دیواروں کے اندر برپا ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔

چوتھے روز وہ اداس ملول سی گیٹ کے پاس کھڑی تھی، جب وہ اسے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے نظر آ گیا تو اسے لگا، جیسے اردگرد کی ساری چلتی پھرتی دنیا ساکت ہو گئی ہو۔ صرف وہ ایک زندہ وجود رہ گیا ہو۔ اسے لگا اس کا دل دھڑکتے ہوئے آنکھوں میں آ بسا ہے۔ کریم کلر کی کلف شدہ شرٹ اور بلیو جینز، وہ اس دن سے بھی زیادہ اسے اپنے دل سے قریب لگا جیسے وہ اسے صدیوں سے جانتی ہو۔ وہ کوئی سحر تھا جس نے اس کی نظروں کو پتھر کر دیا تھا۔ وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے اب دروازے سے اس دن کی طرح ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ آج اس نے آنکھوں پر سن گلاسز چڑھا رکھے تھے مگر اسے پتا تھا کہ سیاہ گلاسز کے پیچھے اس کی آنکھیں اس وقت کون سا شیڈ دے رہی ہوں گی۔

اردگرد رش بڑھ رہا تھا۔ اسے ادھر ادھر سے دھکے لگ رہے تھے وہ گیٹ کے اندر عین درمیان میں کھڑی تھی کہ دائیں طرف سے کسی عجلت کی ماری لڑکی نے اسے زور سے بائیں طرف دھکیلا اور اپنے لیے رستہ بنا لیا تو اسے ایک لمحے کو ہوش سا آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر جلدی سے ہٹا لیے۔ وہ اسی طرح گاڑی سے ٹیک لگائے لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ بے خبری کے عالم میں چلتی ہوئی گیٹ سے باہر آ گئی اور دیوار کے ساتھ اس دن کی طرح لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی ساری حساسیت آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔

"آمنہ! آمنہ کس قدر احمق اور بے وقوف ہو تم۔ گھنٹے بھر سے ہارن بجا رہا ہوں اتنا رش تھا، کتنی دیر سے تمہیں گیٹ کے پاس تلاش کر رہا تھا۔ اب میری اچانک نظر پڑی تو تم یہاں کھڑی تھیں۔ بے وقوف لڑکی! میں نے اتنی تمہیں آوازیں دیں، پتا نہیں کون سی دنیا میں پہنچی ہوئی ہو۔" بھیا کی دھاڑتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ اچھل کر پلٹی۔ وہ شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ان کی پھٹکار کے جواب میں وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"کیا بہری ہو گئی ہو۔ چلو اب یہاں سے۔" وہ دانت کچکچا کر غصے سے بولے تو وہ آہستگی سے چل پڑی۔ آگے واقعی بہت رش تھا، لگتا تھا گرلز کالج کے باہر میلہ لگا ہوا ہے۔ گاڑی تک پہنچتے پہنچتے انہیں پانچ منٹ لگ گئے۔

"اور یہ تمہارا دماغ کیا خراب ہوا ہے جو گیٹ سے نکل کر اس کونے میں گھس کر کھڑی ہو جاتی ہو۔ اس دن بھی میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ باہر نکل کر نہ کھڑی ہوا کرو اچھا نہیں لگتا۔ پتا نہیں تمہارے

دماغ میں کیا خلل آ گیا ہے۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے وقت بھی مسلسل بڑبڑا رہے تھے اور وہ ان کی بڑبڑاہٹ سے بے نیاز کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی دنیا کو سپاٹ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ دیوانگی ہے، وحشت اور پاگل پن۔ میرے اللہ مجھے بچا۔ میں کیا کروں۔" اس نے بے بسی سے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔

☆☆☆

"چھوٹے چاچو کا فون آیا ہے شارجہ سے صبح، کہ وہ لوگ ایک دو ماہ تک آ رہے ہیں پاکستان اور اس بار وہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔ چاچو کہہ رہے تھے ان لوگوں نے شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں اب وہ ابا جی سے صوفیہ کا بہانا نہیں سنیں گے۔ ویسے بھی سکندر بہت بے تاب ہو رہا ہے۔"

وہ کچن میں چاول صاف کر رہی تھی جب نائلہ نے چائے کا پانی چولہے پر رکھتے ہوئے اسے سنایا۔ وہ تو پہلے ہی بے دلی سے کنکر چن رہی تھی اب اس کے ہاتھ بالکل ہی رک گئے۔ وہ کتنی دیر یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ نائلہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر ریک سے مگ نکالنے لگی۔

"بھابھی! آپ ایک بار ابا جی اور بھیا کو بتا دیجئے گا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک صوفیہ آپی کا کہیں ہو نہیں جاتا میں شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ ان کو اکیلا چھوڑ کر اس گھر میں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے اور کوئی بھی مجھے اس بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ ٹھوس لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"دوسرے مجھے اپنا گریجویشن مکمل کرنا ہے۔ چاچو کے پاس بے تحاشا دولت ہے جس کی وجہ سے ان کے انڈر میٹرک بیٹے پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن میں سونے چاندی کے ڈھیر پر علم کی ایک ڈگری کو ترجیح دیتی ہوں۔ آپ یہ بات ابا جی کو اچھی طرح میری طرف سے بتا دیجئے گا۔" نائلہ نے اس کے خطرناک حد تک سنجیدہ چہرے کو کچھ حیرت سے دیکھا۔

"آمنہ! کیا تمہیں سکندر پسند نہیں ہے؟" وہ کچھ دیر بعد بولیں۔

"میں نے یہ کب کہا؟" اس نے کنکر نکال کر دور ہوا میں اچھالا۔

"یہ بات کہنے کی تو نہیں ہوتی۔ میں محسوس کر رہی ہوں، بہت دفعہ مجھے ایسا لگا کہ تمہیں سکندر پسند نہیں ہے۔ تم اس کے ذکر کو شادی کے ذکر کو یونہی یا تو ٹال دیتی ہو یا بات بدل دیتی ہو۔ مگر تمہاری آنکھیں سچ کہہ جاتی ہیں۔ بہت دفعہ میں نے سچ سے آنکھ چرانا چاہی ہے لیکن آج تم مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دو۔" وہ کرسی پر اس کے سامنے آ بیٹھیں تو وہ چپ رہی۔ کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی۔

''یہ ٹھیک ہے، شکل وصورت اور رنگ وروپ کے لحاظ سے سکندر واقعی تمہارا ہم پلہ نہیں لیکن گڑیا! مرد کے حسن وخوبصورتی کو کب اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمارا اپنا ہے۔ تمہیں خوش رکھے گا ہر لحاظ سے۔ اگر کوئی بات تمہارے ذہن میں ہے تو مجھے بتاؤ۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھیں۔

''اچھا اگر ایسا ہو تو آپ کیا کریں گی؟'' اس نے چاولوں کا تسلہ میز پر رکھ دیا۔

''میں!'' وہ جیسے سوچ میں پڑ گئیں۔ ''میں تمہارا ذہن صاف کرنے کی کوشش کروں گی کہ......''

''کہ میں تو بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے بنا چھانے پھٹکے گھر میں ہی اتنا اچھا ''ناپ'' کا رشتہ مل گیا ہے۔ سکندر گھر کا لڑکا ہے۔ ہم ہی میں سے ہے۔ اباجی کا خون ہے۔ اس لیے شریف اور قابل اعتبار تو لازمی طور پر ہے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ کئی سالوں سے شارجہ میں ہیں۔ یہاں بھی انہوں نے ڈیفنس میں گھر لیا ہے۔ شارجہ میں ان کی سونے کے زیورات کی دو بڑی بڑی شاپس ہیں۔ وہاں کے سب سے مہنگے شاپنگ سینٹر میں، بے تحاشا دولت ہے، چاچو مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ چاچی بھی بہت اچھی ہیں اور سکندر بھی اپنے ماں باپ کی پسند پر نا صرف راضی بلکہ دل سے میرا طلب گار ہے۔'' وہ سانس لیے بغیر بولے چلی گئی۔

''تو پھر انکار کی وجہ؟'' نائلہ نے اس کے چپ ہوتے ہی فوراً کہا۔

''بس میرا دل نہیں مانتا۔'' اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہہ کر کچھ چاول صاف کرنے شروع کردیے۔

''اسے میں تمہاری ناشکری ہی کہوں گی اور کچھ نہیں۔ جو محبت بھرے دلوں کی قدر نہیں کرتے وہ پچھتایا کرتے ہیں اور میری دعا ہے کہ خدا نہ کرے کہ تم پر ایسا وقت آئے۔ میرا خیال ہے تمہیں یہ بات ناپسند ہے کہ سکندر زیادہ پڑھا لکھا نہیں مگر آمنہ! تم اسے وہاں اپنی شاپ میں دیکھو کسٹمرز کو ڈیل کرتے ہوئے، تو تم حیران رہ جاؤ کہ یہ بندہ انڈر میٹرک ہے۔ بہت ویل مینرڈ ہے وہ اور آج کل مینرز ایجوکیشن سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم پچھلے سال جب شارجہ گئے تھے چاچو سے ملنے تو یقین کرو ان کا رہن سہن اتنا نفیس اور مہذب تھا، ہم حیران رہ گئے تھے اور میں نے دل سے دعا کی تھی کہ تم اس گھر میں آؤ۔''

نائلہ دھیرے دھیرے اس کا برین واش کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ بے تاثر چہرہ لیے سنتی رہی۔ یہی باتیں اگر نائلہ بھابھی پانچ روز پہلے کہہ دیتیں تو شاید؟ اس نے کچھ افسردگی سے سوچا۔ مگر نہیں۔ یہ باتیں تو انہوں نے اس وقت بھی کہی تھیں جب وہ پچھلے سال شارجہ چاچو کی فیملی سے مل کر آئی

تھیں۔

''بہرحال تمہیں اپنا مائنڈ میک اپ کرلینا چاہیے کہ **You have to marry here** (تمہیں یہیں شادی کرنی ہے) تمہیں اپنے گھر کی روایتوں کا بھی پتا ہے اور زمانے کے حالات کا بھی۔ اور تمہاری تعلیم بھی محض تمہاری ضد اور خواہش کا نتیجہ ہے ورنہ اباجی کب چاہتے تھے کہ تمہیں میٹرک کے بعد آگے پڑھایا جائے۔''

''کاش وہ میری بات نہ مانتے۔ آپی نے بھی تو ان کا کہا مانا تھا۔ میٹرک کے بعد آرام سے گھر بیٹھ گئی تھیں پھر میرے آگے وہ کیوں ہار گئے۔ شاید اپنی اولاد انسان کو یونہی ہرا دیتی ہے۔ اگر ایسا ہے کہ اباجی کو مجھ سے بہت محبت ہے تو انہیں میری خواہش کا خیال رکھنا پڑے گا۔'' ایک دم سے اس کے اندر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

''یہ میری ضد نہیں بھابھی! حق تھا جو انہیں دینا ہی پڑتا۔ علم حاصل کرنا بھی تو فرائض میں شامل ہے۔ اور اباجی جیسے فرض شناس انسان کسی فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کریں، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لیے میں نے ضد کر ڈالی۔'' اس نے تقریباً تین سال بعد اپنے پڑھنے کی ''ضد'' کی وجہ بتائی تو نائلہ ہنس پڑیں۔

''ہاں، ایک تم ہی تو رہ گئی ہو، اباجی کو ان کے فرائض کی یاددہانی کروانے والی۔'' وہ چائے مگوں میں ڈالتے ہوئے بولیں۔

''بالکل۔'' وہ اٹھ کر چاول بھگونے لگی۔

''بھابھی! وہ جو اس دن لوگ آئے تھے دوبئی والے چھچھورے انہوں نے کیا کہا؟'' اسے ایک دم یاد آیا تو وہ پوچھ بیٹھی۔

''کیا کہنا تھا انہوں نے۔ فضول سے لوگ تھے پتا نہیں کہاں کے سید زادے تھے۔ مجھے تو میراثی لگ رہے تھے، نودولتیے۔ کہتی ہیں لڑکی تو اچھی ہے پر ہماری لڑکے کے جوڑ کی نہیں۔ عمر میں بڑی ہے، ان کا لڑکا فیڈر پیتا ہے نا، ہونہہ!'' نائلہ کو انکار کے اس بھونڈے جواز پر بہت غصہ آیا تھا۔

''اباجی! اور بھیا کو بھی تو سوچ سمجھ کر لوگوں کو گھر بلانا چاہیے۔ ہر گاڑی کوٹھی والا خاندانی نہیں ہوتا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟'' اس نے ٹیپ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھا دینا پی اماں! کہ خاندانی اور بے خاندانی کی نشانی کیا ہوتی ہے۔'' نائلہ نے مگ ٹیبل پر رکھے۔ ''ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔ انہیں طلب ہے جو کوئی رائے دیتا ہے، کہیں راہ سمجھاتا ہے، وہ دیوانہ وار اس طرف لپکتے ہیں۔ لیکن یہ کام واقعی خدا کے کرنے کے ہیں۔ بندہ صرف دعا کرسکتا ہے، آرزو کرسکتا ہے یا اچھی امید کرسکتا

ہے۔ تم صوفیہ کو آواز دو آ کر چائے پی لے۔ کپڑے پریس کر رہی تھی وہ۔'' نائلہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''بھابھی! کیا صرف اچھی امید رکھنے سے انسان کے خواب حقیقت بن جاتے ہیں۔'' وہ سوچ کر بولی۔

''اچھی امید رکھنے والا انسان کبھی بھی حقیقت سے گھبراتا نہیں۔ وہ تلخ سے تلخ حقیقت کا سامنا بھی خوش اسلوبی سے کرتا ہے تو واقعی اس کے خواب حقیقت بن جاتے ہیں۔'' نائلہ نے شاید اسے ٹالا تھا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ سر پر کڑکتی دھوپ ہو اور بندہ بارش کا سوچ سوچ کر اس دھوپ میں بادل کا ٹکڑا تلاشتا رہے۔ یہ خوش امیدی نہیں بے وقوفی اور حماقت ہے۔''

''نہیں اسی کو Optimission (رجائیت پسندی) کہتے ہیں کہ جتنی کڑکتی دھوپ ہوگی اتنا ہی بارش کا امکان زیادہ ہوگا، جتنا انسان دھوپ سے گریزاں ہوگا، اتنا ہی موسم طویل ہو جائے گا۔ خوش گمانی سفر کی آدھی صعوبتیں کاٹ دیتی ہے۔''

''محض تصورات کی بنا پر محل کھڑے کرو اور جب وہ حقیقت کی دھوپ میں پگھل کر موم کی طرح بہنے لگیں تو پھر کھڑے ہو کر ان کا ماتم کرو۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھا حالات بہت کڑے ہیں، مشکل ہیں، دشوار ہیں۔ تم ان کے بارے میں سوچ سوچ کر شاید پاگل ہو جاؤ، لیکن اگر تم یہ سوچو کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ اس سے اچھا وقت یقیناً آئے گا اور اگر نہ بھی آیا تو اس کے ساتھ سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے گی تو یقین کرو وہ کٹھن وقت کبھی اتنی تکلیف نہیں دے گا جتنی اس کو سوچ سوچ کر ملے گی۔''

وہ خاموشی سے نائلہ کو دیکھنے لگی۔

''کیا فضول کی بحث میں الجھا دیا ہے تم نے۔ صوفیہ کو آواز دو، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' نائلہ نے اس کی گم صم شکل دیکھ کر جھنجلاتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر صوفیہ کو بلانے چل دی۔

☆☆☆

ان دنوں اس کی پڑھائی میں دلچسپی صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ صبح کالج یوں کتابیں لے کر جاتی جیسے کوئی بوجھ لے کر جا رہی ہو اور کلاس میں پیریڈز کے دوران اس کی نظریں کتاب اور ٹیچر کے بجائے بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف رہتیں کہ کب گیارہ بجیں اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گیٹ کی طرف بھاگے۔ کئی بار ایسا ہوا لیکچر کے دوران ٹیچر نے اسے کھڑا کر کے کوئی سوال کیا اور وہ محض حیران سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی حالانکہ وہ اپنی کلاس کی بہترین نہ سہی مگر پھر بھی لائق طالبات میں شمار ہوتی تھی۔ ایسی اسٹوڈنٹ جو کلاس میں موجود ہوتے ہوئے پوری طرح سے متوجہ ہوتی ہے مگر ذہنی طور پر وہ بالکل

غیر حاضر ہوتی۔ دو تین بار اسے ڈانٹ بھی پڑی۔ اس کی دوستوں نے بھی اس کی غیر حاضر دماغی پر کچھ تعجب کا اظہار کیا۔

''کیا واقعی میرے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔'' اس نے سوچا۔

''شاید ایسا ہی ہو، لیکن میں کیا کروں۔ میرے تو کچھ بس میں نہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس اجنبی نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ میں اپنے آگے بے بس ہو گئی ہوں۔ میں کس سے کہوں۔'' احساس بے بسی سے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

اس سے ذرا پرے چار لڑکیاں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ بلکہ باتیں کم کر رہی تھیں ہنس زیادہ رہی تھیں۔ یونہی بات بے بات ہنسے جا رہی تھیں۔ ان کے خوش باش چہرے دیکھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''یہ میں نے کیا کر لیا ہے۔'' اور آہستگی سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ کالج کی دیوار کے ساتھ اور سامنے دور تک اس نے نگاہ دوڑائی اسے اپنا ''گوہر مقصود'' کہیں نظر نہ آیا۔

وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر کتنی دیر گزر گئی وہ وقفے وقفے سے باہر جھانکتی رہی، مگر وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ بالآخر بھیا اسے لینے آ پہنچے وہ پژمردہ دل کے ساتھ جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ان کی گاڑی رینگنے لگی۔ جب وہ اسے گاڑی میں سامنے سے آتا دکھائی دیا تو جیسے پل بھر میں اس کا دل کسی کلی کی طرح کھل اٹھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ مگر یہ منظر تو چند لمحوں کا تھا اور جب اس کی گاڑی کھڑکی کے پاس سے گزری تو The Musk کا مسحور کن جھونکا اس کے سانسوں سے ٹکرایا۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ مگر وہ اسی طرح سامنے لڑکی کی طرف متوجہ تھا اور پھر اگلے ہی پل وہ آگے نکل گیا۔ اس نے آہستگی سے گردن موڑ لی۔ اسے احساس نہ ہوا کہ بھیا اسے کڑی نظروں سے گھور رہے تھے۔

یہ ادھوری ملاقاتیں، یہ ادھورے مناظر، اس کے اندر کی پیاس کچھ اور بھڑکا رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر کوئی آگ سلگ رہی ہو۔ گیلی لکڑی کی طرح، بارشوں کے موسم میں اور اس کا دھواں اس کی آنکھوں کو پانیوں سے بھر رہا ہو اور وہ پاگلوں کی طرح اس سلگتی آنچ کو بھڑکانے کے لیے آنکھ کے پانی کی پروا کیے بغیر اندھا دھند پھونکیں مارتی جا رہی ہو حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ شعلے کبھی نہیں بھڑکیں گے۔ یہ آگ کبھی نہیں جلے گی۔ اگر جل گئی تو پھر بہت کچھ ساتھ میں جل جائے گا یا پھر شاید کچھ بھی نہ بچ سکے۔ سب کچھ اسی شعلے کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ پھر بھی وہ دیوانہ وار آگ کو جلانے کے جتن کر رہی تھی۔

☆☆☆

"ثناء کو دوبارہ فون آ چکا ہے اس ہفتے۔ اب وہ شادی کے لیے اصرار کر رہا ہے۔ میں اسے کب تک ٹالوں گی۔ حالانکہ وہ جانتا بھی ہے کہ یہ صرف میرا مسئلہ نہیں اس کا بھی مسئلہ ہے۔ صوفیہ جتنی میری بیٹی ہے اس کی بھی اتنی ہی ہے۔ پھر بھی وہ انجان بنا ہوا ہے۔"

ابا جی سٹنگ روم میں بیٹھے بھیا سے باتیں کر رہے تھے کمرے کے کھلے دروازے سے آواز باہر آ رہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں ڈسٹنگ کر رہی تھی۔

"ابا جی! اب چاچو بھی کیا کریں۔ انہوں نے اتنی دور سے فیملی سمیت آنا ہے۔ اب بار بار اس طرح آنا کتنا مشکل ہے۔ پھر وہاں ان کا کاروبار ہے۔ وہ ایک دن کے لیے شاپ بند کر دیں تو لاکھوں کا نقصان ہو جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ اب آپ انہیں ہاں کہہ ہی دیں۔ وہ جو فون پر تاریخ مانگ رہے ہیں۔ ان کے مشورے سے اور گھر والوں کی صلاح سے، میرا خیال ہے انہیں تاریخ دے ہی دیں۔ معاملے کو لٹکانے سے فائدہ۔ باقی رہا دوسرا مسئلہ اس کا بھی اللہ مالک ہے۔"

بھیا نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ سست ہاتھوں سے سینٹرل ٹیبل صاف کر رہی تھی۔

"میرا دل نہیں مانتا۔ ابھی آمنہ کی گریجویشن میں سال ڈیڑھ سال ہے۔ وہ ذرا صبر کر لے۔ ایسا کون سا ہم بھاگے جا رہے ہیں۔ صوفیہ کا دل برا ہوگا۔ پھر آمنہ اس سے پورے چھ برس چھوٹی ہے۔ اگر ثناء ایک دو سال انتظار کر لے تو اس دوران اللہ ضرور کوئی نہ کوئی سبب لگا ہی دے گا۔ مجھے پورا یقین ہے، میں ثناء سے بات کروں گا۔" وہ مصمم ارادے سے بولے۔

"ابا جی! آپ کو ثریا چاچی کا تو پتا ہے۔ ان کا میکہ سارا لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں تو ایک صوفیہ ہے، وہاں پتا نہیں اس جیسی کتنی ہیں۔ ہماری طرف سے ذرا سی حیل و حجت ان کے لیے بہانہ بن جائے گی۔ مجھے یہی بات چاچو نے اشارتاً دو تین بار کہی ہے اور آپ کو پتا ہے سکندر ماں کا کتنا دیوانہ ہے۔ ابھی تو چاچو کا زور ہے اور وہ چاچو سے ڈرتا ہے۔ اگر ہم نے دیر کی تو ایک دو سالوں میں خدا جانے حالات کیا رخ اختیار کر لیں۔ چاچو کو انجائنا کی تکلیف ہے۔ پھر خدانخواستہ صوفیہ کے ساتھ ایسا کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔" بھیا کی باتوں میں واقعی وزن تھا۔ ابا جی چپ کر گئے۔

"ہوں۔ تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔" وہ کافی دیر بعد پرسوچ انداز میں بولے۔

"ابا جی! صوفیہ کا اللہ مالک ہے وہ ہمیں آمنہ ہی کی طرح پیاری ہے۔ یقیناً اللہ نے اس کا نصیب بہت اچھا بنایا ہوگا، مجھے پوری امید ہے آپ فکر نہ کریں۔ ہو سکتا ہے آمنہ کی شادی کے دوران ہی کوئی اچھا پروپوزل آ جائے اس لیے میرا خیال ہے کہ آپ چاچو کو ٹالیں نہیں وہ جو کہتے ہیں ان کی بات

مان لیں اور تاریخ دے دیں۔ آمنہ کا گریجویشن ہوتا رہے گا بعد میں۔ ویسے بھی اس کے لیے جتنی تعلیم ضروری ہے وہ تو اس نے حاصل کر ہی لی ہے۔ اب ہمیں اپنی طرف سے دیر نہیں کرنی چاہیے۔" بھیا پوری طرح تیار تھے۔

"تمہیں پتا ہے تعلیم کے متعلق اس کا جنون، کتنی ضد سے اس نے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔" ابا جی کو لاڈلی بیٹی کے ارمان کا خیال ستانے لگا۔

"ابا جی! دو سال تو اس نے پڑھ ہی لیا ہے نا، آگے اگر شوق ہوگا تو پرائیویٹ امتحان دے لی گی۔ وہاں اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ چاچو کتنے اچھے ہیں اور سکندر اتنا کوآپریٹو ہے۔ آپ بس خود کو ذہنی طور پر تیار کریں، باقی خدا پر چھوڑ دیں۔" بھیا کے پاس ہر بات کا جواب تیار تھا۔

"ہوں پھر نائلہ سے مشورہ کرو اپنے گھر کی تیاری کا جائزہ لے کر مجھے بتاؤ۔ اب ثناء اللہ کا فون آئے گا تو میں بات کروں گا۔"

ابا جی نے رضامندی سے کہا تو اسے لگا، کمرے میں ایک دم سے حبس بڑھ گیا ہے۔ وہ ڈسٹر وہیں چھوڑ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ پچھلا صحن عبور کر کے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی جب صوفیہ نے اسے پکارا۔

"آپی! میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

اس نے مڑے بغیر جواب دیا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ اس کے اندر یکا یک کسی آندھی بگولے کی طرح طوفان سا اٹھا تھا اور اس غبار کو باہر نکالنے کے لیے ٹیرس سب سے موزوں جگہ تھی، وہ چھت پر پڑی اکلوتی کرسی پہ بیٹھ کر دھواں دھار رونے لگی۔

☆☆☆

"ہاں ہاں ثناء! تم آجاؤ ہماری طرف سے کوئی دیر نہیں، جب تم کہو۔" ابا جی کی آواز ٹی وی لاؤنج سے صاف آ رہی تھی۔

"تیاری کی تم فکر نہ کرو۔ ہماری تیاری مکمل ہے۔ جب بھی تم کہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

پھر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگے۔

"اچھا سب کو ایک ساتھ آنا ہے۔"

"نہیں تو سکندر کو بھی ساتھ لے آؤ نا؟"

"ہاں کام کا مسئلہ ہو جائے گا، تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا تو پھر کب کا ارادہ ہے؟"

"نومبر کا آخری ہفتہ یا دسمبر کا پہلا ہفتہ۔ ٹھیک۔"

"تاریخ تو جب تم آؤ گے فوراً رکھ لیں گے۔ دسمبر یا جنوری کی جو تم کہو گے۔" ابا جی بھیا کا سکھایا ہوا سبق اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔

"ابھی تو مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہے کیا پتا اللہ میری بچی کا بھی کہیں سبب لگا دے تو میں دونوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔" ان کی آواز کچھ مدھم ہو گئی تھی اور کتاب پڑھتی صوفیہ اور بھی کتاب پر جھک گئی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ باقی کا پروگرام تم اگلے فون پر بتا دینا۔ ہم انشاء اللہ تیار ہیں، باقی جو اللہ کو منظور۔"

"بھابی اور بچوں کو میرا اسلام دینا۔"

"چلو ٹھیک ہے، اللہ حافظ۔" انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

"آپی! آپی! یہ کیا مذاق ہے؟" اس نے کچھ دیر خود پر ضبط کیا اور پھر کتاب زور سے بند کرتے ہوئے کچھ غصّے سے بولی۔

"کیا مطلب! کیسا مذاق؟" صوفیہ نے صفحے کا کونہ موڑتے ہوئے کچھ حیرانی سے پوچھا۔

"یعنی آپ نے سنا نہیں۔ ابا جی کیا کہہ رہے تھے؟" وہ چیخ کر بولی۔

"کیا کہہ رہے تھے، بھئی چاچو سے بات کر رہے تھے کہ اب آمنہ بی بی کو پیا دیس سدھار دیا جائے۔" صوفیہ نے مسکرا کر کہا۔

"پلیز آپی! یہ مذاق میرے ساتھ نہ کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس نے ماتھے پر بل ڈال کر بیزاری سے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیسا مذاق۔ بھئی یہ مذاق کب ہے۔ یہ تو بڑی سیریس گفتگو تھی جو ابھی تایا جی اور چاچو کے درمیان ہو رہی تھی۔" صوفیہ بولی۔

"آپی! آپ بھی۔ آپ بھی یہ چاہتی ہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کیا۔ میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ حیران ہو کر بولی۔

"یہی سب۔" وہ سچ مچ رو پڑی۔

"مینا! مینا! میری جان کیا ہو گیا ہے تمہیں، ڈیئر یہ سب تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ آج نہیں تو کل، اس ماہ نہیں تو اگلے ماہ۔ تو اس میں رونے کی کیا بات ہے۔" صوفیہ اس کے پاس آ بیٹھی اور اسے گلے سے لگاتے ہوئے پیار سے بولی۔

"آپی! مجھے پڑھنا ہے۔ بی اے تو کر لینے دیں۔ میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔" وہ بے ربط

سے انداز میں بولی۔

"مینا! کب سے تو یہ بات چل رہی ہے تمہیں معلوم تو ہے سب۔ تایا جی نے تمہیں بڑی مشکل سے انٹر کی اجازت دی تھی پھر تمہاری ضد پر تھرڈ ائیر میں بھی داخلہ لینے دیا۔ مگر اب چاچو کے اصرار پر، اور پھر یہ کام تو سال ڈیڑھ سال بعد بھی تو ہونا ہی ہے۔ بہتر ہے اگر وہ لوگ اتنی چاہت کر رہے ہیں تو ان کی بات مانی جائے۔" صوفیہ نے اسے سمجھایا۔

"ان کی چاہت کی فکر ہے سب کو۔ میری کوئی فکر نہیں۔" آنسو خواہ مخواہ ہی بہے چلے آ رہے تھے۔

"بے وقوف! ساری تمہاری ہی تو فکر ہے۔ سب تم سے اتنا پیار کرتے ہیں، ابا جی، بھیا، چاچو اور پھر سکندر بھی۔" صوفیہ نے اسے بہلایا۔

"نہیں، انہیں اپنی فکر ہے بس، کہ میرا یہاں نہ ہوا تو میں بھی ان پر بوجھ بن جاؤں گی۔"

"کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تمہارا یہاں کیوں نہ ہو۔ بھئی بچپن سے تمہاری بات طے ہے یہاں تو پھر؟" صوفیہ کچھ جھنجھلا کر بولی۔

"مجھ سے پوچھا کسی نے۔ بچپن میں ہی سب کچھ طے کر لیا۔ کیا میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی؟"

"تمہاری رائے۔" صوفیہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔ "تمہاری رائے کیا اپنے والدین سے مختلف ہو گی اور پھر گڑیا! یہ کوئی آج کی بات تو نہیں ہے جو تم اعتراض کر رہی ہو۔ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ تمہیں علم تو تھا سب۔ پھر پہلے کیوں نہیں بولیں؟"

"کیا بولتی بھلا۔ منہ پھاڑ کر کہتی کہ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔" وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں پسند نہیں بھلا؟" صوفیہ نے کچھ ناگواری سے پوچھا۔

"کیوں پسند ہو بھلا وہ سنیارا۔ مجھے نہیں پسند ایسے لوگ سونے چاندی کو تولتے پرکھتے لوگوں کو بھی اس پیمانے میں تولنے لگتے ہیں۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"اچھا نام دیا ہے تم نے سکندر سنیارا۔ ہاں۔" صوفیہ ہنسی۔ "خیر تمہارا یہ اعتراض مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ وہ تو صرف سیٹ پر بیٹھتا ہے کام تو کاریگر کرتے ہیں۔ وہ نہیں۔ ویسے بھی ہنر کوئی عیب نہیں ہے۔ ہاتھ سے کام کرنا تو شیوہ پیغمبری ہے۔"

"ہاں...... ساری نیکیاں، ساری سنتیں یہیں آ کر پوری ہوتی ہیں۔" وہ جل کر بولی۔

"میں اتنی دور جاؤں گی۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"ہاں نہ جانا یہیں رہ پڑنا ان کے ڈیفنس والے گھر میں۔ چاچی بھی مستقل یہیں آ رہی ہیں۔ انہیں وہاں کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔ اس لیے تم بھی ان کے ساتھ رہ لینا۔ کچھ ماہ بعد یہاں۔" صوفیہ نے اس کا دوسرا اعتراض بھی مسترد کر دیا۔

"اور میری پڑھائی۔"

"جب یہاں رہو گی تو پڑھائی بھی جاری رکھ لینا۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ اب تو ویسے سال کی مدت رہ گئی ہے تمہارے ایگزام میں۔"

"آپی! میں آپ کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" وہ صوفیہ کی گودی میں لیٹ گئی۔

"پگلی! میں اکیلی کب ہوں۔ سب میرے ساتھ ہیں۔ اور یہ تو سب کے ساتھ ایک دن ہونا ہی ہوتا ہے۔ کوئی ہمیشہ ساتھ کب رہا ہے۔" اس نے پیار سے اس کی پیشانی سے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

"آپی! آپ میں اور مجھ میں صرف چھ سال کا ہی تو فرق ہے۔ اور سکندر مجھ سے صرف سال بڑا ہے۔ میں تو ابھی۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور خاموشی سے صوفیہ کی شکل دیکھنے لگی۔

"ہاں کیا؟" اس کے چپ رہنے پر صوفیہ نے پوچھا۔

"آپی! اگر آپ کی سکندر سے ہو جائے۔ آپی زیادہ فرق تو نہیں ہے۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"آمنہ! صوفیہ غصے سے بولی۔

"آپی! میں نے کچھ غلط نہیں کہا آخر یہ بھی تو سنت رسول اللہ ﷺ ہے کہ اگر عورت مرد سے دو چار سال بڑی ہو تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔" وہ اسی بے خوفی سے بولی۔

"بس خاموش ہو جاؤ۔ آگے ایک لفظ نہ کہنا ورنہ۔" وہ چپ کر گئی۔ "اور سو جاؤ۔" غصہ ضبط کرتے ہوئے وہ اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔

"کیوں اب کیوں نہیں کہتیں کہ ہاں یہ بھی سنت رسول اللہ ﷺ ہے ہمیں اس کی بھی پیروی کرنی چاہیے۔"

"آمنہ! خاموش ہو جاؤ۔" صوفیہ شدید غصے سے بولی۔

"تو پھر ایک صورت اور بھی ہے۔" وہ غور سے صوفیہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ صوفیہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہم دونوں کون سا سگی بہنیں ہیں۔ اگر ہم دونوں کا ہی سکندر سے......"

"آمنہ!" صوفیہ نے ایک دم آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ وہ گال پر ہاتھ رکھ کر غصے سے اس کا کانپتا بدن دیکھنے لگی۔

"اتنی انسلٹ مت کرو میری کہ میں اپنی نظروں سے گر جاؤں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ٹھیک ہے، میں بوجھ ہوں، سب کو میرا احساس ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس طرح......اس طرح مجھے ذلیل کرو۔" وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اپنی جگہ سے ہلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ صوفیہ کچھ دیر ہلکی ہلکی سسکیوں سے روتی رہی پھر بستر پر دوسری طرف منہ موڑ کر لیٹ گئی۔

وہ احساس ندامت میں گھری اسے روتا دیکھتی رہی۔ جب کافی دیر گزر گئی وہ اسی طرح روتی رہی تو اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ اٹھ کر اس کے بستر پر جا بیٹھی۔

"آپی! آپی! صوفیہ آپی! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ آئی ایم سوری آپ ہرٹ ہوئیں۔ خدا کی قسم! میرا ایسا ارادہ نہیں تھا۔ میں نے بالکل سچے دل سے یہ بات کی تھی اور مجھے......اس پر ندامت بھی کوئی نہیں۔ ندامت ہے تو اس بات پر کہ آپ کو برا لگا۔ آپ نے میرے خلوص پر شک کیا۔" وہ اس کے کندھے پر جھک کر بولی۔ وہ خاموش رہی۔

"آپی پلیز، آئی ایم سوری۔ اچھا چلیں میں اپنی غلطی مان لیتی ہوں پلیز۔" وہ اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کرنے لگی۔

"آمنہ! سو جاؤ جا کر۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"ایسے کیسے سو جاؤں۔ میری آپی، میری دوست مجھ سے ناراض ہو اور میں سو جاؤں۔ جا کر۔" وہ لاڈ سے اس کا ماتھا چوم کر بولی۔ "آپی ڈیئر، صوفی آپی! معاف کر دیں نا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "یہ لیں میں کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں" اس نے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ لیے۔

صوفیہ اسی طرح لیٹی رہی۔

"آپی! میرے ہاتھ تھک گئے ہیں پلیز۔" وہ کچھ دیر کے انتظار کے بعد بولی۔

"افوہ آپی! میں تھک گئی ہوں۔ میری سزا ختم کریں۔"

"تمہیں کسی نے سزا نہیں دی ہے۔" صوفیہ سیدھی ہو گئی اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے کر دیے۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا۔"

''تم نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا، سب کے ہاتھوں میں تو پتھر ہیں، تم نے پھول مارا تو مجھے لگا یہ بھی پتھر ہی ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''شاعری۔'' وہ چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔ ''اور مجھے سب کے ساتھ شامل نہ کریں۔ میں سب نہیں ہوں۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''ایک شرط پر نہیں کروں گی۔'' صوفیہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''کون سی شرط؟''

''اگر تم مجھے سچ سچ بتاؤ گی جو میں پوچھوں گی۔''

''کیا؟'' وہ متوجہ تھی۔

''پہلے وعدہ کرو۔'' صوفیہ نے ہاتھ آگے کیا۔

''وعدہ!'' اس نے اپنا ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''تم شادی سے انکار کیوں کر رہی ہو۔ اور دوسرے تمہیں آج کل ہوا کیا ہے کیوں اس طرح کھوئی کھوئی سی رہتی ہو۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔'' وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''شادی تو ابھی میرا کرنے کو جی نہیں چاہ رہا اور کھوئی کھوئی بھلا کب ہوں۔'' وہ کھسیا کر بولی۔

''مینا! وعدہ کیا ہے تم نے۔'' صوفیہ نے اسے دھمکایا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''بولو نا!'' صوفیہ اس کی خاموشی پر بولی۔

''کیا بولوں؟'' وہ کچھ بے بسی سے بولی۔

''جو دل میں ہے، کہہ دو۔''

''اس سے کیا ہوگا۔'' وہ ہتھیلی کو غور سے دیکھتے ہوئے یونہی ہنسی۔

''یہ میں بعد میں بتاؤں گی کہ اس سے کیا ہوگا، تم بولو تو۔'' وہ اصرار سے بولی۔

''آپی! آپی!'' وہ پھر چپ کر گئی۔

''ہوں۔ میں سن رہی ہوں۔''

''آپی! مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ آپی! میرا اپنا آپ میرے بس میں نہیں رہا۔'' وہ سر جھکا کر بے بسی سے بولی۔

''ہوں!''

''آپی! پہلے دن سے جب سے اس کو دیکھا ہے آپی! مجھے اپنا ہوش نہیں۔ اس کے سوا مجھے

کچھ نظر نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟'' وہ اعتراف شکست کرتے ہوئے رو پڑی۔

''جان! کیا کہہ رہی ہو؟ کس کے بارے میں؟ کس کے بارے میں؟ کوئی پسند آ گیا ہے تمہیں؟'' صوفیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے بولی۔

''آپی! ایسا کیسے ہو گیا، آپی میرے ساتھ یہ کیا ہو گیا۔ ایسا تو میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔'' عجیب سا پچھتاوا اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔

''کیا۔ کیا ہو گیا ہے، کچھ بتاؤ بھی نا۔'' صوفیہ بے قراری سے بولی۔

''آپی! وہ کالج گیٹ کے باہر کسی کو لینے آتا ہے اور جب میں اسے دیکھتی ہوں تو پھر جیسے کچھ اور دیکھنے کی، چاہنے کی، سوچنے کی تمنا نہیں رہتی۔ بس یہی دل چاہتا ہے کہ صرف اسی کو دیکھتی رہوں۔'' اس کی آواز جیسے کسی گہرائی سے آ رہی تھی۔

''کون ہے وہ؟'' صوفیہ خوفزدہ آواز میں بولی۔

''پتا نہیں کون ہے وہ۔ مجھے تو اس کا نام بھی پتا نہیں اور میں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں نے بہت تمنا نہیں کی صرف اسے دیکھنے کی اور دیکھتے رہنے کی عجیب سی خواہش نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ میں کیا کروں؟'' اس کی سیاہ بھنورا سی آنکھوں میں احساس بے بسی اسی قدر شدید تھی کہ صوفیہ کا دل چاہا اس کو اپنے اندر چھپا لے۔

''گڑیا! یہ تم نے کیا کیا۔ تمہیں نہیں پتا تھا کہ تم نے ان راہوں پر نہیں چلنا۔ یہ تمہارا رستہ نہیں ہے پھر......'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''آپی! میں نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا۔ کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ خود بخود ہو گیا۔'' وہ گیلی پلکیں جھپک جھپک کر بولی۔

''نہیں سب کچھ خود بخود نہیں ہوا۔ جب تمہیں اپنی پہلی نظر کے گھائل ہونے کا علم ہوا تھا تو تم نے دوسری نظر ارادتاً کیوں ڈالی۔ جب تمہیں اپنی نظر کے بھٹکنے کا علم ہو گیا تھا تو تم نے اپنی دوسری نظر پر پہرے کیوں نہ بٹھائے۔ اسے اس طرف جانے سے کیوں نہ روکا۔ کیوں تم خواہش کے پیچھے سر پٹ بھاگ نکلیں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے تم نے خود کو اس جلتی بھٹی میں کیوں پھینکا ہے۔ اس میں تمہارا قصور......'' وہ زور دے کر بولی۔ ''ایک بار دوبارہ تم نے خود اس پیاس کے صحرا کو بھڑکایا۔ خود اس آگ کو سلگایا۔ اب کیوں روتی ہو۔ کانٹوں میں خوشبو نہیں ہوتی پھر تم نے یہ آس کیوں لگائی؟'' وہ تلخی سے بولتی گئی۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

''صرف مردوں کو ہی نہیں عورتوں کو بھی اپنی نگاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تمہیں پردہ کرانے کا اور کیا مقصد تھا کہ اپنے جسم کو چھپا کر تم اپنی نگاہوں کو بے لگام چھوڑ دو اور اس میں نقصان کس کا ہوا۔ اور تم بھول گئیں وہ حدیث کہ جس میں ایک نابینا صحابی رسول کریم ﷺ سے ملنے آئے اور آپ ﷺ نے پاس بیٹھی ازدواج مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دیا اور جب انہوں نے کہا کہ یہ تو نابینا ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی نابینا ہو۔ اس سے بڑھ کر انسانی نگاہوں سے پھیلنے والی خرابی کی اور کیا وضاحت ہوگی۔ پھر بھی تم نے یہ سب کیا۔“

”کون تھا وہ؟“ کچھ دیر بعد صوفیہ نے پوچھا۔

”پتا نہیں کون تھا وہ۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا نا اگر آج کی دنیا میں آپ کو ’اپالو‘ نظر آجائے تو آپ کے احساسات کچھ دیر کے لیے منجمد ہوں گے نا تو میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔“ وہ دکھ سے ہنسی۔

”اتنے ماہ سے تم یہ خود ہی۔“ ”بیٹا۔“ صوفیہ رنج سے بولی۔ ”تم نے مجھے کیوں نہ بتایا۔“

”اب تو بتا دیا ہے۔ اب آپ نے کیا کر لیا بھلا؟“ وہ جیسے ٹوٹ کر بولی۔

”میں کیا کر سکتی ہوں سوائے تمہارے حق میں دعا کرنے کے کہ خدا تمہیں صبر اور سکون دے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ”سو جاؤ۔ اب رات کافی گہری ہوگئی ہے۔“

وہ کہتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی تو آمنہ اٹھ کر اپنے بستر پر آگئی اور آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

رات بھر اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ بس بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہیں اور ہر کروٹ پر بے کلی کا احساس سا ہو جاتا اور صوفیہ رات بھر اسی کی طرف کروٹ لے کر سکون سے سوتی رہی۔ کم از کم اسے ایسا ہی لگا کہ وہ سکون سے سو رہی ہے۔ ذرا دیر کو اس کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آنکھ کھل گئی۔ صوفیہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ اس نے یونہی سیدھا ہو کر دائیں طرف دیکھا وہ جائے نماز پر کھڑی تہجد کی نماز پڑھ رہی تھی کیونکہ فجر کی نماز کا تو ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

”پتا نہیں آپی کے اندر اتنا سکون، اتنا ٹھہراؤ کہاں سے آیا۔ جب صوفیہ ان کے گھر آئی اپنے والدین کی حادثاتی موت کے بعد تو اس کی امی کے انتقال کو سال بھر ہو چلا تھا اور وہ بمشکل سات آٹھ سال کی تھی۔ اسے امی کے ساتھ سونے کی عادت تھی اور سال گزرنے کے باوجود وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکی تھی اور اس وقت تو بھیا کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کا گھر سال بھر میں ہی کیسے بکھر کر رہ گیا تھا۔

ملازمہ کے ہاتھوں کے پکے بدذائقہ کھانے کھا کھا کر اباجی اور بھیا اکتا چکے تھے اور اسے خود اکثر گندے یونیفارم میں اسکول جانا پڑتا تھا۔ اباجی اور بھیا کے کپڑے الماریوں میں ہمیشہ بے ترتیب رہتے۔ پورا گھر بدنظمی کا شکار ہو چکا تھا۔ جب اللہ نے صوفیہ کو اتنی بڑی محرومی دے کر ان کے گھر کسی محبت کی صورت بھیج دیا۔ وہ اپنا اتنا بڑا صدمہ بھول کر اس بکھرے گھر کو سمیٹنے میں لگ گئی حالانکہ خود اس کی عمر اس وقت بمشکل پندرہ سولہ سال تھی اور اگلے سال میٹرک کرتے ہی اباجی نے اسے گھر بٹھا لیا تو وہ صرف گھر کی ہو کر رہ گئی اور آمنہ کو تو اس نے اتنا پیار دیا جتنا شاید اس کی کوئی سگی بہن بھی نہ دے سکتی۔ پھر نائلہ بھابھی کے آتے ہی صوفیہ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔ پرائیویٹ انٹر اور پھر بی اے کیا اور اب ایم اے کا امتحان دے کر بیٹھی تھی۔ دیکھنے میں وہ بالکل بے حس لگتی تھی مگر یہ آمنہ جانتی تھی کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے غم کو بھی کتنی شدت سے محسوس کرتی تھی۔ پابندی سے نماز اور تہجد پڑھتی تھی اور آمنہ اس کی سخت تنبیہ کے باوجود وہ اکثر نمازیں کھا جاتی بیچ میں سے۔

”پتا نہیں اللہ نے آپی کے خمیر کو کون سی مٹی سے اٹھایا ہے کہ ان پر کسی بھی مشکل اور پریشانی کا اثر نہیں ہوتا۔“ یہ آخری بات جو وہ ہر بار ان کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ آج پھر سوچ بیٹھی۔

آمنہ اٹھ کر نماز پڑھ لو۔ وقت ہو گیا ہے نماز کا۔“ صوفیہ کی آواز پر وہ چونکی مگر انہوں نے بازو نہ ہٹایا۔

”اٹھ جاؤ۔ اٹھ کر نماز پڑھو اور خدا سے سکون مانگو۔ انسان کی محبت جب دلوں میں آتی ہے تو یہ دلوں کو بے قرار اور بے سکون کرتی ہے اور خدا کی محبت جب بھی دل میں گھر کرتی ہے یہ سکون دیتی ہے، قرار دیتی ہے۔ اٹھ کر اس سے اپنے دل کا قرار مانگو۔ اٹھو میری گڑیا۔“ وہ اس کے پاس بیٹھی بڑے پیار سے اسے اٹھا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

پھر دو تین دن اسی طرح خاموشی سے گزر گئے۔ ان دونوں میں بات چیت بھی بہت کم رہی۔ رات کو وہ روز صوفیہ کے کمرے میں آنے سے پہلے سوتی بن جاتی اور جب وہ کالج سے آتی اسے لگتا آپی اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر کچھ پڑھنا چاہ رہی ہیں۔ اس کی خاموش ملول نگاہوں میں سے کچھ ڈھونڈنا چاہ رہی ہیں۔ وہ خواہ مخواہ نظریں چرا جاتی۔

صبح کالج جاتے وقت بھی ان کی تنبیہی نظر اسے شرمندہ کر دیتی۔ کاش میں ان کو کچھ نہ بتاتی۔ اس نے کچھ بے بسی سے سوچا۔

☆☆☆

اس روز وہ کالج سے آئی تو کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم کا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے یونہی آگے بڑھ کر پردہ اٹھا کر دیکھا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ سینٹر ٹیبل پر چائے کے خالی برتن پڑے تھے۔ وہ اپنے کمرے کے طرف بڑھ گئی۔

''بھابھی! کوئی آیا تھا آج؟'' یونیفارم بدل کر وہ کچن میں آئی تو کھانا بناتی نائلہ سے اس نے پوچھا۔

''ہاں!'' نائلہ نے مختصر ترین جواب دیا۔

''کون آیا تھا؟'' اس نے پانی کا گلاس لے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''صوفیہ کہاں ہے۔؟'' نائلہ نے اس سے پوچھا۔

''اباجی کے کمرے میں ان کی الماری ٹھیک کر رہی ہے۔'' اس نے جواب دے کر گلاس لبوں سے لگا لیا۔

''آپ نے بتایا نہیں، کون آیا تھا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''وہ صوفیہ کی دوست نہیں ہے ثمن۔ جس کی شادی میں ہم لوگ گئے تھے۔'' نائلہ نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ دو سال پہلے ثمن آپی کی شادی میں ہم گئے تھے۔ کیا وہ آئی تھیں۔''

''ہاں وہی آئی تھیں۔ ساتھ میں اس کے دو مہمان اور بھی تھیں۔'' نائلہ نے چولہے کی آنچ دھیمی کرتے ہوئے کہا اور اس کے پاس آ بیٹھیں۔

''کون مہمان؟''

''وہ صوفیہ کو دیکھنے آئی تھیں۔ ثمن کے ہسبنڈ کے دوست کے ماں بہن تھیں، بہت اچھے لوگ ہیں وہ، ثمن بتا رہی تھی سب سے بڑی بات سکہ بند سید ہیں۔ اس بات کی وہ گارنٹی دے رہی تھی۔ لڑکا بھی بہت اچھا، شریف اور خوبصورت ہے انہیں سید گھرانے کی ہی صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی کی تلاش تھی جب انہوں نے ثمن سے صوفیہ کے متعلق سنا تو اصرار کرنے لگیں کہ وہ انہیں یہاں لے کر آئی تھیں بہر حال انہی صوفیہ بے حد پسند آئی ہے۔ وہ جاتے جاتے پرپوزل دے گئی ہیں، اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی ہیں۔ مجھے تو بہت اچھی لگی ہیں دونوں۔'' نائلہ نے اسے تفصیل بتائی۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' آمنہ خوش ہو کر بولی۔ ''آپی کے کیا تاثرات تھے۔''

''اسے تو پتا ہی نہیں چلا اور ابھی تو ہم دونوں ناشتے سے فارغ ہو کر چائے ہی پی رہی تھیں کہ یہ لوگ آ گئے اور صوفیہ جس حلیے میں تھی۔ اسی میں ان کے پاس جا کر بیٹھیں، تو جانے سے پندرہ منٹ پہلے ثمن نے مجھے ساری بات بتائی اور صوفیہ کو تو جاتے جاتے جب وہ خاتون گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے

کہنے لگیں کہ انشاء اللہ اب ہم دوبارہ ضرور آئیں گے۔ آپ کے گھر سے درنایاب کو لینے تو صوفیہ کو پتا چلا۔'' نائلہ جوش سے بتا رہی تھیں۔

''یہ تو بالکل ڈرامائی سی سچویشن لگتی ہے۔ کاش میں بھی موجود ہوتی۔'' آمنہ نے حیرت سے کہا۔ ''اچھے لوگ تھے بھابھی، کتنے بہن بھائی ہیں کہاں رہتے ہیں؟'' خیال آنے پر وہ پوچھ بیٹھی۔

''بس دو بہن بھائی ہیں، بہن کی تین چار ماہ بعد شادی ہے اس نے بیاہ کر خالہ کے گھر کینیڈا جانا ہے، بیٹے کا مسئلہ تھا انہیں کہ بیٹی کو رخصت کرنے سے پہلے بہو لے آئیں آج صوفیہ کو دیکھ کر خوشی سے سب بتانے لگیں۔ اور اسی شہر میں رہتے ہیں ڈیفنس میں گھر ہے۔''

''کرتے کیا ہیں، لڑکے کی کوالیفیکیشن۔ کیا ہے؟''

''بزنس ہے ان کا۔ شاید ٹیکسٹائل کا اور لڑکا ایم بی اے ہے۔ یہی بتا رہی تھیں باقی کی تحقیق وغیرہ تو اباجی اور تمہارے بھیا ہی کریں گے، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ بس سب کچھ طے ہو جائے گا انشاء اللہ۔'' وہ جوش سے بولیں۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو، اس روز روز کے تماشے سے تو نجات ملے۔'' آمنہ بھی جواباً بولی۔ ''ابا جی کو بتایا آپ نے؟''

''ہاں میں نے فوراً فون کر دیا تھا، باقی سب کچھ تو گھر آ کر ہی سنیں گے۔ آنے ہی والے ہوں گے۔ کہہ رہے تھے، تین بجے تک آ جاؤں گا۔ کھانا لگاؤں، تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔'' انہیں خیال آیا تو پوچھ بیٹھیں۔

''ہاں تیار ہے تو لگا دیں آپی کو بلا لاتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

''بھئی نائلہ! مبارک ہو میں نے پوری طرح سے چھان بین کر لی ہے سید ابتسام حیدر کے متعلق۔ ان کے والد سید احتشام حیدر تو بڑے اچھے جاننے والوں میں سے تھے پھر وہ کچھ عرصہ کے لیے بیرون ملک چلے گئے تھے جس کی وجہ سے ان سے ملنا ملانا ختم ہو گیا تھا اب جب صوفیہ کے سلسلے میں میں ان سے ملا تو حیرت انگیز خوشی ہوئی ہم دونوں کو، بہر حال اب اس رشتے کو طے سمجھو، میری تو خدا نے دل کی مراد پوری کر دی۔ میری دن رات اللہ سے یہ دعا تھی کہ وہ مجھے آمنہ سے پہلے صوفیہ کی خوشی دکھائے، اس نے میری دعا قبول کر لی۔ تم سب کو بھی مبارک ہو۔''

ایک ہفتے بعد رات کے کھانے کے بعد جب صوفیہ عشاء کی نماز پڑھنے چلی گئی تو اباجی نے انہیں بتایا۔

''واقعی اباجی! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، آپ کو بھی مبارک ہو۔'' نائلہ خوش ہو کر بولیں اور اس کی خوشی کا تو جیسے کوئی ٹھکانا نہ تھا، اگرچہ فوراً دل چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر جائے اور صوفیہ کو یہ خوشخبری سنائے مگر باقی کی رپورٹ کے لیے بھی دل مچل رہا تھا۔

''اباجی! میں آپ سے کہتا تھا نا کہ اللہ ضرور کوئی نہ کوئی سبب بنائے گا۔ آپ صوفیہ کی طرف سے فکر نہ کریں جیسے ہی آپ نے چاچو سے ہامی بھری صوفیہ کا مسئلہ بھی اس نے حل کر دیا۔'' بھیا بولے۔

''اباجی! اب وہ لوگ کب آئیں گے۔'' نائلہ نے سب سے کام کا سوال پوچھا۔

''وہ منگنی کرنے پر اصرار کر رہے تھے، میں نے منع کر دیا۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''کیوں اباجی۔'' نائلہ نے پوچھا۔

''بیٹا! اس رسم کی ہمارے مذہب میں کہیں گنجائش نہیں ہے، محض بے جا نمود و نمائش کا ایک ذریعہ ہے، وہ مسلمان ہی کیا ہوا جسے اپنی زبان کا پاس نہ ہو۔ منگنی کا تو مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی بات بہت سے لوگوں کی موجودگی میں بڑھ چڑھ کر پہنچانی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ یہ بات نہ نبھ سکے تو خوامخواہ کی جگ ہنسائی۔'' اباجی کی بات اسے بھی بہت اچھی لگی۔

''پھر؟۔'' نائلہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''انہیں بھی شادی کی جلدی ہے اور ہمیں بھی تو پھر نیک کام میں دیر کیسی، اصل میں وہ بیٹی کے ساتھ ہی بیٹے کی کرنا چاہ رہے ہیں، تقریباً چار پانچ ماہ تک ہم بھی دونوں کی اکٹھی تیاری کر لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' نائلہ نے سر ہلایا۔

''ویسے ان لوگوں کا نکاح کرنے کا ارادہ ہے، ابتسام کو اپنی فیکٹری کی کچھ مشینری خریدنے کے لیے ایک دو ماہ تک جرمنی جانا ہے، وہ اس سے پہلے نکاح کرنا چاہتے ہیں میں نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا ہے اب چار پانچ ماہ بعد شادی کر ہی دینی ہے۔ تو پھر نکاح کی کیا ضرورت ہے، کیوں وقار؟'' انہوں نے بھیا سے پوچھا۔

''جی اباجی!'' میرا بھی یہی خیال ہے، خیر دیکھیں گے۔'' بھیا نے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

صوفیہ ابھی نماز پڑھ رہی تھی جب وہ کمرے میں داخل ہوئی وہ بے چینی سے اس کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

''آپی! مبارک ہو، بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ۔'' جیسے ہی صوفیہ نے آخری سلام پھیرا وہ اس کے گلے سے لٹکتے ہوئے خوشی سے بولی۔

''کیا مطلب کس بات کی مبارک باد۔ کیا میرا بانڈ نکل آیا ہے۔'' صوفیہ نے جائے نماز کا

کونہ موڑتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

''بانڈ کیا چیز ہے، جناب! اس اتنی بڑی خبر کے آگے۔'' وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''کون سی خبر۔'' صوفیہ نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''اوہو جیسے آپ کو تو کچھ پتا ہی نہیں۔'' وہ لہک کر بولی۔ ''سب پتا ہے آپ کو انجان بن رہی ہیں۔''

''کیا بھئی، کیا پتا ہے مجھے؟'' وہ مسکراتے ہوئے کچھ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''اچھا۔ آپ کو کچھ پتا نہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''نہیں کچھ پتا نہیں۔'' صوفیہ جواباً بولی۔

''تو ٹھیک ہے پھر مجھے بھی کچھ پتا نہیں۔'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی صوفیہ نے سر ہلا کر دوبارہ رخ جائے نماز کی طرف پھیر لیا اور تسبیح پڑھنے لگی۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ وہ پوچھے گی مگر جب ایسا کچھ نہ ہوا تو وہ بے صبری سے پھر اس کے پاس آ بیٹھی۔

''آپی! اباجی کو سید ابتسام حیدر کا رشتہ پسند آ گیا ہے انہوں نے ہاں کر دی ہے اور باقاعدہ چھان بین بھی کر لی اب آپ مجھ سے پہلے اس گھر سے رخصت ہوں گی۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی تو صوفیہ کی ہنسی نکل گئی۔

''بہت بے صبری ہو تم، دعا بھی مجھے دھیان سے نہیں مانگنے دی۔'' وہ جائے نماز تہہ کرتے ہوئے بولی۔

''اب ساری دعائیں قبول ہو گئیں ہیں، اب تو ان دعاؤں کے پھل کھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب فکر کس بات کی ہے ہائے آپی میں اس قدر خوش ہوں کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔'' وہ اس کے پیچھے اٹھ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔

''بے صبری لڑکی! پہنچا دی ساری رپورٹ۔'' نائلہ اندر آتے ہوئے اسے دیکھ کر بولی۔

''نہیں تو کیا آپ نے یہ کام سر انجام دینا تھا۔'' وہ فوراً بولی۔

''نہیں بھئی اللہ تمہیں ہی مبارک کرے یہ بدہضمی والے کام۔'' نائلہ نے ہنس کر کہا اور صوفیہ کو گلے لگاتے ہوئے بولیں ''مبارک ہو صوفی بہت زیادہ۔'' صوفیہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

''ہائے بھابھی! دیکھیں آپی شرما رہی ہیں۔'' اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''شرم کرو بدتمیز لڑکی! بڑی بہن کا مذاق اڑا رہی ہو۔'' صوفیہ نے اس کا منہ پرے کرتے

ہوئے کہا۔

"شرم تو آپ کو آ رہی ہے۔ میں تو ازلی بے شرم ہوں اب جناب دیکھیے گا ہمارے پروگرام، ساری رسمیں کریں گے ہم، مہندی کا فنکشن بڑا زبردست ہوگا۔ میں اپنی ڈھیر ساری فرینڈز کو بلواؤں گی۔ دودھ پلائی، جوتا چھپائی، ہائے مجھے ان رسموں کا کتنا شوق تھا۔ ساری رسمیں کریں گے۔ ہے نا بھابھی۔ اور ڈھولکی بھی رکھیں گے، اتنے عرصے کے بعد تو اس گھر میں خوشی آئی ہے۔" خوشی اس کے ایک ایک انداز سے چھلک رہی تھی۔

"اور پھر شیخ چلی کے سر سے گھی کا کنستر گر گیا۔ واپس آ جاؤ عزیزی آمنہ! بہت خواب دیکھ لیے۔" نائلہ نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"کیوں اس میں خواب دیکھنے والی کون سی بات ہے۔ کیا ہم ایسا نہیں کریں گے۔" وہ برا منا کر بولی۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمہیں معلوم ہے، ہمارے ہاں اس قسم کی بقول اباجی کے بے ہودہ رسمیں نہیں ہوتیں۔ اور نہ وہ کرنے دیں گے دوسرے اس وقت خود دلہن بنی بیٹھی ہوگی صوفیہ کے ساتھ پھر ان رسموں کا کیا سوال۔" نائلہ بولی۔

"بھابھی! ایسا ہرگز نہیں ہوگا، میں آپ کو بتا رہی ہوں، پہلے آپی کی شادی ہوگی۔ بعد میں آپ لوگ کچھ اور سوچیے گا اور چاہے جو ہو جائے میں تو یہ رسمیں ضرور کروں گی، مجھے تو بچپن سے اتنا شوق ہے ان رسموں کا، خاص طور پر دودھ پلائی کی رسم مجھے بے حد پسند ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے سب، پھر میری ایک ہی تو آپی ہیں کون سی پانچ سات اور ہیں جو میں ان کی آس پر صبر کر کے بیٹھ جاؤں، آپ بے شک اباجی کو جا کر بتا دیں۔ میں اس بات پر کوئی کمپرومائز نہیں کروں گی۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

"بہت بے وقوف ہو تم ایسے باتیں کر رہی ہو، جیسے تمہیں کچھ علم نہیں۔ یاد نہیں ایسے موقعوں پر بھی ہمارے ہاں پردے کا کتنا خیال رکھا جاتا ہے کیا میری چھوٹی بہنیں نہیں تھیں۔ ہمارے ہاں تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اب اباجی کیوں یہ سب کرنے دیں گے۔ ویسے بھی یہ فضول رسمیں ہیں۔ محض دکھاوا اور نمود و نمائش۔" نائلہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

"دکھاوا اور نمود و نمائش تو یہ شادی بیاہ بھی ہیں۔ ہمارے عیدوں کے تہوار ہیں، جن میں اب مذہبی احترام کم اور نمود و نمائش زیادہ ہوتا ہے اور نکاح تو سادے کپڑوں میں مسجد میں جا کر چار گواہوں کی موجودگی میں بھی ہو سکتا ہے، اور گواہوں کو صرف کھجوروں یا خالی پانی پر ہی نپٹایا جا سکتا ہے۔ اسلامی طریقہ کار تو یہی ہے، باقی سب تو نمائش ہے۔ اس پر پابندی کیوں نہیں لگاتے یہ جو ٹرک بھر بھر کر جہیز کے

جاتے ہیں یہ بھی تو نمود و نمائش ہے۔ اس پر بھی پابندی ہونی چاہیے صرف اب میری ہی معصوم سی خواہشات پر پابندی کیوں لگائی جائے۔ ان سب پر بھی پابندی لگنی چاہیے آپ یہ سب جا کر بے شک اباجی کو بتا دیں میں سب کچھ کروں گی۔ ڈھولک بھی رکھوں گی۔" وہ جذباتی انداز میں ضد سے بولی۔

"افوہ آمنہ! حد کرتی ہو تم بھی۔" نائلہ صرف یہی کہہ سکیں۔

"بھابھی! میں سمجھا لوں گی اسے، آپ فکر نہ کریں آپ تایاجی سے کچھ نہ کہیے گا۔" صوفیہ نے نائلہ کو تسلی دی تو آمنہ اٹھ کھڑی ہوگئی، اور غصے سے پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئی وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

جو لوگ کسی کی امانت ہوتے ہیں ان کو وقت سنبھال کر رکھتا ہے اس تک پہنچانے کے لیے صحیح و سالم، اور وہ سب لوگ جو صوفی کو دیکھنے آتے تھے اور کوئی نہ کوئی عذر کر کے ٹھکراتے رہے وہ تو راہ کے موڑ تھے اور اگر رستے میں بار بار موڑ آئیں تو سفر کرنے والے ایک دفعہ تو ضرور ہی گھبرا جاتے ہیں اور یہی سب اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ لوگ بھی اس سلسلے میں پریشان ہو چکے تھے اتنے ڈھیر پرپوزلز آئے اور کتنے تو اباجی اور بھیا کو اتنے پسند آئے کہ انہوں نے اپنی طرف سے اوکے کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر جب نصیب کی طرف سے اوکے نہ ہو تو انسان لاکھ چاہے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور اب بالکل اچانک سب کچھ دنوں میں طے ہو گیا تھا۔

"بھئی وقار! وہ سید ابتسام حیدر آئے تھے آج، میرے پاس وہ نکاح کے لیے کہہ رہے تھے۔" وہ اباجی اور بھیا کو چائے دینے کے بعد باہر جا رہی تھی۔ جب اس نے اباجی کو کہتے سنا تو وہ دروازے کے باہر ہی رک گئی۔

"اباجی! آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ ہم شادی ہی جلد کرنا چاہتے ہیں تو پھر نکاح کا کیا جواز؟" بھیا بولے۔

"کہا تھا وہ کہنے لگے کہ شادی میں تو واقعی صرف چار پانچ ماہ ہیں اصل میں ان کی بیٹی کی یہ خواہش ہے کہ وہ بھائی کا کوئی فنکشن اچھی طرح سے اٹینڈ کر سکے کیونکہ اس وقت ایک تو اس کی خود شادی ہونی ہے دوسرے وہ ایک ہفتے بعد ہی کینیڈا چلی جائے گی اس لیے وہ ماں باپ سے اصرار کر رہی ہے۔ ابتسام کہہ رہے تھے کہ ان کی ایک ہی بیٹی ہے، اس کا دل خوش ہو جائے گا اور اس میں بظاہر حرج بھی کوئی نہیں خدانخواستہ کوئی بے اعتباری کی بات تو نہیں ہے تو میں چپ کر گیا۔ میں نے کہا کہ نہیں آپ کو ایک دو روز میں گھر سے مشورہ کر کے بتا دوں گا اب تم کہو۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر سوچ لینے دیں اس میں واقعی کوئی حرج نہیں ہے دیکھے بھالے لوگ ہیں۔
ویسے ابا جی! آپ نے چاچو سے بات کی تھی انہیں بتایا تھا صوفیہ کی بات طے ہو جانے کے متعلق۔" بھیا بولے۔

"ہاں بتا تو دیا ہے، پچھلے ہفتے۔ بہت خوش ہوا تھا وہ بھی سن کر۔"

"پھر آپ نکاح کا مشورہ بھی چاچو سے کریں بلکہ اگر مان جائیں تو انہیں کہیں کہ وہ نکاح میں شامل ہونے کے لیے آئیں، یہ زیادہ مناسب ہوگا۔" بھیا نے مشورہ دیا۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ثناء خود آئے، صوفیہ کا مان بڑھے گا اور اس بچی نے اس گھر کی اتنی خدمت کی ہے اتنی سعادت مند اور نیک بچی ہے کہ ہر وقت میرے تو دل سے اس کے لیے دعا ہی نکلتی ہے۔" ابا جی اپنی دھن میں بول رہے تھے۔

"ویسے یہ نکاح والی بات زیادہ اچھی ہے، اپنی آمنہ بھی خوش ہو جائے گی۔ اس کی بھی بڑی تمنا تھی کہ صوفیہ کی شادی اس سے پہلے ہو اور وہ شادی کا فنکشن اچھی طرح اٹینڈ کرے۔" بھیا بولے تو اسے بھیا پر بڑا پیار آیا۔

"ہوں چلو ٹھیک ہے پھر۔"

"ابا جی! وہ آمنہ کہتی ہے کہ وہ ڈھولک بھی رکھے گی اور ساری رسمیں بھی کرے گی۔ دودھ پلائی وغیرہ کی۔" بھیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ شاید نائلہ نے ان سے کہا تھا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا، میری ذرا سی ڈھیل اور لاڈ پیار کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کی ہر فضول فرمائش مانتا چلا جاؤں، وقار! اس کو بتا دینا میں اپنی روایتوں اور اصولوں پر اس کی بات نہیں مانوں گا سادگی سے نکاح ہوگا اور سادگی سے شادی ہوگی۔ یہ ہندوانہ رسمیں نہیں ہوں گی نہ ہمارے خاندان میں پہلے کبھی ہوئی ہیں اور نہ میرے ہوتے ہوئے ہوں گی۔" ابا جی کی غصے بھری آواز پر اس کا ننھا سا دل ٹوٹ سا گیا وہ آنکھوں میں پانی لیے وہاں سے ہٹ گئی۔

پھر اگلے روز جب وہ کالج سے آئی تو نائلہ چائے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔

"کوئی آیا تھا بھابھی؟" وہ یونیفارم بدلے بغیر ہی کچن میں آ گئی۔

"وہ صوفیہ کی ساس اور نند آئی تھیں ابھی گئی ہیں۔" نائلہ نے چائے کے خالی برتن سنک میں رکھے۔

"انہوں نے بھی تب ہی آنا ہوتا ہے، جب میں کالج میں ہوتی ہوں۔" اس نے نمکو کا چمچ بھر کر منہ میں ڈالا۔

"ہاں آج تو انہیں بھی کافی افسوس ہو رہا تھا کہ تم سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ کہہ رہی تھیں کہ ایک دو روز میں پھر آئیں گی۔ آج تو انہیں جیولر کی طرف جانا تھا۔

"صوفیہ کی انگوٹھی اور چوڑی کا ناپ لینے آئی تھیں، بہت اچھی ہیں، بہت خوش اخلاق اور محبت کرنے والی اور بیٹی بھی بالکل ماں جیسی ہے ہنس مکھ۔" نائلہ برتن دھوتے ہوئے تعریف کیے جا رہی تھیں۔

"بس کریں، اتنی تعریفیں نہ کریں مجھے جیلسی فیل ہو رہی ہے۔" وہ بسکٹ کھانے لگی۔

"تم بھی ملو گی تو تم بھی تعریف کرو گی ان کے اچھے اخلاق کی۔ ابا جی بتا رہے تھے کہ ابتسام بھی، بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق ہے۔"

"اچھا اس ہنس مکھ اور خوش اخلاق کو کیا انہوں نے پردوں میں ہی چھپا رکھا ہے۔ بھابھی! کم از کم تصویر تو منگوائیں۔ کیا معلوم گنجا ہی نہ ہو۔ ہو سکتا عمر کا زیادہ ہو۔ پتا نہیں ابا جی کے سامنے وہ کھڑا بھی ہوا تھا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے چال میں ہی کوئی نقص ہو۔ اب ایسی بھی کیا پردہ داری۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"ایک دو روز میں تمہارے بھیا کا پروگرام ہے ان کی طرف جانے کا۔ تم چلی جانا ساتھ اور اسے خوب چلا کر، ہنسا کر، رلا کر اور سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھ لینا کہ کیا کیا مصنوعی ہے۔" نائلہ نے جیسے اسے تسلی دی۔

"یہ عنم اور طوبیٰ ابھی اسکول سے نہیں آئیں کیا؟" اس نے باہر جاتے جاتے پوچھا۔

"آ گئی ہیں۔ ان کے ماموں آئے تھے۔ دونوں وسیم کے ساتھ چلی گئی ہیں۔ کل چھٹی ہے نا۔" نائلہ نے اسے بتایا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اے شہر آرزو
آ پلٹ کر دیکھ ذرا
کتنی تباہیاں ہیں تو نے پھیلائیں
کتنے شہر دل تو نے اجاڑے
کتنے شہر خواب تو نے ویراں کیے
جس دل میں تو بس گیا
وہ دل
وہ شہر

برباد ہوا
پھر نہ کبھی آباد ہوا
آ پلٹ کر دیکھ ذرا

"کتنے دن گزر گئے ہیں شاید پندرہ دن نہیں سولہ دن۔ ہاں! بالکل سولہ دن سے وہ نظر نہیں آیا اور میں پاگلوں کی طرح ہر روز گھنٹوں گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرتی ہوں۔ آخر کس لیے؟ آخر کیوں؟ اس تلاش لاحاصل کا نتیجہ کیا نکلے گا؟"

اس نے تھک کر کنپٹیاں دبائیں۔

"ہر وقت، ہر پل ایک ادھورے پن کا احساس اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی دید کی پیاس نے کیوں مجھے اس طرح نڈھال کر دیا ہے۔ کیا آپی صحیح کہتی ہیں کہ سارا قصور میرا ہے۔ پہلا قدم، پہلی نظر غیر ارادی ہوتی ہے۔ اس کی معافی ہے۔ دوسرا قدم دوسری نظر تو ارادی ہوتی ہے اس کی معافی نہیں۔ اس کی سزا ہے۔"

ہاں واقعی اس کی سزا ہے جو میں دن رات جھیل رہی ہوں۔ کیوں نہ روکا میں نے اپنی دوسری نظر کو۔ نہیں آپی! کچھ بھی ارادتاً نہیں ہوتا جب کوئی چیز مقدر کر دی جاتی ہے تو پھر اسے مفر نہیں ہو سکتا۔ یہ دل کی تباہی میرے مقدر میں تھی، میں کیا کرتی، کیسے خود پر بند باندھتی۔" اس نے تھک کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"صرف ایک بھٹکی ہوئی نظر نے مجھے کتنے عذابوں میں مبتلا کر دیا۔ مرے دل کا سکون و قرار لٹ گیا اور جذبات جو کسی کی امانت تھے اور راہ میں ہی وہ امانت لٹ گئی۔ اب یہ سب کیا تماشا ہے۔ یہ شادی، یہ نکاح، یہ رشتے، کیا رشتے محض کاغذ پر دستخط کرنے سے قائم ہو جاتے ہیں۔ دلوں کی کوئی اہمیت نہیں؟ احساسات کچھ بھی نہیں۔ یہ دوغلی زندگی میں کہاں تک نباہ پاؤں گی۔ بہت مشکل، بہت کٹھن رستہ ہے، آگے میں نہیں چل پاؤں گی۔

"ایک بار کی بغاوت مجھے بہت سے عذابوں سے بچالے گی۔ میں شادی سے انکار کر دیتی ہوں۔ کیا ضروری ہے کہ شادی ضرور ہی کرو۔ بددیانتی پر جن تعلقات کی بنیاد رکھی جاتی وہ بہت دیرپا نہیں ہوتے جو توڑ پھوڑ آگے جا کر ہونی ہے اس سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ میں انکار کر دوں ابھی۔ کتنی زبردستی کر لیں گے یہ مجھ سے۔

"اگر میں اس کی نہیں ہو سکتی تو نہ سہی۔ پھر سکندر کی بھی کیوں۔ اس کو یہ سزا کیوں ملے۔ میری خطا ہے تو سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے۔"

"مینا! مینا، ایسے کمرے میں اندھیرا کر کے کیوں بیٹھی ہو۔ اٹھ کر بیٹھو۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی ہیں۔" صوفیہ نے اندر آ کر لائٹ جلاتے ہوئے اسے کہا تو اس نے زور سے آنکھیں مسل ڈالیں۔

"کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟" وہ اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے تشویش سے بولی۔

"ٹھیک ہوں میں۔" وہ یونہی قمیص کی شکنیں درست کرنے لگی۔

"مینا! کیا بات ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گی۔"

"کچھ نہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا پھر کتنے ہی پل خاموشی سے گزر گئے۔

"کیا وہ اب بھی کالج آتا ہے۔ تم اس سے ملی تھیں؟" کچھ دیر بعد صوفیہ نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ تمہیں بہت اچھا لگتا ہے؟" صوفیہ کی آواز اسے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ وہ چپ رہی۔

"مینا! اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر تم نے یہ روگ کیوں پالا۔ کیوں گڑیا؟" صوفیہ نے جھک کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تو اس کے آنسو روانی سے بہنے لگے۔

"چپ ہو جاؤ۔ میرے دل کو تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ تھوڑی دیر بعد اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

وہ خاموش آواز سے روتی رہی۔

"مینا جان! اس وقت نہیں روتے، شام کا وقت ہے۔ چلو اٹھ کر نماز پڑھو۔" صوفیہ نے اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"آپی! شام کا وقت اتنا اداس کر دینے والا کیوں ہوتا ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"دونوں وقت ملتے ہیں نا اس لیے۔" صوفیہ دھیرے سے بولی۔

"کیا ملن کے سمے کائنات پر اتنے بھاری ہوتے ہیں کہ سب کچھ جیسے اداسی میں ڈھل جاتا ہے۔ کیا ملن کا نتیجہ اداسی اور نارسائی ہوتا ہے جو ایسی دل کو کاٹ دینے والی خاموشی ہر طرف چھا جاتی ہے۔ پرندے تک خاموش ہو جاتے ہیں۔" وہ کھوئی کھوئی سی بول رہی تھی۔

"پتا نہیں۔ چلو اٹھو، اٹھ کر نماز پڑھو۔ دیر ہو رہی ہے۔ اکیلی بیٹھی پتا نہیں کیا فضول باتیں سوچتی رہتی ہو۔ پھر کچھ میرے اور بھابھی کے ساتھ کام کرواؤ بیڈ شیٹس پیک کر رہی ہیں آ جاؤ۔" صوفیہ

کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''آپی پلیز، میری بات سنیں۔'' وہ ملتجی لہجے سے بولی۔

''کیا...... کیا بات ہے؟'' وہ رک گئی۔

''یہاں بیٹھیں آ کر۔'' اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں جلدی بولو۔ دیر ہو رہی ہے نماز کو۔'' وہ ذرا سا بیڈ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے عجلت سے بولی۔

''آپی! وہ......'' وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ کہنے کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

''ہاں بولو نا۔ کیا بات ہے؟''

''آپی! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ ابا جی سے کہہ دیں۔'' اس نے ایک ہی سانس میں کہہ کر نظریں جھکا لیں۔

''مینا! کیا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟'' صوفیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''ہاں مجھے پتا ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ یہ سب ابا جی سے نہیں کہیں گی تو میں خود کہہ دوں گی۔ مجھے یہ شادی وادی نہیں کرنی فضول کی بناوٹ۔ جب انسان کا دل ہی راضی نہ ہو۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''خبردار تم نے تایا جی سے ایسی کوئی الٹی بات کی تو۔'' صوفیہ نے اسے ڈانٹا۔ ''بس بہت ہو گیا یہ سب۔ اب ٹھیک کر دو اپنا دماغ۔ کیابات اور بھائی کی عزت کا تمہیں کچھ خیال نہیں؟''

''ان ہی کی عزت کا تو خیال کر رہی ہوں۔ جب یہ سب آگے جا کر ہونا ہے تو اس سے پہلے ہی کیوں نہ......''

''بس...... بس کرو۔ اب اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو اچھا نہیں ہو گا۔ سب کی محبت کا تم ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔'' وہ غصے سے بولی۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے صوفیہ نے اپنا لہجہ نرم کیا۔ ''اور آگے جا کر کچھ نہیں ہونا۔ یہ سب وقتی جذباتی ابال ہوتے ہیں۔ سب پر یہ وقت آتا ہے۔ اس عمر میں کوئی یونہی دل کو بھا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سایوں کے تعاقب میں نکل پڑے۔ کچھ وقت گزرتا ہے تو زندگی خود ہی بہت کچھ سمجھا دیتی ہے اور انسان کو اپنا وہ جذباتی پن حماقت لگنے لگتا ہے۔ تم آگے کی فکر نہ کرو۔ آگے انشاء اللہ سب اچھا ہو گا۔ اس بات کی میں گارنٹی دیتی ہوں تمہیں۔ چلو اب کمرے سے نکلو اور کچھ الٹا سیدھا نہیں سوچنا۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا تو وہ

خاموشی سے جوتے پہن کر صوفیہ کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

''ہاں میں نے کہہ دیا ہے ان سے۔ دسمبر کا آخری ہفتہ ٹھیک رہے گا۔ ابھی تقریباً پندرہ دن ہیں۔'' ابا جی کی آواز ٹی وی لاؤنج سے آ رہی تھی۔ وہ چاچو کو فون کر رہے تھے۔ وہ سٹنگ روم میں اکیلی بیٹھی تھی۔

''اپنی بات سے میں کب پھر رہا ہوں۔ دسمبر میں صوفیہ کا نکاح ہے تو فروری کا آخری ہفتہ یا مارچ کا پہلا ہفتہ دونوں کی تاریخ رکھ لیں گے۔ تم آ جاؤ گے تو سارا معاملہ طے کر لیں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، صحیح ہے، ہاں۔'' وہ دوسری طرف چاچو کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ پھر خدا حافظ۔'' انہوں نے فون بند کر دیا۔

وہ اسی طرح بے حس بیٹھی رہی۔

''اگر جا کر ابھی ابا جی سے بات کر لوں۔'' اس نے سوچا۔ وہ بھی فون رکھ کر فوراً ہی کمرے سے نکل آئے۔ سامنے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ صوفیہ اور نائلہ کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ طوبیٰ اور عنم ان کے پاس بیٹھی کھیل رہی تھیں۔

''آمنہ کہاں ہے؟'' انہیں ایک دم سے خیال آیا۔ انہوں نے یوں ہی آگے بڑھ کر سٹنگ روم میں جھانکا تو وہ چپ چاپ ہی صوفے پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا۔ کتنے دنوں سے وہ اس کی بے تحاشا خاموشی کو محسوس کر رہے تھے اور وہ انہیں پہلے سے کافی کمزور بھی لگی۔

''آمنہ! آمنہ بیٹا! کیا بات ہے ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ اندر اس کے پاس آ کر بولے تو وہ جیسے چونک پڑی۔

''کچھ نہیں ابا جی ویسے ہی بیٹھی ہوں۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے۔ میرا بیٹا اداس ہے۔'' وہ اس کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے شفقت سے بولے۔

''نہیں تو ابا جی!'' اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''کوئی تو بات ہے۔ کتنے دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں تمہیں یوں چپ چپ۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟'' وہ نرم لہجے میں محبت سے بولے۔

''ابا جی! کوئی بات نہیں ہے۔'' اس کی آواز خواہ مخواہ بھرا گئی۔

''کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کوئی پریشانی ہے بیٹا! تو مجھ سے کہو۔'' وہ بولے۔ ''اگر مجھ سے کوئی تمہاری حق تلفی ہو گئی ہو یا کوئی زیادتی۔'' وہ کچھ رک کر بولے تو اس نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

''ابا جی!'' وہ ہمت کر کے بولی۔

''ہاں بیٹا! کہو، میں سن رہا ہوں۔'' وہ ہمہ تن گوش تھے۔

''ابا جی! وہ......'' وہ پھر جھجک گئی اتنی بڑی بات کیسے کہے۔

''ہاں ہاں بلا جھجک کہو۔ بیٹا مجھ سے نہیں کہو گی تو اور کس سے کہو گی۔ کچھ چاہیے مجھے بتاؤ۔'' کتنی مدت بعد وہ اس سے اس درجہ محبت اور توجہ سے بولے تھے۔

ماں باپ اولاد کی کیفیت کو ان کے چہرے دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں مگر نہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو انجان بن جاتے ہیں۔

''ابا جی! میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ گریجویشن مکمل کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔

''میں جانتا ہوں بیٹا! تمہیں کتنا شوق ہے پڑھنے کا میرے بس میں ہو تو میں تمہاری ایک خواہش بھی تشنہ نہ رہنے دوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں بیٹا۔ بیٹی کا باپ ہوں نا اس لیے۔'' ان کے لہجے میں دکھ سا تھا۔

''آمنہ بیٹی! جس طرح سب بادل بارش نہیں برساتے کچھ بادل تو بس آتے ہیں اور بن برسے گزر جاتے ہیں اور ہر موسم کی طرح چاہتوں کے بھی موسم ہوتے ہیں جو بار بار نہیں آتے۔ بادل برسیں یا نہ برسیں اس سے انسانوں کی زندگی اتنی متاثر نہیں ہوتی جتنی محبتوں کے موسم کو نظر انداز کر دینے سے ہوتی ہے۔ یہ موسم بار بار نہیں آتے اور اگر ایک بار آ کر چلے جائیں بن برسے تو پھر ساری عمر کے پچھتاوے رہ جاتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ خدانخواستہ تم پر یہ بادل بن برسے گزر جائیں۔''

وہ ایک لمحے کو چپ کر گئے جیسے اپنی ہی بات سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ''اور بیٹا! پڑھائی تو تم بعد میں بھی جاری رکھ سکتی ہو۔ علم کی تو کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ بس دل میں شوق کا دریا ہونا چاہیے۔ پھر کوئی بند، کوئی بندش اس دریا کو نہیں روک سکتی۔ تم بعد میں بھی پڑھ سکتی ہو۔ میں ثنا سے کہہ دوں گا، وہ بالکل انکار نہیں کرے گا۔'' وہ اسے مطمئن کر رہے تھے۔

''ابا جی! مجھے یہ درد کب ہے۔ ابا جی میں کیسے بتاؤں مجھے کیا روگ لگ گیا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑی۔

''ابا جی! میں اتنی دور نہیں جاؤں گی آپ سے۔'' کتنی دیر بعد وہ سسکیوں کے درمیان یہی کہہ سکی۔

''بیٹا! بہت دور نہیں ہے شارجہ اور پھر یہاں بھی تو گھر ہے نا ان کا۔ میں ثناء سے کہوں گا، وہ میری مینو کو چند مہینوں بعد یہاں بھیج دیا کرے گا۔ بیٹا سکندر بہت اچھا ہے۔ تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی اور تمہیں خوش دیکھ کر میں کتنا خوش ہوں گا، تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''اب تو نہیں کوئی پریشانی۔'' انہوں نے اس کا سر اونچا کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر سر جھکا لیا۔

''تو چلو پھر اندر بہن اور بھابھی کے ساتھ جا کر کام کرو۔ اٹھو یہاں سے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

''ابا جی! میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ تو وہ ''ٹھیک ہے'' کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''کیوں بیٹیاں اتنی کمزور ہوتی ہیں۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکتیں۔ ابا جی! میرے اندر درد کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس کی لہر لہر میرے دل کو ڈبو رہی ہے اور یہ درد، یہ دکھن مجھے ایک پل چین نہیں لینے دیتی اور میں آپ سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی اور اب تو کچھ بھی نہیں۔'' آپ کی خاطر سب کچھ جھیل جاؤں گی۔ ابا جی! آپ کی خاطر۔'' وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

☆☆☆

محبت میں جنوں خیزی یوں نہیں اچھی
آدمی اپنی ذات کے طلسم میں کھو جاتا ہے
شبنم کے قطرے میں عکس دریا ڈھونڈتا ہے
وہ خود اپنے حق میں کانٹے بو جاتا ہے
سرابوں کے پیچھے بھاگنا ہی دل کی تمنا ہو
تو جاگتی آنکھوں کا مقدر سو جاتا ہے
ضروری نہیں ہر ٹھیس پر چیخ جائے شیشہ دل

پھر کچھ دن اور یونہی سرک گئے۔ موسم میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ سردیاں آ رہی تھیں۔ دسمبر کی بیس تاریخ کو صوفیہ کا نکاح تھا۔ چاچو نے دو تین دن پہلے ہی آنا تھا۔ گھر میں نکاح سے

زیادہ دونوں کی شادیوں کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اور اس سارے ہلے گلے میں سب سے گم صم آمنہ تھی۔ اسے کسی بھی چیز سے، کسی بھی بات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ یا تو کمرے میں چپ چاپ لحاف میں گھسی رہتی۔ اگر نائلہ اور صوفیہ اسے زبردستی باہر لے بھی آتیں تو وہ کسی بات میں دلچسپی نہ لیتی۔ ہوں ہاں میں جواب دیتی۔

صوفیہ نے دوبارہ اس سے اس ''نازک'' موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ کالج بھی کم ہی جاتی تھی۔ کالج میں دسمبر ٹیسٹ ایک دو روز میں شروع ہونے والے تھے۔ اس کی تیاری بھی واجبی سی تھی، کبھی پڑھ لیتی، کبھی یونہی کتاب لے کر بیٹھی رہتی۔

''آمنہ! تم آج کالج نہ جاؤ، مجھے کسی کام سے شہر سے باہر جانا ہے۔'' صبح ناشتے کی ٹیبل پر جب وہ کالج یونیفارم میں تیار ہو کر پہنچی تو بھیا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''اب تو میں تیار ہو چکی ہوں، دوسرے آج مجھے نوٹس لینے تھے۔ صائمہ سے۔'' وہ کرسی کی پشت تھام کر کھڑی ہو گئی۔

''اوہو بھئی، ایک تو آج موسم بھی اچھا خاصا ابر آلود ہو رہا ہے۔ کیا پتا بارش ہی ہو جائے اس لیے کیا پڑھائی ہوگی۔ آج تم چھٹی ہی کر لو۔'' انہوں نے کچھ جھنجلا کر کہا۔ آمنہ نے کچھ بے بسی سے ابا جی کو دیکھا جو اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

''وقار! تم چھوڑ آؤ اسے کالج، واپسی پر میں لے آؤں گا۔'' وہ کچھ دیر بعد بولے۔

''ابا جی! آپ کیسے لے آئیں گے۔ کیا ہو جائے گا اگر آج یہ چھٹی کر لے گی۔ ویسے بھی ایک دو ماہ بعد بھی تو یہ سلسلہ ختم کرنا ہی ہے۔'' وہ کچھ کڑھ کر بولے۔

''پھر! ابا جی نے جیسے آمنہ سے پوچھا۔

''ابا جی! میں واپسی میں صائمہ کے ساتھ آجاؤں گی۔ اس کا گھر اسی روڈ پر آگے جا کر ہے۔'' اس نے فوراً کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے بابا! تم ضرور جاؤ کالج۔ اگر تم ایک دن کالج نہ گئیں تو زمین کی گردش رک جائے گی۔ ویسے اپنی مرضی سے چھٹی کرتی ہے وہ کچھ نہیں۔'' بھیا بڑبڑاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

اور واقعی بھیا کا خدشہ درست نکلا۔ دس بجے کے بعد جو بارش شروع ہوئی وہ پھر رکی ہی نہیں۔ صائمہ اور فائزہ دونوں نے ہی اس روز چھٹی کر لی۔ ''اب گھر کیسے جاؤں گی؟'' بادلوں سے اٹا آسمان دیکھ کر اس نے کچھ پریشانی سے سوچا۔ ''خوامخواہ صبح ضد کی۔ کلاس میں حاضری بھی برائے نام تھی جو ٹیچرز

پیریڈ لینے آئیں انہوں نے بھی کچھ نہ پڑھایا بس باتیں ہوتی رہیں۔

وہ کتنی دیر کاریڈور میں کھڑی بوند بوند برستی بارش کو دیکھتی رہی۔ جب ساڑھے گیارہ بج گئے تو بارش کچھ ہلکی ہو گئی۔ اس نے جلدی سے گاؤن پہنا اور حجاب اوڑھ کر تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھی۔

''اسٹاپ تک جاتے جاتے اللہ کرے بارش بند ہو جائے۔'' اس نے گیٹ سے باہر قدم نکالتے ہوئے دعا کی۔ وہ کالج کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ چار قدم ہی چلی ہوگی کہ بارش پھر تیز ہو گئی۔

''کیا مصیبت ہے؟'' اس نے کچھ جھنجلا کر برستے آسمان کی طرف دیکھا اور قدم تیز کر دیئے۔ سردی بھی بہت ہو گئی تھی۔ بارش کے ساتھ ہوا بھی ہو گئی تھی۔

''اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے تو میری قلفی جم جائے گی۔'' اس نے کپکپاتے ہوئے سوچا۔

اس کے قریب سے ایک گاڑی گزری اس نے گاڑی پر سرسری نظر ڈالی اور تیز تیز چلنے لگی۔ وہ وائٹ شیراڈ تھی اور گاڑی کا نمبر بھی وہی تھا۔ اس کے قدم خوامخواہ ست پڑ گئے۔ عین اسی وقت گاڑی آگے جا کر تھوڑی ریورس ہوئی اور دھیرے دھیرے سے اس کے قریب آ کر رک گئی۔

''آیئے۔ مس! میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔'' اس بت کافر نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے ذرا سا سر باہر نکال کر اس سے کہا تو جیسے اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اس نے انکار کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا تو اس کی آواز کا گلا جیسے گھٹ سا گیا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''آیئے نا پلیز، بارش کافی تیز ہو گئی ہے اور آپ ساری بھیگ چکی ہیں۔ میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔'' اس نے مہذب لہجے میں پھر اسے آفر کی۔ یا تو وہ انکار کر کے آگے بڑھ جاتی مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ وہیں جیسے فریز ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ بھی رکا ہوا تھا۔

''کیا آپ سن نہیں رہیں میری بات۔ پلیز آیئے نا۔'' اس نے تھوڑا جھلا کر کہا۔

''نہیں شکریہ۔'' اس نے بمشکل کہا مگر قدم پھر بھی وہیں گڑے رہے۔ بارش کافی تیز ہو گئی تھی اس کا گاؤن سارے کا سارا بھیگ چکا تھا۔

''پلیز۔ مجھے خوشی ہوگی۔ آیئے نا، بارش بہت تیز ہو گئی ہے۔ آپ جہاں کہیں گی، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔'' کہتے ہوئے اس نے فرنٹ سیٹ کا دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا تو اس نے ایک پل کو اس کی گہری براؤن آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بڑی اپنائیت سے مسکرا رہا تھا۔ وہ سحر زدہ سی چلتی ہوئی گاڑی کے دوسری طرف آئی اور کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گئی۔

"پلیز، دروازہ بند کر دیں۔" اس کی آواز پر اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا تو اس نے
گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ اس نے بھی کچھ نہ کہا۔ The Musk کی تیز خوشبو پوری
گاڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔ باہر کی ٹھنڈ کے مقابلے میں گاڑی میں ماحول بہت پرسکون تھا مگر پھر بھی وہ
ایسے ہی اکڑ کر بیٹھی رہی۔

"پلیز، آپ ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔" اس نے پلٹ کر اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ گاڑی دھیمی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ صرف ونڈ اسکرین پر
تیزی سے حرکت کرتے ہوئے وائپرز میں زندگی محسوس ہو رہی تھی وہ تو جیسے بالکل بے جان ہو گئی تھی۔ وہ
جو اتنے مہینوں سے اس کی دید کی دیوانی ہو رہی تھی آج وہ اس کے پہلو میں بیٹھا تھا اور اس کا اتنا حوصلہ
نہیں ہو رہا تھا کہ پلٹ کر اسے آنکھ بھر کر دیکھ ہی سکے۔ اس سے کچھ کہہ ہی سکے۔ بے تابی کی آنچ اندر ہی
اندر سلگنا شروع ہو گئی تھی۔ جس طرح اچانک ہونے والی بارش خوشی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح
دھیمی دھیمی آنچ دیتی یہ خوشی جیسے اس کے رگ و پے میں رقصاں تھی مگر وہ بظاہر خوشی سے اس رقص سے بے
خبر اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔

کتنی دیر گزر گئی۔ اس نے بھی نہ پوچھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ باہر بارش کافی تیز ہو چکی تھی
اور اندھیرا جیسے بڑھ گیا تھا۔ بارش کے غبار میں آگے سڑک پر بہت دور تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
بادلوں اور دھند کی وجہ سے دن کے بارہ بجے ہی گہری شام کا سماں ہو رہا تھا۔

ایک دم سے جیسے اسے کچھ احساس ہوا۔ اس نے چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ علاقہ اور
رستہ دونوں ہی نامانوس لگے۔

"یہ...... یہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟" وہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"جدھر میں جا رہا تھا۔" اس نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب! آپ مجھے ڈراپ کرنے جا رہے تھے میرے گھر اور یہ...... یہ رستہ گھر کو تو نہیں
جاتا۔" وہ اٹک رہی تھی۔

"تو کیا ہوا۔ کہیں تو جاتا ہوگا۔" وہ لاپروائی سے بولا اور گردن موڑ کر اس کی طرف شوخ
نظروں سے دیکھنے لگا اور جو ایک لمحہ پہلے رستہ بھٹک جانے کے خیال سے ہراساں ہو رہی تھی۔ اس کی
نظروں میں جیسے الجھ کر رہ گئی۔

"کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟" اس نے ذومعنی انداز میں کہا تو اس کی نظریں خود بخود
جھک گئیں۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" اس نے مدھم آواز میں جیسے اس کے بہت قریب ہو کر پوچھا تو وہ
گڑبڑا گئی اور یونہی سرکتے حجاب کو درست کرنے لگی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ حجاب ٹھیک کرتے
کرتے اس کی نظروں کی گرمی سے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ بیٹھی اور وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ آمنہ کا دل
دھک دھک کر رہا تھا اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔ اس کے کانوں کی لوئیں تپنے لگی تھیں۔ وہ
نظریں جھکائے بار بار پلکیں جھپک رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار نہ ہونے کے برابر ہو چکی تھی۔ دونوں ہی شاید
اپنی حواسوں میں نہیں تھے۔ کچھ لمحے اور سرک گئے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو چلی تھی۔ وہ ہتھیلیاں
مسلنے لگی۔ بارش اور ہوا کی سرسراتی آواز ماحول کو اور پراسرار بنا رہی تھی اور اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ اس
کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔

"کدھر جانا ہے آپ کو؟" اس کی بلند اور غیر جذباتی آواز جیسے اسے پٹخ کر زمین پر دے
مارا۔ اس نے کچھ متوحش نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ سامنے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آمنہ کی پیشانی
پسینے سے تر ہو گئی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا، آپ کو کدھر جانا ہے؟" اس نے خشک آواز میں پھر اسے دیکھے
بغیر پوچھا تو اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پتا سمجھاتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے حجاب اوڑھ لیا۔

پھر دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ جیسے ہی اس کے گھر کی روڈ شروع ہوئی اس نے
بیگ سنبھال لیا۔

"بس یہیں روک دیں۔" حالانکہ آگے ایک موڑ اور آنا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا تو اس
نے فوراً بریک لگا دی۔

وہ دھیرے سے دروازہ کھولنے لگی۔

"آپ مجھے اچھے گھرانے کی لگتی ہیں لیکن ضروری نہیں آپ کو لفٹ دینے والا اتنا اچھا ہو۔"
وہ ایک لمحے کو رکا۔

"جب میں نے آپ کو گاڑی میں بٹھایا تو صرف چند لمحوں بعد ہی میرا ارادہ واقعی نیک نہیں
رہا تھا۔ ایسا موسم ہو اور اتنی آسانی سے "دست یابی" بھی ہو جائے تو ولی یا پیغمبر ہی ہوگا جو کفران نعمت
کرے گا اور پھر آپ کے تعاون سے یہ تو صرف ایک لمحے کا کھیل تھا۔" اس کا دل جیسے ساری دیواریں
توڑ کر باہر نکل آنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

"پتا نہیں ہر مرد کی یہ سائیکی ہوتی ہے یا نہیں لیکن مجھے جو چیز آسانی سے مل جائے اور اپنا
آپ بھی پیش کر دے، وہ اٹریکٹ نہیں کرتی۔ میری نظر میں بے وقعت ہو جاتی ہے۔ ساری اٹریکشن

مزاحمت اور دوری میں ہے۔ آپ کی ایک لمحے کی کمزوری نے میری کمزوری کو ختم کر دیا۔ آئندہ کسی سے لفٹ لیں تو خیال رکھیے گا ضروری نہیں اس کی سائیکی بھی میری طرح ہی ہو کہ مفت کی شراب تو قاضی بھی نہیں چھوڑتا۔''

اس کی حد سے گری ہوئی بات پر جیسے اس کی رگوں میں بجلی دوڑ اٹھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور بند کیے بغیر پیچھے دیکھے بغیر تیزی سے چلنے لگی۔ وہ کچھ دور جا چکی تھی جب اس نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تو وہ اندھادھند بھاگنے لگی۔ جب وہ گھر کے کھلے گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو جیسے اس کے پورے وجود میں جان ختم ہو گئی۔ ٹانگیں برآمدے میں پہنچتے ہی بے جان ہو گئیں اور وہ دروازے کے پاس ہی گر پڑی۔

☆☆☆

اور جب اسے ہوش آیا تو آنکھ کھلتے ہی اس کی نظر اپنے پاس بیٹھی صوفیہ اور قریب ہی کرسی پر پریشان چہرہ لیے بیٹھے ابا جی پر پڑی۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھر سے بند کر لیں۔

''آمنہ! آمنہ بیٹا! کیا حال ہے اب؟'' ابا جی کی بے قرار پکار پر اس نے آہستگی سے پھر آنکھیں کھولیں۔ ایک تھکی تھکی سی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے پھر پلکیں موند لیں۔

''مینو جان! کیسی طبیعت ہے اب؟'' صوفیہ نے اس کی تپتی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہنا چاہا مگر آواز ہی نہ نکل سکی، صرف لب کپکپا کر رہ گئے۔ اس نے اکڑے ہوئے وجود کو سمیٹنا چاہا تو سارے جسم میں درد کی لہریں دوڑ گئیں۔

''صوفیہ! میرے خیال ہے تم اس کے لیے گرم دودھ لے آؤ۔'' ابا جی نے صوفیہ سے کہا تو وہ ''جی اچھا!'' کہہ کر اٹھ گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ ابا جی پر دوسری نظر ڈالنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔

''ضروری نہیں ہر مرد کی سائیکی میری طرح ہو ورنہ مفت کی شراب تو قاضی بھی نہیں چھوڑتا۔''

اس کی آنکھوں سے گرم گرم پانی کا ایک قطرہ نکل کر بالوں میں جذب ہو گیا۔

''صرف ایک لمحے کا کھیل تھا سارا۔'' جیسے کسی نے کوڑا لہرا کر اس کے بدن پر مارا ہو۔

''آمنہ! آمنہ بیٹا! مجھے بتاؤ کیا بات ہے، بیٹا! تم ٹھیک ہو نا اب؟'' ابا جی نے کرسی اس کے اور قریب کرتے ہوئے بے چینی سے پوچھا تو اس نے آنکھیں کھولے بغیر سر ہلا دیا۔

''بس بخار ہے اب تو، پورے اٹھارہ گھنٹوں کے بعد ہوش آیا ہے تمہیں۔ تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

''روؤں نہیں مینو بیٹی! اب ٹھیک ہو تم۔ میرے اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔'' وہ اس کا جلتا ہوا ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر بولے۔

''جی تایا جی! اللہ کا شکر ہے، اب تو بخار کافی ہلکا ہو گیا ہے۔ ہے نا، ٹھیک ہو نا اب؟'' صوفیہ دودھ کا گلاس لیے اس کے قریب آ کر بولی، وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا آپی! مجھے سونے دیں۔'' وہ بھگی آنکھیں کھول کر بے بسی سے بولی۔

''پیو گی تو دل چاہے گا۔ ایسے لیٹی رہو گی تو اور کمزوری ہو جائے گی۔ چلو اٹھو شاباش۔'' صوفیہ نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا تو ابا جی کی وجہ سے وہ زیادہ ضد بھی نہ کر سکی اور خاموشی سے اٹھ کر گلاس منہ کو لگا لیا۔

''اچھا صوفی! تم اس کو ذرا ٹھہر کر دوا دے دینا۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔'' ابا جی کھڑے ہو کر بولے اور پھر باہر نکل گئے۔

صوفیہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ ان کی نظروں سے گھبرا کر اس نے آہستگی سے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

''آمنہ نیند آ رہی ہے؟'' صوفیہ نے کچھ دیر بعد پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر سو جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تو اس کی آنکھیں بے تحاشا برسنے لگیں۔

''یا میرے خدا! کیا ہونے چلا تھا۔ میں نے اپنی دیوانگی کے ہاتھوں خود کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک لمحے کا کھیل تھا سارا۔ ہاں ایک ہی لمحے کا کھیل تھا اگر مجھ سے حجاب گرانے والی حرکت سرزد نہ ہوتی تو آج میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ میرے ابا جی۔ اوہ میرے خدا۔'' آنسو اور شدت سے بہنے لگے۔

''اور میں کیا سمجھی تھی اسے کوئی دیوتا، کوئی اوتار، اور وہ کیا نکلا عام سا مرد نظر اور جسم کا بھوکا بس۔ میرے تخیل نے اسے کس درجے پر بٹھا رکھا تھا اور اتنے ماہ کی میری دیوانگی پاگل پن کی اگر اسے خبر ہو جاتی تو......؟

جس لمحے میں نے وہ ارادی حرکت کی، کاش میں شق ہو جاتی اور اس کے باوجود اس نے مجھے

دیکھ کر ریجیکٹ کر دیا۔" وہ بے چینی سے سیدھی ہوگئی۔

"مجھے جو اپنے آپ پر بڑا مان تھا کہ اگر وہ مجھے صرف ایک نظر دیکھ لے تو میرا عشق، میرا جنون اسے میرا دیوانہ بنا دے گا۔ وہ سب کیا ہوا؟ اس نے مجھے دیکھتے ہی دھتکار دیا اور کسی عورت کی نسائیت کی ذلت یہ نہیں ہوتی کہ کوئی اس کو لوٹ کر چلتا بنے۔ اس کی سب سے بڑی انسلٹ تو یہ ہے کہ وہ خود کو پیش کرے اور وہ اسے ٹھوکر کر مار کر چلتا بنے۔ دیکھ کر نظر پھیر لے۔" اس کے بستر پر جیسے انگارے جلنے لگے۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ اسے لگا، کسی نے اس کے چہرے پر گندگی گرادی ہو۔ کسی نے اس پر تھوک دیا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ رگڑ ڈالا۔

"میں نے کیا ایسا کیا، کیوں میں اس قدر گر گئی تھی ایک خواہش کے پیچھے کہ پلٹ کر دیکھنا بھی چاہوں تو خدا کرے میری آنکھ میں بینائی نہ رہے۔ ایسی ذلت ایسی انسلٹ۔" وہ ایک دم سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف ننگے پاؤں بھاگی اور سنک کی ٹونٹی کھول کر یخ پانی کے چھپکے زور زور سے منہ پر مارنے لگی۔

☆☆☆

اس کا بخار ٹوٹتے ٹوٹتے بھی ڈیڑھ ہفتہ لگ گیا۔ دن میں بخار اترتا تو رات میں پھر ہو جاتا۔ ڈیڑھ ہفتے میں ہی اسے اس قدر نقاہت ہوگئی تھی کہ وہ باتھ روم تک بھی جاتی تو قدم لڑکھڑانے لگتے۔ پہلے کچھ نہ پانے کی حسرت نے اس کے لب سی رکھے تھے اور اب جیسے وہ سب کچھ لٹا بیٹھی تھی اور اب اس احساس کم مائیگی نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ وہ گم صم ایک ایک کی شکل دیکھتی رہی۔

"مینو! آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟" صوفیہ عاجز آ کر پوچھتی۔

"کچھ نہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس کے پاس ہر دوسری بات کا یہی جواب ہوتا۔

"پتا نہیں آمنہ کو کیا ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے بخار سب ہی کو ہوتا ہے اور اس سے نقاہت بھی ہوتی ہے لیکن یہ تو جیسے بولنا ہی بھول گئی ہے۔" نائلہ بھابھی بھیا سے کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ ان دونوں کی آوازیں ٹی وی لاؤنج سے آ رہی تھیں۔

"اباجی نے سر چڑھا رکھا ہے اسے۔ اس روز کتنا منع کیا تھا کالج نہ جاؤ مگر اباجی کو تو لاڈلی بیٹی کی ہر فرمائش پوری کرنی ہوتی ہے نا۔ اور اب بھی تو اتنے دنوں سے گھر بیٹھی ہے۔ اس روز میرا کہا مان لیتی تو نہ اتنی تکلیف اٹھانی پڑتی۔" بھیا چیخ کر بولے۔

"مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اس روز یہ کالج سے آئی کیسے۔ جب صوفیہ نے اور میں نے اسے دروازے کے آگے سے اٹھایا تو اس کے کپڑے سارے کے سارے بھیگے ہوئے تھے جیسے کتنی دیر

تک بارش میں چلتی رہی ہو۔ اور جوتے بھی کیچڑ میں اٹے ہوئے تھے۔ پھر وہ صائمہ کا بھی پرسوں فون آیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس دن تو وہ کالج ہی نہیں گئی تھی۔ پھر یہ گھر کس کے ساتھ آئی؟" نائلہ بھابھی کی آواز نے اس کی سوئے ہوئے سے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"اب یہ کون پوچھے اس سے۔ وہ تو لب سی کر بیٹھی ہے۔ کہا بھی تھا میں نے اباجی سے کہ یہ نکاح کا کھڑاگ رہنے دیں اگر ان لوگوں کے ساتھ ہی اس کی رخصتی کر دیں۔ چاچو اور سکندر تو آ ہی رہے تھے۔ انہوں نے تو میری ایک نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے۔" بھیا جل کر بول رہے تھے۔

"خدا جانے کیا معاملہ ہے۔ کتنے ہی دنوں سے اس کی یہ حالت ہے۔ نہ شادی میں دلچسپی، نہ کسی بات میں۔ پہلے پہل تو صاف انکار کر رہی تھی اور اب اس کے بعد سے بالکل گم صم ہوگئی ہے۔"

صوفیہ اسے منع کرتی تھی یوں منہ پھاڑ کر بھابھی کے سامنے اپنی رائے کا اظہار نہ کیا کرو۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی تو اس نے دیکھا، صوفیہ اس کے پیچھے ہی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ شاید اس نے بھی دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔

"میں نہیں جانتی آمنہ کہ اس روز تمہارے ساتھ کیا ہوا لیکن اتنا پتا تو مجھے بھی چل رہا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اچھا نہیں ہوا جس نے تمہیں اس درجہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے لیکن مجھے بتاؤ۔ اب کیا ہو سکتا ہے تم خود سوچو اگر تایا جی کو تمہاری اس حالت کی ذرہ برابر بھی خبر ہو جائے تو ان پر کیا گزرے گی؟"

وہ کرسی کی پشت تھامے یک ٹک صوفیہ کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں دکھ اور شک بیک وقت ہلکورے لے رہے تھے۔

"اب بھیا اور بھابھی کی باتوں سے تمہیں کچھ اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ تم یہ سب کم از کم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہیں۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ تم جو کہو گی میں وہ ضرور کروں گی۔"

وہ پورے خلوص سے اس سے کہہ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک صوفیہ کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بستر کی طرف بڑھ گئی۔

"آپی! آپ صرف میرے لیے دعا کریں۔ مجھے اس وقت صرف دعا کی ضرورت ہے کہ خدا مجھے سکون دے۔ بس کچھ دیر سوؤں گی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" کہتے ہوئے لحاف میں گھس گئی اور صوفیہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

کتنی دیر سے ڈور بیل بج رہی تھی۔ کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی وارڈ روب صاف کر رہی

تھی۔جھنجلا کر باہر نکلی۔ باہر مکمل سناٹا تھا۔اسے یاد آیا کہ بھابھی تو بھیا کے ساتھ بازار گئی ہیں اور صوفیہ گیسٹ روم صاف کرنے گئی ہوئی تھی۔گیسٹ روم گھر کی عمارت سے ذرا ہٹ کر پیچھے کی طرف تھا ادھر ڈور بیل کی آواز نہیں جاتی تھی۔اس نے دوپٹہ سر پر اچھی طرح لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

''آہا! ہماری بیٹی نے دروازہ کھولا ہے۔لو بھئی، ثریا! آتے ہی میرے تو دل کی مراد پوری ہو گئی۔'' چاچو نے آگے بڑھ کر اسے پیار کرتے ہوئے پیچھے کھڑی ثریا چاچی سے کہا۔اس نے سلام کیا تو چاچی نے بھی آگے بڑھ کر اسے پیار کیا۔ان کے پیچھے صالحہ تھی اور سب سے پیچھے سکندر تھا، وہ شاید ٹیکسی والے کو فارغ کر رہا تھا۔

''آیئے چاچی! اندر آجائیں۔'' ان سے گلے مل کر ذرا جھجک کر انہیں رستہ دیتے ہوئے بولی۔

''بھائی جان کہاں ہیں؟'' چاچو نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی نہیں آئے وہ۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا اور انہیں ڈرائینگ روم تک لے آئی۔

''میں آپی کو بلاتی ہوں۔'' ان لوگوں کے بیٹھتے ہی وہ کہہ کر جھپاک سے باہر نکل گئی۔ ''یہ سکندر تو کافی ہینڈسم ہو گیا ہے۔چار سال پہلے جب آیا تھا تو کیسا مریل سا تھا۔'' گیسٹ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سوچا۔

اور پھر شام تک گھر میں جیسے میلے کا سماں ہو گیا تھا۔ابا جی بہت بلند آواز میں بول رہے تھے۔خوشی ان کے لہجے سے پھوٹ رہی تھی اور صالحہ تو مستقل اس کے کمرے میں گھسی بیٹھی تھی۔

''صالحہ! تم لوگوں نے تو دو تین دن پہلے آنا تھا؟'' صوفیہ نے کپڑے دکھاتے ہوئے صالحہ سے پوچھا۔

''آپی! ہم آمنہ کا بڑا زبردست سوٹ لائے ہیں۔نکاح پر پہننے کے لیے اور آنا تو کافی دن پہلے تھا۔یہ ابو اور سکندر بھائی کو ہی وقت نہیں مل رہا تھا۔کبھی کوئی مصروفیت تو کبھی کوئی۔بڑی مشکل سے ایک دن پہلے آئے ہیں۔''

''بھائی جان! میں تو کہتا ہوں اب ساتھ ہی ہمیں بھی فارغ کر دیں۔ہم سب ہی تو آئے ہوئے ہیں۔لگے ہاتھوں کام نپٹ جائے گا۔'' چاچو لاؤنج میں بیٹھے ابا جی سے کہہ رہے تھے۔

''تمہیں بھی فارغ کر دیں گے بس چند ماہ صبر کر لو اب۔دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ارے نائلہ بیٹی! کھانا لگاؤ، بہت ٹائم ہو گیا ہے۔'' انہوں نے چاچو کو جواب دیتے ہوئے کچن کی طرف آواز لگائی۔

''میں پتا کرتا ہوں ابا جی!'' بھیا اٹھ کر کچن کی طرف بڑھے۔

اور آمنہ تو شام سے ہی اپنے کمرے میں مقید ہو گئی تھی۔صوفیہ اور نائلہ ان کی خاطر مدارت میں لگی ہوئی تھیں پھر رات کو بیٹھ کر انہوں نے چاچی اور صالحہ کو نکاح کے فنکشن کے کپڑے دکھائے۔رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔سوتے سوتے سب کو ایک بج گیا۔صبح کے فنکشن کا خیال کرتے ہوئے سب ہی سو گئے۔

☆☆☆

اگلے روز سب جلد اٹھ گئے۔اگرچہ جلدی اٹھنے کو تو کوئی بھی تیار نہ تھا۔رات دیر سے سونے کی وجہ سے اور کچھ موسم بہت ابر آلود ہو رہا تھا۔سردی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔اس لیے کسی کا لحاف سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔مگر ابا جی نے آوازیں دے دے کر سب کو اٹھنے پر مجبور کر دیا وہ اور چاچو تو صبح ہی اٹھ گئے تھے کل سے دونوں بھائیوں کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔سکندر گیسٹ روم میں ہی تھا۔اس کے باوجود آمنہ کو کمرے سے نکلنے سے منع کر دیا تھا نائلہ بھابھی نے۔اور یہ حکم یقیناً ابا جی نے انہیں دیا ہو گا۔وہ اسی بات پر خوش تھی، سب سردی کی وجہ سے اندر باہر ٹھٹھرتے پھر رہے تھے۔وہ آرام سے کمبل میں گھسی ہوئی تھی۔

''بیگم صاحبہ! اتنی ایزی فیل کرنے کی ضرورت نہیں۔اٹھ کر سب کے کپڑے پریس کرو۔گیارہ بج رہے ہیں۔یہ میں بچوں کے اور تمہارے کپڑے رکھ رہی ہوں۔پہلے انہیں پریس کرو پھر دیکھتی ہوں میں۔'' نائلہ کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے کمرے میں آئیں اور اس کے بیڈ پر رکھتے ہوئے بولیں۔

''اچھا پھر چائے کا ایک گرم گرم کپ بنوا کر بھجوائیں پھر اٹھنے کے بارے میں سوچوں گی۔'' اس نے فوراً فرمائش جڑ دی۔

''اچھا بابا! بھجواتی ہوں مگر تم پہلے اٹھ تو جاؤ۔دیر ہو رہی ہے۔میرا سوٹ بھی ابھی ٹیلر نے نہیں بھیجا۔اس کا بھی پتا کروانا ہے۔'' نائلہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

اور پھر شام تک یہی گہما گہمی رہی۔کسی کا سوٹ پریس نہیں ہوا تھا۔کسی کا دوپٹہ نہیں مل رہا تھا۔اس کے تینوں ماموں اپنی فیملی سمیت دو بجے ہی آ گئے تھے۔صوفیہ کی خالہ اور ماموں صبح ہی آ گئے تھے۔گھر میں نہ نہ کرتے بھی اچھا خاصا مہمانوں کا ہجوم ہو گیا تھا اور وہ لوگ بھی وقت کے پابند نکلے۔عین ساڑھے چار بجے آ پہنچے۔سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے فنکشن شام کا ہی رکھا تھا پھر بھی شام کو پانچ بجے یوں لگ رہا تھا جیسے رات ہو۔بادلوں نے آسمان اٹا پڑا تھا۔ابھی تو شکر تھا کہ کھانا ہوٹل سے ریڈی میڈ منگوا لیا تھا ابا جی نے۔بس سب کو ان ہی تیاریوں کی فکر تھی۔

وہ سوا چار بجے ہی تیار ہو کر صوفیہ کے پاس آ گئی۔ وہ نائلہ کے کمرے میں تھی۔ صوفیہ کو اس کی دوست ثمن نے تیار کیا تھا۔ ڈارک پربل ویلوٹ کے سوٹ پر کشمیری اسٹائل میں دبکے کا کام تھا۔ اتنے ڈارک کلر میں صوفیہ کی سرخ و سفید رنگت کھلی پڑی تھی۔ صوفیہ پر بڑا روپ آیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر صوفیہ کو گلے لگا لیا۔

''آپی! اللہ نظر بد سے بچائے۔ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔'' اس نے محبت بھری نظروں سے صوفیہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔

''کاش ابتسام بھائی دیکھ لیں تو ابھی لے اڑیں۔'' ثمن نے آنکھوں کے شیڈ کو آخری ٹچ دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''بھئی ثمن! جلدی کرو۔ وہ ابا جی اور چاچو آ رہے ہیں ادھر ہی، قاضی صاحب کو لے کر۔ صوفیہ کو چادر اچھی طرح اوڑھا دو۔'' نائلہ اندر آتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''ابھی تو وہ لوگ آئے ہیں۔ آتے ہی نکاح کی فکر پڑ گئی انہیں۔ سانس تو لے لیں وہ۔'' آمنہ منہ بنا کر بولی۔

''اچھا تم تو باہر نکلو یا ادھر دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ سکندر بھی ساتھ ہے۔'' نائلہ نے اسے ڈریسنگ روم کی طرف دھکیلا۔ دروازے کے باہر قدموں کی آواز سن کر وہ منہ بناتے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

اور جب صوفیہ نے کانپتے ہاتھوں سے سائن کیے تو دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر دیکھتی ہوئی آمنہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے لگا جیسے صوفیہ اور اس کے بیچ دوریوں کی ان دیکھی دیوار سی ایک پل میں استوار ہو گئی ہے۔ پھر سب لوگ سائن کروا کے باہر چلے گئے۔ وہ یونہی اندر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ باہر کمرے میں شور بڑھ گیا تھا پھر شاید اس کی پکار پڑی۔ بھابھی اسے پکارتی ہوئی اندر آئیں تو اس نے جلدی سے آنکھیں صاف کر لیں۔

''بھئی وہ صوفیہ کی ساس اور نند تمہیں بلا رہی ہیں۔ سیما سے تو تم ملیں نہیں۔'' نائلہ اندر آ کر بولی۔ وہ ''اچھا'' کہہ کر اس کے پیچھے چل پڑی۔

کمرے میں سب صوفیہ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔

''لیجئے آنٹی! آمنہ آ گئی اور سیما تم تو ملیں نہیں نا آمنہ سے؟'' نائلہ نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا تو اس نے آگے بڑھ کر صوفیہ کی ساس کو سلام کیا تو انہوں نے اٹھ کر اسے پیار کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ساتھ ہی بیٹھی ہوئی سیما بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف

ہاتھ بڑھایا جسے اس نے خوش دلی سے تھام لیا۔

''میں دو بار آئی۔ تم سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ تم کالج گئی ہوئی تھیں۔ میں بھی اس کالج میں پڑھتی ہوں پھر بھی ہماری ملاقات نہیں ہو سکی۔ اور اب تو میں بہت دنوں سے نہیں جا رہی۔'' وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑے بولتی گئی۔

''ہاں، بس اتفاق ہی ایسا ہوا۔'' وہ یہی کہہ سکی۔

''بہر حال خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ امی اگر ہمارا ایک بھائی اور ہوتا تو ہم آمنہ کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''اے خبردار سیما جی! آپ نے ہمارے مال پر نیت خراب کی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' صالحہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو سب ہنس پڑے۔

''بھئی آمنہ! ویسے بھی ہماری بیٹی ہے۔'' صوفیہ کی ساس نے ایک بار پھر اسے پیار کرتے ہوئے کہا تو اسے بہت خوشی ہوئی۔

''چلیں بھئی۔ کھانے کی طرف ہال کمرے میں جینٹس فارغ ہو چکے ہیں اب آپ لوگوں کی باری ہے۔'' نائلہ اندر آتے ہوئے بولیں تو کمرے میں بیٹھی خواتین آہستہ آہستہ اٹھ کر جانے لگیں۔

''چلیں آنٹی! آپ بھی اور سیما! تم بھی۔'' نائلہ نے ان دونوں سے کہا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو صالحہ تم بھی۔'' نائلہ نے آرام سے بیٹھی صالحہ سے کہا۔

''نہیں بھابھی! میں بعد میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی کھاؤں گی۔ آپ جائیں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' نائلہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ تو وہ دونوں صوفیہ کے پاس آ بیٹھیں۔

اس وقت صوفیہ کی دو کزنز اندر آئیں۔

''آمنہ! صالحہ! چلو آؤ دولہا دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ فارغ ہو کر اب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ باہر والی کھڑکی میں نے آفتاب بھائی سے کہہ کر کھلوائی ہے۔'' ردا نے اندر آ کر انہیں جیسے اطلاع دی۔

''اچھا واقعی۔ چلو آمنہ ہم بھی دیکھتے ہیں۔'' صالحہ خوشی سے کھڑی ہو گئی۔

''صوفیہ آپی آپ بھی چلیں۔'' نازیہ شرارت سے بولی۔

''ہاں ان کو بھی لے کر جائیں گے پہلے ہم تو دیکھ لیں۔'' صالحہ جلدی سے بولی اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔

وہ پچھلے دروازے سے ڈرائنگ روم کی بیرونی کھڑکی کی طرف بڑھیں۔ نازیہ ان کو گائیڈ کر رہی تھی۔ کھڑکی کے نیچے انہوں نے کچن سے چھوٹا اسٹول لا کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے پہلے خود اندر جھانک کر دیکھا۔

''چلو دو دو کر کے آؤ۔ وہ ڈارک براؤن کلر کے سوٹ میں سامنے ہی بیٹھے ہیں۔ پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا ہے اور پلیز آواز نہ نکالنا پٹائی ہو جائے گی۔'' وہ نیچے اترتے ہوئے انہیں ہدایات دیتے ہوئے بولی تو آمنہ اور صالحہ اکٹھی آہستگی سے اسٹول پر چڑھیں۔ ان کے پیچھے ردا بھی لٹک گئی۔

''واؤ یہ تو اپالو ہے یار!'' ردا کی پیچھے سے آہستہ سی سرگوشی بھی خاصی بلند تھی۔ نازیہ نے اسے چٹکی کاٹی تو اس نے پلٹ کر اس کا ہاتھ پرے جھٹکا۔ ''کیا ہے تمہیں بلیوں کی طرح نوچ رہی ہو؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''واقعی بھئی، ردا نے صحیح نام دیا ہے۔ یہ تو واقعی اپالو ہے۔ صوفیہ آپی تو بڑی لکی نکلیں۔ اس کو کہتے ہیں دیر آید درست آید۔''

صالحہ نے بھی آہستہ سے اس کے کان میں کہا اور آمنہ کی تو جیسے نظریں ہی پتھرا گئیں۔ سامنے وہی تو بیٹھا تھا جس نے گزشتہ ساڑھے تین ماہ اسے پاگل کیے رکھا تھا اور اس دیوانے خواب کا فسوں ابھی چند روز پہلے ٹوٹا تھا کہ اب وہ پھر سے ایک نئے روپ، ایک نئے رشتے کی صورت میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آپی کی قسمت پر رشک کرے یا روئے۔ مگر یہ اسے واضح طور پر لگ رہا تھا کہ جو بھی ہوا تھا اچھا نہیں ہوا تھا۔ بالکل بھی نہیں۔ کہر آلود آسمان تلے کھڑے اس کی آنکھوں میں دھند جمع ہونے لگی۔

''چلو آؤ، صوفیہ آپی کو بھی لے آتے ہیں۔ ابھی یہ لوگ بیٹھے ہیں۔'' صالحہ نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی مگر وہ اسی طرح بے حس کھڑی رہی۔

''چلو نا، کوئی دیکھ لے گا۔ خوامخواہ شامت آ جائے گی۔ وہ دونوں تو اندر بھی چلی گئی ہیں۔''

صالحہ نے پیچھے سے اسے کھینچا تو وہ نیچے اتر کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

پھر نازیہ اور صالحہ زبردستی صوفیہ کو لے کر آ گئیں۔ آمنہ نے انکار کر دیا وہ ان کے جاتے ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے یہی سوچتی رہی۔

☆☆☆

اور رات جب ان لوگوں کے جانے کے بعد فیملی کے سارے مہمان ایک ایک کر کے چلے گئے تو وہ سب ان دونوں کے کمرے میں جمع ہو گئیں۔ صوفیہ نے بھی کپڑے تبدیل کر کے نائلہ کا کچن میں

ہاتھ بٹایا۔ دونوں نے آدھے گھنٹے میں کچن سمیٹا اور فارغ ہو کر اندر ہی آ بیٹھیں۔ صالحہ ابھی اٹھ کر باہر گئی تھی ابا جی! چاچو وغیرہ کے لیے چائے بنانے۔ نائلہ کے اصرار پر وہ بمشکل چائے بنانے پر راضی ہوئی تھی۔ چاچی بھی اٹھ کر لاؤنج میں ان لوگوں کے پاس جا بیٹھیں جہاں آج کے فنکشن کے بارے میں تبصرے ہو رہے تھے۔

وہ کپڑے بدل کر ایسے ہی بیٹھی تھی۔

''آمنہ! توبہ ہے تم سے اتنا نہیں ہوا کہ اٹھ کر کمرے میں یہ بکھری چیزیں ہی سمیٹ لو۔''

صوفیہ نے اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر کہا تو اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

''بھئی، آمنہ تو لگتا ہے، آج بہت اداس ہے۔'' نائلہ نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں بھی اس کے پاس ہی بیڈ پر آ بیٹھیں۔

''میں نے صالحہ سے کہا ہے ہمارے لیے بھی چائے لانا۔ باہر تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی ہے۔ توبہ ہے بہت ہی سردی ہے آج تو۔'' نائلہ نے کمبل میں بیٹھتے ہوئے کپکپا کر کہا۔ ''پاؤں ہی گرم نہیں ہو رہے۔''

''عنم اور طوبیٰ سو گئیں؟'' صوفیہ نے نائلہ کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سلا آئی ہوں انہیں۔ ایسے ہی سردی میں پھر رہی تھیں۔ بھئی مینو گڑیا! کیا بات ہے ابھی تو صرف نکاح ہوا ہے، صوفیہ گئی تو نہیں۔'' نائلہ نے پھر اسے چھیڑا۔

''اور ہاں تمہارے لیے ایک بڑی اچھی خبر ہے بلکہ دو خبریں ہیں۔'' نائلہ نے کہا تو وہ واقعی متوجہ ہو گئی۔

''میں نے رات کو ابا جی سے بات کی تھی۔ وہ مان گئے کہ آمنہ جوتا چھپائی کی رسمیں وغیرہ سب کرے کیونکہ صوفیہ کی رخصتی ایک ہفتہ پہلے ہو گی تم سے اور ڈھولک بھی رکھ لینا مگر ایک دن پہلے۔''

نائلہ نے جوش سے اسے بتایا تو اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''نہیں، اس میں خوش ہونے والی کون سی بات ہے۔ ابا جی ٹھیک کہتے تھے، اس لیے میں نے سوچا ہے کہ نہ تو میں ڈھولک رکھوں گی اور نہ یہ دودھ پلائی وغیرہ کی رسمیں کروں گی، بھابھی! یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہیں اور یہ دودھ پلائی کی رسم تو انتہائی واہیات ہے، معلوم ہے اس رسم کے دوران کتنی کتنی بدمزگیاں ہو جاتی ہیں۔'' صوفیہ اور نائلہ حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ ''ویسے بھی نامحرموں سے پردے کا حکم یونہی نہیں دیا گیا۔ اور یہ رشتہ بھی تو اسی کیٹیگری میں آتا ہے۔ ہے نا آپی! اس نے

حیران حیران سے صوفیہ کو مخاطب کیا۔

''ہوں! صوفیہ بھی کہہ سکی۔

''کمال ہو گیا بھئی۔ آمنہ کے خیالات میں اتنی تبدیلی۔'' نائلہ حیرت سے بولیں۔ ''کہاں تم نے شور مچایا ہوا تھا۔''

''جب اللہ ہدایت دے دے۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''اور دوسری خبر یہ ہے کہ چاچی اور چاچو یہیں رہیں گے۔ تم سال میں دو چار ماہ یہیں رہ لیا کرنا ان کے پاس۔ یہ خبر تو اچھی ہے نا؟'' نائلہ نے کہا۔

''نہیں بھابھی! میرا تو دل بھر گیا ہے پاکستان میں رہ رہ کر۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''اتنے عرصے میں یہاں ہوں اور بعد میں بھی یہیں رہوں۔ نہ بابا! میں تو شارجہ میں ہی جاؤں گی۔ چاچو، چاچی بھلے یہاں رہیں۔ میں تو اکتا گئی ہوں یہاں سے۔ ایک طرح کا ڈل سا ماحول وہاں جا کر کچھ آزادی ملے گی۔ اس لیے آپ بے شک میری طرف سے یہ بات ابا جی سے اور چاچو سے کہہ دیجئے گا۔'' یہ بات بھی دونوں کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہ تھی۔

''آمنہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کہاں تم سے اتنا طوفان اٹھایا ہوا تھا یہاں رہنے کے لیے، پڑھنے کے لیے اور اب......'' صوفیہ کچھ پریشانی سے بولی۔

''آپی! پڑھ تو میں وہاں بھی لوں گی۔ بس اب میں یہاں بالکل نہیں رہوں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔

وہ کھڑکی کھول کر کھڑی ہو گئی۔ باہر بوند بوند بارش ٹپک رہی تھی رات گہری ہونے کے باوجود آسمان کا رنگ بادلوں کی وجہ سے مٹیالا سا ہو رہا تھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے بھابھی! آمنہ نے تو میرے دل کی بات کی ہے۔ اب میں ابو اور امی کو بھی منا لوں گی کہ وہ یہاں والا گھر بیچ دیں میں اور سکندر بھائی تو بالکل یہاں نہیں رہنا چاہتے۔ ہمیں پاکستان پسند تو ہے مگر کبھی کبھار آنے کے لیے۔ ویسے ہم دونوں وہاں بہت خوش ہیں۔ بس آمنہ کی بات کی تھی تایا جی نے کہ یہ یہاں رہنا چاہتی ہے تو اس لیے امی اور ابو نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا اب یہ کہہ رہی ہے تو وہ بھی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ وہاں بڑا مزا آئے گا۔''

صالحہ جو چائے کی ٹرے لیے اندر آ رہی تھی اس نے شاید ان کی آخری باتیں سن لی تھیں، فوراً خوش ہو کر بولی۔

''ویسے حیرت ہے آمنہ کے خیالات پر۔ بھئی، اتنی جلدی تو موسم نہیں بدلتے جتنی جلدی اس کے خیالات بدلے ہیں۔'' نائلہ ابھی بھی حیرت زدہ تھیں۔

''بالکل بھابھی! یہ انسان ہی تو ہیں جو موسم سے بھی زیادہ جلدی بدلتے ہیں۔ موسم کا تو پتا ہے کہ گرمی کے بعد سردی ہی آتی ہے یا خزاں کے بعد بہار مگر جب انسان بدلتا ہے، اندر سے تو اسے خود پتا نہیں چلتا کہ اس کے خیالات میں آنے والی تبدیلی اسے کتنا بدل ڈالے گی۔''

وہ کھڑکی میں جھکے جھکے بولی تو اسے خود پتا نہیں چلا تھا کہ اس کے اندر اتنی اچانک تبدیلی کیسے آ گئی تھی، لیکن یہ تبدیلی اسے اچھی لگی تھی کہ یہاں سے دور جا کر اسے اور کچھ نہیں کم از کم سکون تو ملے گا جو گزشتہ کئی مہینوں سے اس سے بچھڑ گیا تھا۔

اگر پہلے سب سے بچھڑ جانے کا خیال اسے بے حد بے چین کر دیتا تھا اور پھر صوفیہ سے جدائی، لیکن اب یہ جدائی بے حد ضروری تھی دونوں کے لیے۔ اور ابھی تو اسے خود بھی بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جنوں کے اس یک طرفہ کھیل میں اس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔

لیکن تلافی کی صورت تو ہے نا۔ آپی ٹھیک کہتی تھیں کہ انسانوں کی محبت دلوں کو بے قرار کرتی ہے۔ بے چینی اور بے سکونی دیتی ہے اور خدا کی محبت دلوں کو پر سکون کرتی ہے۔ قرار دیتی ہے۔ اور جو دوسری محبت کو دل میں بسا کر پہلی محبت کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہی قرار پاتا ہے۔ اور اسے اب یہی راستہ اپنانا تھا۔

باہر بارش تیز ہو گئی تھی۔ اس نے ایک آخری نظر تاریکی میں گرتی بوندوں پر ڈالی اور کھڑکی بند کر دی حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، تاریکی اور اندھیرے کے خوابوں سے بہرحال ہزار درجے بہتر ہوتی ہے اور اب اسے خود کو مزید ان سراب اندھیروں کے حوالے نہیں کرنا تھا۔

وہ ان کے پاس بیڈ پر جا بیٹھی اور چائے کا کپ اٹھا کر اطمینان سے پینے لگی۔

☆☆☆

وہ خار تھے کہ گلاب

Cliff Hanger (کلف ہینگر) کا لاسٹ شو دیکھ کر میں اور اسد جونہی پلازا سینما سے باہر نکلے بجلی کا کوندا سا لپکا اور ساتھ ہی بادل گرجنے کی آواز سنائی دی ہم دونوں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان سیاہ بادلوں کی لپیٹ میں تھا اور بارش برسنے کے لیے بالکل تیار فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور ہوا بند تھی اور جیسے ہی ہم سینما کے احاطے سے باہر آئے بوندوں نے ٹپاٹپ برسنا شروع کر دیا۔ میں نے جلدی سے جیکٹ کے کالر کھڑے کیے اور سرد ہوتے ہاتھوں کو پینٹ کی جیبوں میں گھسا لیا۔ اسد اسٹینڈ سے موٹر سائیکل لینے چلا گیا۔ موسم کے تیور دیکھ کر رش اکا دکا گھروں کو بھاگ نکلا۔ گاڑیاں موٹر سائیکلیں زوں زوں کرتی اندھیرے میں گم ہونے لگیں ورنہ اس شو کے دیکھنے والے ہمیشہ جلدی کے احساس سے عاری ہوتے ہیں فلم پر بھرپور تبصرے دہیں کھڑے کھڑے کیے جاتے ہیں سگرٹوں کے کش لیے جاتے ہیں اور پھر ٹہل ٹہل کر رستہ طے ہونے لگتا ہے لیکن آج ایک تو شام سے سردی بہت زیادہ تھی کچھ اس لیے بھی رش کم تھا دوسرے بارش شروع ہو گئی۔

''یار مجھے تو لگتا ہے ٹینکی میں پٹرول بھی پورا پورا ہے۔'' اسد موٹر بائیک کو گھسیٹتے ہوئے میرے پاس آ کر بولا۔ اس کے منہ سے دھوئیں کا ایک مرغولا سا نکلا۔

''یار کوئی خیر کی خبر سناؤ۔ اتنی سردی میں تو پیدل چل کر ہماری قلفی جم جائے گی۔'' میں نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

''چلو دیکھتے ہیں بیٹھو تو سہی۔ بارش تیز ہو رہی ہے۔'' اس نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا ''یہ بارش کو بھی آج ہی نازل ہونا تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اتنے دنوں سے تو لوگ مچل مچل کر دعائیں کر رہے تھے کہ دسمبر بھی خشک نکلا جا رہا ہے دھند اور پالے نے ساری فصلیں تباہ کر دی ہیں ان دعاؤں کا کچھ تو نتیجہ نکلنا تھا۔ اچھا ہے ہو گئی بارش۔'' میں

نے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اور یہ تو اور بھی بہت اچھا ہوگا جب آدھے راستے میں جا کر پٹرول ختم ہو جائے گا پھر تم بارش کی افادیت اور ضرورت پر مزید روشنی ڈالنا میں بغور رحمت خداوندی کے فوائد سنوں گا۔'' اسد منہ بنا کر بولا۔

''تم چلو تو سہی اللہ مالک ہے۔ یار بڑی سردی ہے۔'' میرے منہ سے سسکی سی نکلی۔ موٹر سائیکل چلنے سے ہوا جیسے ہمارے وجود کے آر پار جانے لگی اوپر سے بارش بھی کچھ تیز ہوگئی تھی۔

''ایسی ویسی ذرا آگے آ کر بیٹھو تو لگ پتا جائے۔ مجھے لگتا ہے میرا منہ فریز ہوگیا ہے۔'' اسد نے موڑ مڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو ابھی گھر جا کر بھی فریز ہونا ہے تم تو فوراً جا کر اپنے بستر میں گھس جاؤ گی اور میں تو...... آہ۔'' میرے منہ میں ٹھنڈی آہ نکلی۔

''کیوں تم نے کیا گائے بھینسوں کو نہلانا ہے جا کر جو یوں آہیں بھر رہے ہو۔'' اسد نے مذاق کیا۔

''کاش یہی کرنا ہوتا تمہیں نہیں پتا ابوجی۔'' میرا جملہ ابھی منہ ہی میں تھا کہ موٹر سائیکل ایک کریہہ چیخ مار کر خاموش ہوگئی اور اس کی اسپیڈ آہستہ آہستہ رینگنے سے بھی بدتر ہوگئی۔

''یہ کیا مذاق ہے جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔'' مجھے اس وقت اس کا مذاق ذرا نہ بھایا۔ میں نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

''یہ میری جان مذاق نہیں ہے پٹرول ختم ہوگیا ہے اور اب بائیک کی لاش کو گھسیٹ کر لے جانا پڑے گا اب باران رحمت کا جی بھر کر شکر ادا کرو۔'' اسد نیچے اترتے ہوئے بولا۔

''کیا نہیں پلیز یہ تو نہ کہو۔'' میں امید بھری نظروں سے اسے بیٹھے بیٹھے دیکھ کر بولا۔

''کیا نہیں کہوں۔ جناب پٹرول ختم ہو چکا ہے اب آپ نیچے تشریف لے آئیں اور خراماں خراماں اس سہانے موسم میں چلتے ہیں۔'' وہ سیٹ پر ہاتھ مار کر بولا۔

''اوہ میرے خدایا یہ سانحہ بھی ابھی رونما ہونا تھا۔'' میں نیچے اتر آیا۔

''اب۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ بارش سے ہمارے کپڑے تقریباً بھیگ چکے تھے۔

''اب پیدل مارچ۔'' اسد نے موٹر سائیکل گھسیٹا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ میں ادھر گلیوں میں سے ہوتا ہوا شارٹ کٹ مارتا ہوں دس پندرہ منٹ

میں پہنچ ہی جاؤں گا۔'' میں نے نیچے جھک کر پینٹ کے پائنچے فولڈ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا! بے مروت انسان تو کیا اس منحوس کے جنازے کو میں اکیلا لے کر جاؤں۔'' اس نے چیخ کر بائیک کی طرف اشارہ کیا۔

''آف کورس۔ میں اس وقت کوئی ہمدردی افورڈ نہیں کر سکتا۔ ادے میں اب چلتا ہوں جیتے رہے تو کل ملیں گے گڈ نائٹ۔'' میں ہاتھ ہلاتا ہوا تیزی سے دائیں طرف کی نزدیکی گلی میں گھس گیا۔

''عمر ذلیل آدمی اللہ کرے تیرے ابوجی آج تجھے لان میں مرغا بنا دیں ساری زندگی کے لیے اور کل تو کیا میں ساری زندگی اب تیرا یہ منحوس چوکھٹا نہیں دیکھوں گا۔ آنا تم کل نہ میں نے تمہیں ذلیل کیا تو پھر کہنا......'' وہ پیچھے سے چیخ رہا تھا۔

میں نے اس کی فریاد پر قطعاً کان نہ دھرا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا رستہ طے کرنا لگا۔ ''یا اللہ ابوجی سو گئے ہوں'' میں نے سب سے غیر مقبول، دعا مانگی جس کے نہ قبول ہونے کا مجھے شک ہی نہیں یقین بھی تھا کیونکہ کراماً کاتبین کو تو نیند آسکتی ہے مگر میرے اعمال نامے کو جانچے بغیر ابوجی کو نیند نہیں آسکتی۔

میری اور بارش کی اسپیڈ میں مقابلہ تیزی سے جاری تھا اور جب میں گھر کے گیٹ کے پاس پہنچا میرے کپڑے مکمل طور پر بھیگ چکے تھے اور میرے دانت مارے سردی کے کٹ کٹ بج رہے تھے گیٹ کی مین لائٹس روشن تھیں میں نے گیٹ کی درز سے اندر جھانکا پورچ سے آگے برآمدے میں کوئی نہیں تھا میں نے شکر کا کلمہ پڑھا لیکن ابھی میرا سکھ بھرا سانس باہر بھی نہیں آیا تھا کہ ابوجی میرے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آگئے۔

انہوں نے بایاں ہاتھ اونچا کر کے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا اور پھر دوسرے ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو اپنی بائیں ٹانگ پر عادتاً مارا۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا وہ میری خاطر تواضع کے لیے پوری طرح سے الرٹ تھے۔ وہ آہستہ آہستہ برآمدے میں ٹہلنے لگے اور میری نظریں ان کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر منڈلانے لگیں کہ کب وہ تھک کر اندر جاتے ہیں اور کب میں گیٹ پھاند کر اندر جاتا ہوں لیکن میری یہ حسرت آدھ گھنٹے تک پوری نہ ہو سکی وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہے تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ میں گیٹ پھاند کر جاتا بھی کہاں، ان کی چہل قدمی تو میرے کمرے کے آگے ہی ہو رہی تھی۔ بارش اسی رفتار سے جاری تھی اور میرا پورا وجود سردی سے کانپ رہا تھا دل میں اپنے اوپر سو بار لعنت بھیجی کہ میں کیوں گیا تھا یہ لاسٹ شو دیکھنے۔ شاید میں کھڑے کھڑے وہیں فریز ہو جاتا اگر آدھے گھنٹے بعد ابوجی ٹہلتے ہوئے گیٹ کی طرف نہ آنکلتے۔ اب یقیناً وہ گیٹ کا لاک چیک

کرنے آ رہے تھے میں ذرا سا دیوار کے ساتھ ہو کر کھڑا ہو گیا انہوں نے واقعی برستی بارش کی پروا کیے بغیر مین گیٹ کا لاک چیک کیا پھر کچھ خیال آنے پر انہوں نے چھوٹا دروازہ کھول دیا اور باہر کی طرف جھانکنے لگے میرے پاس بھاگنے کا بھی کوئی موقع نہیں تھا بس پتھر کے بت کی طرح کھڑے کا کھڑا رہ گیا وہ کچھ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتے رہے اور میں بارش کے ساتھ مارے شرم کے سر جھکائے قطرہ قطرہ بہنے لگا۔

''اندر دفع ہو۔'' انہوں نے ملامتی کڑک دار آواز میں کہا اور اندر کی طرف چل پڑے میں سر جھکائے کسی حوالاتی کی طرح ان کے پیچھے چل پڑا۔ مجھے پتا تھا باقی کلاس اندر جا کر ہو گی لیکن انہوں نے کمرے کی نوبت آنے ہی نہ دی اور برآمدے میں ہی مارچ پاسٹ روک کر کھڑے ہو گئے میں بھیگے مرغے کی طرح ان کے سامنے گردن نیچی کیے کھڑا ہو گیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو اس وقت۔'' انہوں نے چھڑی اپنی دائیں ران پر زور سے ماری۔

''وہ وہ اسد کو نمونیہ نہیں۔'' میرا حلق تر موسم میں بھی خشک ہوا جا رہا تھا میں نے لبوں پر زبان پھری ''اسد کو ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔'' بات بھی صحیح تھی اب تک اس غریب کو کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پیش آ گیا ہو گا۔

''اور تم اس کی رپٹ کرانے گئے تھے تھانے۔ ہے نا۔'' وہ گرجے۔

''نہیں وہ ہسپتال۔'' میں نے تھوک نگلا۔

''وہ ہسپتال میں تھا اور تم گورکن کا پتا کرنے گئے تھے'' اتنی ٹھنڈ میں بھی ان کا لہجہ چنگاریاں اڑا رہا تھا۔

''جی ہاں، جی نہیں۔'' میں نے بے بسی سے انہیں دیکھا ان کی تفتیش نے سردی کا احساس بھی ختم کر دیا تھا۔

''صحیح طرح سے بکواس کرو کونسی فلم دیکھ کر آ رہے ہو۔'' ان کی ساری زندگی بڑے بڑے مجرموں سے سچ اگلواتے گزری تھی میں تو پھر ان کے ہاتھوں پلا ان کا بیٹا تھا۔ ان سے سچ کو کتنی دیر چھپاتا۔ اب نہ بتاتا تو تھوڑی سی جرح کے بعد بتانا ہی پڑتا۔

''کلف ہینگر۔'' میرا سر مزید جھک گیا۔

''شرم کرو ڈوب مرو اس بارش کے پانی میں یہ بارش بھی تمہارے کرتوتوں کے آگے پانی پانی ہو جائے گی۔ اتنے ہٹے کٹے جوان ہو۔ حرام خوری ہڈیوں میں رچ بس گئی ہے۔ ابھی تو باپ کی کمائی پر تین ٹائم کھانے کو مل جاتا ہے کل کو میں نہ رہا تو سڑکوں پر بھیگ مانگتے نظر آتے ہیں تم جیسے ہڈحرام، کھا کھا

کر ساری چربی دماغ کو چڑھ گئی ہے کچھ نہیں سوجھتا تمہیں۔''

وہ سونے والوں کی نیند کا لحاظ کیے بغیر تیز تیز چلتے ہوئے بلند آواز میں بول رہے تھے۔

''نوکری ہے تو وہ کوئی نواب صاحب کی ناک کے نیچے نہیں آتی کتنی مشکلوں سے اے ایس آئی کا انٹرویو کلیئر کرایا تھا لاٹ صاحب لات مار کر چلے آئے اب کوئی منسٹری پلیٹ میں سجا کر تمہیں پیش کرے گا۔ دوست تو وہ زمانے بھر کے اوباش اور آوارہ۔ چن کر سارے شہر کے نکمے اور لوفر اکٹھے کر رکھے ہیں باپوں کا کھاتے ہیں اور ان کے سینوں پر مونگ دلتے ہیں۔

اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا میں بھی ایس پی ریٹائرڈ ہوا ہوں جا کر میرا ریکارڈ کھنگالو کہیں جو ذرا کوئی پیشہ ورانہ بددیانتی کی ہو ہمیشہ حق حلال کمایا اور تمہیں ٹھونسایا سوچتا ہوں کہاں مجھ سے بھول ہوئی جو تم جیسا ناخلف میرے گھر میں پیدا ہو گیا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکے۔

''کہیں تو ہوئی ہو گی اب پارسا بن رہے ہیں۔'' میں نے منہ میں بڑبڑایا۔

''جو بکواس کرنی ہے اونچی آواز میں کرو۔ منہ میں بڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس عمر میں بھی ان کی قوت سماعت بلا کی تیز تھی ''اور میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں جو آدھی آدھی رات تک پہرے دوں آج تو میں نے دروازہ کھول دیا ہے آئندہ اگر اتنی دیر سے آئے تو ادھر کا منہ نہ کرنا شہر میں بہتیرے فٹ پاتھ رات کو خالی ہوتے ہیں اور دکانوں کے تھڑے بھی۔ سن لیا۔'' ہمیشہ کی طرح ان کی تان اسی دھمکی پر آن کر ٹوٹی جس کو وہ کبھی عملی جامہ نہیں پہنا سکے تھے۔

''ابو جی سردی لگ رہی ہے۔'' میں نے آواز میں زمانے بھر کی یتیمی سمو کر کہا جیسے ان کی پتا تڑپ ہی تو اٹھے گی۔

''جب آدھی رات تک فلمیں دیکھتے ہو سارے شہر کی سڑکیں ناپتے ہو زمانے بھر کی آوارگیاں کرتے ہو اس وقت سردی نہیں لگتی فضول گپیں ہانکتے سردی نہیں لگتی واہ ایس پی حیات احمد کا سپوت اور آوارہ گردیوں کا یہ حال کوئی شہر بھر میں کوتوال نہیں رہا تم جیسوں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے۔ اپنی سردی کا اتنا خیال ہے اور جو بوڑھا باپ شام سے یہاں چوکیداری کر رہا ہے اس کی سردی کا کچھ خیال نہیں۔

ارے تم جیسی بے حس اولاد سے تو میں بے اولاد ہی ہوتا تو بھلا تھا۔ میری تو اللہ سے دن رات دعا ہے کہ وہ آخری وقت میں مجھے تم لوگوں کے پانی کے ایک چمچ کا بھی محتاج نہ کرے تم تو وہ بھی نہ پلاؤ گے۔ تمہیں تو آوارہ گردی لے بیٹھی دو سالوں سے مارے مارے پھر رہے ہو شہر بھر میں کوئی تمہیں نوکری نہیں دیتا۔ ان دونوں کی عقلیں ان کی بیویوں نے مار دیں۔ بڑے بڑے بیویوں کے

پیارے دیکھے پر ان دنوں سے کم، پچھتائیں گے اک دن دونوں اور تو جو یہ وقت کو یوں گنوار ہا ہے نا تو یاد کرے گا ایک دن باپ کی نصیحتوں کو......"

"ابو جی پلیز میں چینج کرلوں۔" اس سے پہلے کہ ان کا خوداذیتی کا لیکچر دراز ہوتا میں نے التجا کی۔

"ہاں اب باپ کی باتیں کہاں اچھی لگیں گی۔ معلوم ہے کیا وقت ہو رہا ہے۔"

"جی اب میں جاؤں۔" میں نے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کیچڑ میں لت پت جوتے باہر اتار کر جاؤ اونٹ جتنا قدم اور عقل چیونٹی سے بدتر۔" انہوں نے پیچھے سے میرے لمبے قد پر چوٹ کی میں نے کمرے کی دہلیز پر رک کر کیچڑ سے بھرے بوٹ اتارے، سارے برآمدے میں کیچڑ سے نقش ونگار بن چکے تھے۔

میں نے کمرے میں جا کر جلدی سے الماری میں سے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ "آج نمونیہ نہیں تو بخار تو لازمی ہو جائے گا۔" نہا کر میں نے گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے سوچا ہیٹر چلانا چاہیے۔

"کچھ کھایا تھا تم نے۔" ابو جی کی اچانک آواز پر میں اچھل ہی پڑا۔

"جج جی نہیں۔" وہ ابھی تک جاگ رہے تھے امی! ہمیشہ کہا کرتی تھیں۔ "آخری عمر میں عورت کی نیندیں اچاٹ ہو جاتی ہیں اور مرد کو بے تحاشا نیند آتی ہے۔" مگر یہاں تو معاملہ بالکل الٹ تھا۔

"چلو آ کر کچن میں کچھ کھاؤ پہلے۔" انہوں نے آرڈر دیا۔

"ابو جی اب ایک تو بج رہا ہے صبح کھا لوں گا۔" میں منمنایا۔

"نہیں رات کو کیا خالی پیٹ سونا ہے اتنی لمبی رات ہے چلو آ کر پہلے کچھ کھاؤ۔" انہوں نے ان سنی کرتے ہوئے کہا تو میں طوعاً کرہاً ان کے پیچھے چل پڑا۔

اور حسب توقع کچن میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا ہاٹ پاٹ میں صرف دوپہر کی ایک روٹی پڑی تھی میں نے ابو جی کو دیکھا۔

"چار انڈوں کا آملیٹ بنا لو۔ مجھے بھی سخت بھوک لگ رہی ہے میں ٹوسٹر میں سلائس سینک لیتا ہوں۔" انہوں نے کہہ کر فریج میں سے انڈے نکالے اور میرے آگے رکھ دیے میں کڑھ کر رہ گیا۔ "تبھی میرے کھانے پر اتنا اصرار ہو رہا تھا خود کو جو بھوک لگی ہوئی تھی۔" میں نے جلتے کڑھتے انڈے توڑ کر باؤل میں ڈالے اور کیبنٹ میں سے نمک مرچ کے ڈبے ڈھونڈنے لگا۔

☆☆☆

"عمر، عمر اٹھو نماز کا ٹائم ہو گیا ہے۔" ابھی شاید میں پہلی کروٹ پر ہی سویا ہوا تھا جب منہ اندھیرے ابو جی کی بلند آواز میرے کانوں میں پڑی، رات سوتے سوتے ہی دو بج گئے تھے اور اب پھر وہ میرے سرہانے کھڑے تھے۔

"اونہہ۔" سارا بدن درد سے دکھ رہا تھا میں نے کہہ کر کروٹ بدل لی۔

"نالائق اٹھو۔ اٹھ کر نماز پڑھو۔ شیطان کی پوجا پاٹ رات کے دو دو بجے تک کرتا ہے اور جو خدا بن مانگے صبح و شام تیری ضرورتیں پوری کرتا ہے اس کے لیے چند منٹ نہیں ہیں تیرے پاس۔" وہ بدستور میرے سر پر کھڑے تھے۔

"نہ کرے میری ضرورتیں پوری وہ۔ مجھے جو اس نے تخت سلیمانی کی شہنشاہیت بخش رکھی ہے میری طرف سے بھلے واپس لے لے۔ میں نماز پڑھنے اس وقت نہیں جاؤں گا۔" میں نے ذرا سا لحاف منہ سے ہٹا کر دوٹوک لہجے میں کہا اور دوبارہ سر لحاف میں دے دیا۔

"نعوذ باللہ۔ لاحول ولاقوۃ شیطان کی صحبت تو اچھے اچھوں کو راہ سے بھٹکا دیتی ہے تم کون سا انوکھا کہہ رہے ہو۔ اللہ تمہیں ہدایت دے نیکی کی۔ توبہ کرو اور اٹھ کر نماز پڑھ لو۔" اب کے ان کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔

"سوری میں نے کہہ دیا۔ میں نہیں اٹھوں گا۔" میں نے ڈھٹائی سے کہہ کر تیسری بار کروٹ بدل لی۔ پھر انہوں نے دوبارہ کچھ نہ کہا اور تھوڑی دیر بعد باہر چلے گئے۔ پھر باہر کا گیٹ کھلنے اور تالا لگنے کی آواز آئی۔ وہ باہر جاتے وقت باہر سے تالا لگا جاتے تھے ان کے جانے کے بعد جیسے میری آنکھیں پٹ سے کھل گئیں اور پھر مجھے کتنی دیر تک نیند ہی نہ آسکی اور پھر جیسے ہی دوبارہ میری آنکھ لگی وہ پھر میرے سر پر موجود تھے۔

"عمر چلو اٹھو۔ قبرستان جانا ہے رات کی بارش سے تمہاری ماں کی قبر کا کیا حال ہو گیا ہو گا چل کر دیکھتے ہیں۔" انہیں نیا آئیڈیا سوجھا تھا۔

"ایک مدت کے بعد تو انہیں قبر میں جا کر آپ کے ہاتھوں چین ملا ہے اب تو انہیں سکون لینے دیں۔" میں نے دل میں جل کر سوچا۔

"سنا نہیں تم نے، آکے نیندیں پوری کر لینا۔" وہ کڑکے۔

"یا اللہ ابو جی آپ رات کو دو ڈھائی بجے سوئے ہیں اب صبح سے پھر آن واڈیوٹی ہیں۔ آپ کیوں نہیں مان لیتے کہ آپ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اور اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔" میں جھنجلا کر اٹھ بیٹھا۔

"آرام تو بیٹا جی ایک ہی دفعہ کریں گے یہ دنیا تو عمل کی جگہ ہے آرام کا مقام تو آگے ہے اور یہ ریٹائرڈمنٹ کوئی ریٹائرڈمنٹ ہے اس کا تو مطلب ہے کہ اتنا عرصہ جو ہم نے مسلسل عمل کرنے اور الرٹ رہنے کی جو ٹریننگ لی ہے اسے عملی زندگی میں لاگو کریں۔ بس اب بستر چھوڑ دو اور جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر میرے ساتھ چلو۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہوگی آج جمعہ ہے۔" انہیں پتا تھا کہ ان کا یہ جذباتی جملہ مجھے ایک پل میں بستر سے اٹھا دے گا وہی ہوا میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ امی سے میں کس قدر قریب تھا یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے اور جتنا میں ان سے الرجک تھا اب اتنا ہی وہ میرے گے پیچھے رہتے تھے۔

تھوڑی دیر میں تیار ہو کر ہم دونوں قبرستان کی طرف چل پڑے رات کو بارش سے واقعی قبر کی مٹی کافی بہہ گئی تھی گورکن کو انہوں نے پیسے دیے قبر کی لپائی کے لیے اور ہم فاتحہ پڑھ کر باہر نکل آئے۔

"سارا گھر مردہ خانہ بنا پڑا تھا۔ مجال ہے کوئی نو بجے سے پہلے اٹھ جائے نہ کسی کو نماز کی پرواہ نہ سحر خیزی کی۔ یہ مظہر اچھا بھلا جاگنگ کو جاتا تھا اب جب سے بیوی نے اندھا گونگا کیا ہے وہ بس اسی کے اشاروں پر ایکسرسائز کرتا ہے اور اظہر کی تو بات ہی جانے دو اس نے تو لٹیا ہی ڈبو دی ہے۔ اس کی کل کائنات وہ گوری میم یا اس کے دونوں بچے ہیں۔ سارا دن دفتر میں دونوں گزار آتے ہیں اور شام کو بن ٹھن کے سیر سپاٹے کو جا نکلتے ہیں گھر میں ہر طرح کا اناج ہوتے ہوئے بدنصیب ہوٹلوں میں دھکے کھاتے ہیں۔"

ابو جی کا من پسند ٹاپک شروع ہو چکا تھا اور میں امی کی یاد کے سحر میں چپ چاپ سب کچھ سن رہا تھا۔

"اگر میرا ڈنڈا سر پہ نہ ہو تو یہ گھر گھر ہی نہ لگے۔ ایک ٹائم کھانے کی رسم ادا کی جاتی ہے وہ بھی وہ منحوس بٹلر آتا ہے نمک مرچ گھول گھال کر پکا جاتا ہے اور وہ دونوں اسے میز پر سجانے کی زحمت کرتی ہیں اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیتے ہیں۔ کھانے تو تمہاری بہشتن ماں کے ہاتھوں کے ہوتے تھے جو کھاتا وہ انگلیاں چاٹتا رہ جاتا۔ میرے دوست بہانے بہانے سے مجھ سے دعوتیں کراتے تھے کہ بھابھی کے ہاتھ کے پکے کھانے تو ملیں گے۔"

حالانکہ امی کے سامنے ابو جی نے کبھی ان کی جھوٹے منہ تعریف نہیں کی تھی ہمیشہ کہتے تھے "بانو تمہاری اتنی عمر ہو گئی ہے پر تمہیں کھانا پکانا نہ آیا۔ اگر جو تم نے میری ماں سے کھانا پکانا سیکھ لیا ہوتا آج تو تمہارے کھانوں میں بھی کچھ ذائقہ ہوتا۔" تو امی بیچاری کڑھ کر رہ جاتیں اور اب ابو جی ہر وقت ان کے کھانوں کی تعریف کرتے رہتے تھے۔

ان کا لیکچر سعدیہ پھوپھو کے گھر کے دروازے کے پاس پہنچ کر ختم ہوا۔

"ابو جی۔" میں نے احتجاجاً انہیں کہا۔

"اتنے دن ہو گئے ہیں بچوں کی خیر خبر لے چلتے ہیں۔" انہوں نے جیسے مجھے سمجھایا اور کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا اسی وقت مجھے تین چھینکیں آئیں اور ساتھ ہی ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ لگتا تھا رات کی بارش کام کر گئی تھی۔ گیٹ عائزہ نے کھولا میرا منہ کڑوا ہو گیا۔

"اسلام علیکم ماموں جان۔" رائل بلیو گرم سوٹ میں بنی ٹھنی وہ کہیں جانے کو تیار لگ رہی تھی ابو جی کو دیکھتے ہی اس نے چاپلوسی سے جھٹ سلام کیا۔

"وعلیکم اسلام جیتی رہو۔" ابو جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا تو اس نے پیچھے ہٹ کر ہمیں گزرنے کا راستہ دیا۔

"سعدیہ کہاں ہے۔" ابو جی نے اندر جاتے ہوئے پوچھا۔

"امی کچن میں ہیں۔" وہ پھوپھو کا جائے مقام بتا کر اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ سعدیہ پھوپھو کچن میں ناشتہ بنا رہی تھیں ابو جی کو دیکھتے ہی کھل اٹھیں میں نے انہیں جتنی بے دلی سے سلام کیا انہوں نے اتنی ہی گرمجوشی سے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کیا ہم وہیں کچن میں پڑے ٹیبل کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"بڑے دنوں بعد آئے بھائی جان۔" وہ ہمارے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں تو پچھلے ہفتے بھی آیا تھا البتہ یہ نالائق شاید ایک عرصے کے بعد ادھر آیا ہے۔" وہ میری عزت افزائی کرنا کہیں نہیں بھولتے تھے۔

"چلیں کوئی بات نہیں آیا تو سہی۔ اظہر اور مظہر کی تو میں صورتوں کو ترس گئی ہوں۔" وہ اسی لگاوٹ سے بولیں۔

"اس میں ترسنے والی کی بات ہے وہ کون سا گورنر ہاؤس میں رہتے ہیں وہ نہیں آتے آپ اُدھر ان سے مل لیا کریں پہلے بھی تو آتی تھیں۔" میں نے روکھے لہجے میں کہا تو ابو جی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نظریں چرا گیا ساتھ ہی مجھے پھر سے تین چار اکٹھی چھینکیں آئیں۔

"لگتا ہے عمر بیٹا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ میرے سرد رویے کی پرواہ کیے بغیر اسی محبت سے بولیں۔

"طبیعت خراب نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا رات رات بھر......" ابو جی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"رات بھر کیا۔" پھوپھو نے کچھ تجسس سے پوچھا۔

''پڑھتا رہتا ہے رات بھر انٹرویوز کی تیاری کے سلسلے میں۔'' شاید میں نے انہیں پہلی بار جھوٹ بولتے دیکھا تھا وہ بھی میرے لیے۔

''یہ عائزہ کہاں گئی ہے۔'' ابو جی نے پوچھا۔

''اندر کمرے میں تیار ہو رہی ہے۔''

''خیریت اس وقت کس لیے تیار ہو رہی ہے اور باقی تینوں بچے کہاں ہیں۔''

''عاقب تو سیر کے لیے جاتا ہے صبح کو۔ اس کا کالج دیر سے شروع ہوتا ہے باقی عمران اور فائزہ ابھی ابھی اسکول کے لیے نکلے ہیں۔ بھائی جان ناشتا بناؤں آپ کے لیے۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔

''ہاں کرتے ہیں ناشتہ بھی۔ تم نے بتایا نہیں عائزہ کس لیے تیار ہو رہی ہے۔''

''ماموں جی میں نے اسکول میں جاب کر لی ہے گھر سے تھوڑی دور ہے انگلش میڈیم اسکول ہے۔'' عائزہ نے اندر آتے ہوئے ابو جی کو جواب دیا۔

''ماموں جی وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہو گا فارغ مباش کوئی کام کیا کر نئے نہیں تو پرانے ادھیڑ کر سیا کر۔'' اس نے سیدھا سیدھا مجھے دیکھتے ہوئے چوٹ کی۔

''ہاں بالکل سنا ہے یہ نکموں کے لیے ہی ہے۔'' ابو جی نے بھی مجھے دیکھتے ہوئے کہا اس کی ہاں میں ہاں ملائی میں کڑھ کر رہ گیا۔

''تم کون سا توپ چلا رہی ہو دو چار سو کے لیے، طوطے کی طرح اے بی سی رٹوانا تمہیں ہی زیب دیتا ہے۔'' میں نے حقارت سے کہا۔

''تو آپ توپ چلا لیں جہاز اڑا لیں کچھ کریں تو سہی۔''

''عائزہ بیٹا اس سے غلیل سے فاختہ نہیں مرتی تم توپ چلانے کی بات کر رہی ہو۔ یہ جی رہے ہیں یہ کام ان کے نزدیک توپ چلانے کے برابر ہے۔'' ابو جی کے طنز پر میرا جی چاہا کہ میں مینار پاکستان سے کود جاؤں۔

''ہر وقت نہ بھائی جان بچے کو لعن طعن کرتے رہا کریں۔ مل جائے گی نوکری بھی آپ اس کا حوصلہ بڑھایا کریں۔'' پھوپھو نے پیڑے بناتے ہوئے میری سائیڈ لی۔

''ہونہہ حوصلہ۔'' میں بڑبڑایا۔ ''یہ دیں گے۔''

''لیکن عائزہ بیٹا تم نے کیا ایم ایس سی میں ایڈمیشن نہیں لینا تھا جو یہ نوکری کے چکروں میں گئی ہو۔'' وہ میری بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے عائزہ سے بولے۔

''ماموں جی لے لوں گی ایڈمیشن بھی یہاں کون سی نوکریوں کی لائنیں لگی ہوئی ہیں۔ ایم ایس سی کر کے بھی لوگ، دھکے کھا رہے ہیں میرے لیے تو یہی سبق کافی ہے۔ فی الحال میرا جاب کرنے کا موڈ ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولی اور آملیٹ کے لیے ہری مرچیں کاٹنے لگی۔

''اور جو ماسٹر کر چکے ہیں انہیں دو چار سو کی بھی جاب نہیں مل رہی۔'' اس نے پھر مجھے نشانہ بنایا۔ ''ایک دو سال بعد لے لوں گی ایڈمیشن۔''

''ایک دو سال کی تمہاری نظر میں کوئی وقعت نہیں جاب کے لیے بھی ایج لیمٹ ہوتی ہے وہ تم ضائع کر دو گی۔'' بھانجی کے لیے ابو جی کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''نہیں ضائع ہوتے یہ سال۔'' وہ آملیٹ پھینٹتے ہوئے بولی۔

''سعدیہ تم سمجھاتی کیوں نہیں اسے۔'' ابو جی نے پراٹھا توے پر ڈالتی پھوپھو سے کہا۔

''چھوڑیں بھائی جان اس کو اپنی خواہش پوری کر لینے دیں۔'' پھوپھو کا لہجہ ٹالنے والا تھا۔

ابو جی بھی چپ کر گئے۔ تھوڑی دیر میں عائزہ نے ناشتہ ہمارے آگے رکھا۔ رات کا سالن گاجریں گوشت تھا ساتھ آملیٹ اور پراٹھے۔ ان کی خوشبو سے ہم دونوں کی بھوک چمک اٹھی۔

''امی میں جا رہی ہوں دیر ہو رہی ہے مجھے۔'' وہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ''ناشتا کر جاؤ۔'' پھوپھو نے آواز لگائی۔

''میں نے فائزہ کے ساتھ کر لیا تھا۔'' اس نے شال اوڑھتے ہوئے کہا ''اچھا ماموں جی میں چلتی ہوں۔ آپ دوپہر تک رہیے گا۔ میری ایک بجے چھٹی ہوتی ہے۔''

''نہیں بیٹا بس میں تو تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ یہ عمر تمہیں چھوڑ آتا ہے۔''

''نہیں ماموں جی اسکول زیادہ دور نہیں میں چلی جاؤں گی شکریہ۔ اچھا خدا حافظ۔'' وہ کہتی ہوئی بلیک کورٹ شوز کی ہیل کھٹ کھٹ کرتی باہر نکل گئی۔ ''ہونہہ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔'' میں نے سر جھٹک کر سوچا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

پھوپھو کے گھر سے ابو جی تو اپنے کسی دوست کی طرف چلے گئے اور میں گھر آ گیا اظہر بھائی نے دروازہ کھولا باقی شاید ابھی تک سو رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ باہر اب ہلکی ہلکی دھوپ نکل چلی تھی اور آسمان بالکل صاف تھا لیکن مجھے سردی لگ رہی تھی میں کمرے میں جاتے ہی لحاف میں گھس گیا کتنی دیر تک بستر میں بھی ٹھٹھرتا رہا اوپر سے چھینکیں اور آنکھوں سے لگاتار پانی بہہ رہا تھا بخار اور فلو کا شدید حملہ ہو چکا تھا کافی دیر بعد میں یونہی کانپتے ہوئے سو گیا شاید دوپہر ہو گئی تھی جب ابو جی نے

اندر آ کر مجھے آوازیں دیں وہ یقیناً مجھے جمعہ کی نماز کے لیے اٹھانا چاہ رہے تھے۔

''عمر، عمر اٹھو۔ نماز کا وقت ہوا جا رہا ہے۔ خطبہ نکل جائے تو جمعہ کا سارا ثواب ختم ہو جاتا ہے چلو اٹھ جاؤ اب صبح سے سو رہے ہو۔'' جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو انہوں نے آگے بڑھ کر لحاف میرے منہ سے اتارا۔

''ابو جی! مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' میں نے گردن اور تکیے میں گھسا لی انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا کا میرا ماتھا چھوا۔

''اوہ تمہیں تو بہت تیز بخار ہے لیٹے رہو تم نہ اٹھنا۔ میں ریاض کا پتا کرتا ہوں شاید ابھی گھر پر ہو۔'' وہ ڈاکٹر ریاض کا پتا کرنے چلے گئے۔ ہمارے گھر سے چوتھا گھر ان کا تھا تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب کو لے کر چلے آئے۔

''ویسے حیات یار تم ہر وقت لڑکے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے رہتے ہو اور اب اسے معمولی بخار ہے اور تم نے میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے کپڑے بھی نہ بدلنے دیے وہ گھبراہٹ ڈالی میں سمجھا خدا نخواستہ عمر کو کیا ہو گیا۔ موسمی بخار اور فلو ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے تھرمامیٹر میرے منہ سے لیتے ہوئے ابو جی سے کہا۔

''تمہیں معمولی نظر آ رہا ہے آنکھیں اور چہرہ دیکھو اس کا کیسے سرخ ہو رہے ہیں دھیان سے چیک کرو۔'' وہ خفا ہو کر بولے۔

''ہاں اب اس عمر میں مجھے دوبارہ سے تھرمامیٹر پڑھنا سکھاؤ گے تم۔ ایک سو دو بخار ہے اور تم نے واویلا مچایا ہوا ہے۔'' وہ تمسخر سے بولے ''یہ دوائیں لکھ رہا ہوں منگوا لو۔'' انشاء اللہ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے پیڈ پر پین گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''ویسے عمر یار آج کل تمہارا کوئی انٹرویو تو نہیں کیونکہ زیادہ تر تم ان ہی دنوں میں بیمار پڑتے ہو۔'' انہوں نے لکھتے ہوئے ہاتھ روک کر مجھے کہا۔

''جی نہیں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں یہ تو تم نے صحیح تشخیص کی ہے یہ عین انٹرویو والے دن بیمار پڑ جاتا ہے۔'' انہوں نے ڈاکٹر کی ہاں میں ہاں ملائی تو میں نے ناراضگی کے اظہار کے لیے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

پھر ابو جی نے پل بھر میں سارے گھر کو الرٹ کر دیا شہلا بھابھی کی دوست نے اپنے میاں کے ساتھ دعوت پر آنا تھا۔ بٹلر آج شاید چھٹی پر تھا وہ کھانے تیار کر رہی تھیں ساتھ نذیر کو کوس رہی تھیں جس نے بن بتائے چھٹی کر لی تھی۔ ابو جی نے ان کے ادھ پکے نرگسی کوفتے چولہے سے اتروا کر میرے لیے کسٹرڈ تیار کروایا۔ اظہر بھائی چائے کے لیے سامان کی لسٹ لیے بازار جا رہے تھے آج انہوں نے شہلا بھابھی کی دوست کے اعزاز میں چھٹی کی تھی ابو جی نے لسٹ ان کے ہاتھ سے لے کر میری دواؤں کا پرچا تھما دیا۔

''پہلے یہ دوائیں لے کر آؤ پھر یہ خرافات لینے جانا۔'' انہوں نے اظہر بھائی کے جز بز کرنے پروا کیے بغیر کہا۔ شہلا بھابھی کوفتے کھل جانے پر الگ بڑبڑ کر رہی تھیں۔

''بینا بیٹا ادھر آ کر یہ کسٹرڈ ٹھنڈا کر کے پیالے میں ڈالو۔ یہ تو ملکہ وکٹوریہ کی دعوت کا اہتمام کر رہی ہیں ان کا وقت قیمتی ہے بیمار بھائی کا کچھ خیال نہیں۔'' انہوں نے کچن کی کھڑکی سے بینا بھابھی کو پکارا جو فون پر اپنی بہن سے باتیں کر رہی تھیں۔ ابو جی کی چوتھی پکار پر انہوں نے منہ بنا کر ریسیور رکھ دیا اور کھٹ کھٹ کرتی کچن میں آ گئیں۔

میں نے بینا بھابھی کا نام ''بابرہ شریف''...... رکھا تھا بلکہ میں کہتا تھا کہ آپ بابرہ شریف سے بھی زیادہ بہادر ہیں وہ تو روپوں کے لیے پنسل ہیل پہن کر ڈانس کرتی ہے آپ تو بغیر کسی لالچ کے صبح نو بجے سے رات بارہ بجے تک سوئی کی نوک پر پھرتی ہیں۔ شادی کے بعد سے آج تک انہوں نے سلیپر یا فلیٹ شوز نہیں استعمال کیے تھے ان کے جوتے کی کم سے کم ہیل بھی دو ڈھائی انچ سے کم نہ ہوتی تھی اور جب میں کہتا کہ۔

''میدان حشر میں آپ نے اس پنسل ہیل کے ساتھ فرشتوں کو بھی تگنی کا ناچ نچا دینا ہے مگر ان کے ہاتھ نہیں آنا ان کی فرشتگی آپ کے کہن سالہ تجربے کے آگے ہار جائے گی۔''

تو وہ ان باتوں کو قطعاً مائنڈ نہ کرتی تھیں چار فٹ ساڑھے دس انچ قد پر جب وہ تین چار انچ کی ہیل پہن کر سارے گھر میں گھومتیں تو کسی چابی کی گڑیا کا گمان ہوتا مجال ہے جو ذرا پاؤں ڈول جائے اور مظہر بھائی کو ان کی اس پر اعتماد چال نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ امی مرحومہ انہیں دیکھ دیکھ کر دہلا کرتی تھیں۔

''بیٹی خدا کے لیے کام کے دران تو نیچی ہیل پہن لیا کرو کسی دن جو خدا نہ کرے پاؤں رپٹ گیا تو کیا ہوگا۔'' مگر وہ ان سنی کر دیتیں۔

اور میرا تو گھر میں رہنے سونے جاگنے کا سارا ٹائم ٹیبل ان کی جوتی کی ٹک ٹک پر چلتا تھا آٹھ بجے جب وہ ٹک ٹک کرتی کچن میں مظہر بھائی کے لیے ناشتا بنانے جاتیں تو میری آنکھ کھل جاتی اور میرے لیے تو یہ آواز اس نعمت سے کم نہ تھی کہ اسی ٹک ٹک سے گھبرا کر ابو جی نو بجے سے پہلے ہی گھر سے چلے جاتے تھے پھر ان کی ایک ٹانگ کچن میں ہوتی اور دوسری اپنے کمرے میں ٹھیک پونے دس بجے

دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کاموں پر سدھارتے بینا بھابھی ایک پرائیویٹ فرم میں پبلک ریلیشنز آفیسر کے طور پر کام کرتی تھیں ان کے جاتے ہی جیسے گھر میں سکون ہو جاتا سارے گھر کے فرش شکر کا کلمہ پڑھتے۔

شہلا بھابھی دس بجے جاتی تھیں وہ انگلش میڈیم اسکول میں کمپیوٹر ٹیچر تھیں دس بجے پورا گھر سائیں سائیں کر رہا ہوتا تھا اور میری آنکھ جوان سحر خیز ہنگاموں کی وجہ سے جلدی کھل جاتی تھی دوبارہ سونے ہی لگتا کہ ابو جی کی کڑک دار آواز مجھے بستر سے نکلنے پر مجبور کر دیتی صاحباں شروع ہو ہی سے گھر کی صفائی کرتی تھی دس بجے وہ آ جاتی اور ابو جی اپنی نگرانی میں پورا گھر کسی سگھڑ بیوی کی طرح صاف کرواتے پھر ساتھ ساتھ مجھے آوازیں دیتے جاتے میری سستی اور بدحرامی کو کوستے مگر میں بھی منہ سر لپیٹے ڈھیٹ بنا لیٹا رہتا گیارہ ساڑھے گیارہ بجے جب میں منہ دھو کر کچن میں جاتا تو صبح کا بنا ہوا ناشتا ٹھنڈا ٹھار ہو چکا ہوتا۔ ایک دن ہم دونوں کا ناشتا بینا بھابھی بناتی تھیں اور دوسرے دن شہلا بھابھی۔

ابو جی صبح اٹھتے تھے سات بجے تک ان کی بھوک چمک اٹھتی وہ بے چینی سے اندر باہر پھرتے دونوں کمروں کے آگے آوازیں لگاتے گزرتے کہ اٹھ جاؤ تم لوگوں کو دیر ہو جائے گی دفتروں سے۔ آٹھ بج گئے ہیں۔ نو بج گئے ہیں، کبھی ٹی وی اونچی آواز میں لگا دیتے لیکن سب ڈھیٹ بنے سوئے رہتے آٹھ بجے سے پہلے کوئی اپنے کمرے سے برآمد نہیں ہوتا تھا۔

''ابو جی آپ ایک چائے کا کپ خود بنا کر نہیں پی سکتے اتنا سا کام تو بندہ اپنا خود کر لیتا ہے آپ تو حد کر دیتے ہیں اب وہ دونوں بھی تو سارا دن گھر کے کام کرتی ہیں پھر نوکری بھی کرتی ہیں اگر صبح کو آدھا گھنٹہ لیٹ ہو جاتے ہیں تو آپ......'' اظہر بھائی سرخ نیند سے بوجھل آنکھیں لیے بیوی اور بھاوج کے حمایتی بن کر بولتے۔

''ہاں ہاں کہہ دو میں پاگل ہو جاتا ہوں اور میاں یہ تم نہیں بول رہے تمہاری بیوی کی زبان بول رہی ہے۔ اور وہ دونوں سارا دن کون سے ہل میں جتی رہتی ہیں صبح کو بن ٹھن کر دفتر اسکول نکل گئیں گھر کو دیکھے ان کی جوتی۔ دوپہر میں وہ منحوس شیطان کی شکل والا بٹلر آدھے گھنٹے کے لیے آتا ہے دال سبزی سب گھول گھال کر چلتا بنتا ہے یہ آتی ہیں تین بجے ٹھنڈا گرم ہم بدنصیبوں کے آگے رکھا اور پھر جا اپنے کمروں میں گھستی ہیں تو شام چھ سات بجے سے پہلے شکل نہیں دکھاتیں اور دوپہر کے ملغوبے کو شام کو گرم کر کے آگے رکھ دیتی ہیں۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکے۔

''اور میں جس نے ساری زندگی شہر بھر کی کوتوالی کی ہے اب اس عمر میں خود چائے بنا کر پیوں گا۔ شرم کرو نافرمانو۔ اس دن کے لیے انسان اولاد مانگتا ہے کہ پچاس ساٹھ کے پیٹے میں جا کر خود

چائے پتی ابال کر پیے اور تم اسے پاگل جنگلی کہو بھوکا اور دیوانہ۔'' ابو جی بھوکے شیر بنے ہوتے تھے اظہر بھائی پر برس پڑتے۔

''میں نے یہ سب کب کہا آپ خود ہی بات سے بات بنا رہے ہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولے۔

''اور چائے بنانے میں کون سی انسان کی ہتک ہوتی ہے جو وہ بے اولاد ہونے کی ہی تمنا کر بیٹھے۔''

''ہاں تم جیسوں کے لیے واقعی کوئی ہتک کی بات نہیں تم خود جوڑے سجا سجا کر بیگم کی خاطریں کرتے ہو تمہیں یہ کرتا کیوں برا لگے گا مجھے تو لگتا ہے وہ تمہارا شوہر ہے اور تم اس کی جورو۔''

ابو جی حد کر دیتے۔

''اتنا تو خدا سے نہیں ڈرتے جتنا اس کے ابرو کے اشارے سے ڈرتے ہو اور نامراد میری باتوں کا مطلب تمہیں تب سمجھ میں آئے گا جب اپنی اولاد تمہارے ساتھ یہ کرے گی۔'' ابو جی کون سے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

''صبح صبح اس گھر میں بددعاؤں سے استقبال ہوتا ہے کتنا خیال رکھو کتنی ہی جان مارو پھر بھی نافرمان ہی کہلائیں گے ہونہہ۔'' وہ پیر پٹختے اپنے کمرے کو پلٹ جاتے جہاں شہلا بھابھی انہیں تمسخر بھری نظروں سے دیکھ رہی ہوتیں۔

''مجھے تو سمجھ نہیں آتی آپ کے والد صاحب اتنے ایجوکیٹڈ ہیں پھر بھی نہ تو انہیں مینرز آتے ہیں نہ ایٹی کیٹس۔ کسی کے بیڈ روم کا بلاوجہ دروازہ پیٹنا سوئے ہوؤں کو اونچی آواز میں ٹی وی چلا چلا کر ڈسٹرب کرنا۔ چیخ چیخ کر بات کرنا کونسے کوڈ آف مینرز میں لکھا ہے۔'' اظہر بھائی خواہ مخواہ شرمندہ ہو جاتے۔

''اصل میں اس میں ان کا بھی قصور نہیں ساری زندگی نوکری بھی تو اس محکمے میں کی ہے جہاں انسانوں سے بھی حیوانوں کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔ پھر کچھ عمر کا بھی تقاضا ہوتا ہے۔'' اور شہلا بھابھی کے یہ تیر بھی اظہر بھائی شربت کے گھونٹ کی طرح آرام سے حلق میں نیچے اتار لیتے۔

مظہر بھائی اور بینا بھابھی کا اپنا طریقہ تھا ابو جی کے سامنے وہ دونوں بڑی تابعداری سے ہاں میں ہاں ملاتے رہتے اپنی غلطیوں پر خواہ مخواہ شرمندہ ہوتے اور جیسے ہی ابو جی منظر سے آؤٹ ہوتے وہ دونوں دل کھول کر ان کی اخلاقیات کو ڈسکس کرتے۔

انہیں وجوہات کی بنا پر ابو جی کی ساری توجہ مجھ غریب پر تھی دوسرے وہ چاروں تو جاب کے بہانے آدھے سے زیادہ دن گھر سے باہر گزار لیتے تھے اور میں بیروزگار ہونے کی وجہ سے سارا دن ان

کے عتاب کا نشانہ بنتا تھا۔ گھر سے باہر جاتا تو آوارہ گرد اور لوفر گھر میں رہتا تو نکما ہڈ حرام اور کام چور کہلاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا ذلت بھرے یہ دن کبھی نہیں گزریں گے۔

وہ میری ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھتے۔ میں کچھ بھی کر رہا ہوتا وہ بغیر دروازہ ناک کیے کمرے میں آ جاتے تفتیشی نظروں سے مجھے جانچتے کہ میں انہیں اچانک سامنے دیکھ کر گھبرایا کیوں ہوں میری غیر موجودگی میں سارے کمرے کی تلاشی لیتے تکیے کے نیچے میٹرس اٹھا کر الماری کے درازوں میں کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے جوتوں والے ریک کے نیچے باتھ روم کی الماری میں بیڈ کے نیچے۔ خدا جانے انہیں مجھ پر کیا شک تھا یا تو وہ مجھے کوئی تخریب کار سمجھتے تھے یا ملک دشمن عناصر کا کوئی فعال پرزہ کہ وہ میری کتابوں کے ریک کی خصوصی تلاشی لیتے۔ ایک بار تھرڈ ائیر کے پیپرز کے دوران میں رات بارہ بجے بیٹھا پڑھ رہا تھا جب اچانک انہوں نے پیچھے سے چھاپا مارا اور میں جو کیمسٹری کی کتاب میں طلزاینڈ یون کا گرما گرم پورے انہماک سے پڑھ رہا تھا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

میں رات کو دیر سے گھر آتا وہ پاس ہو کر بہانے بہانے سے میرا منہ سونگھتے آنکھوں کی رنگت چیک کرتے۔ مجھ سے گیٹ سے برآمدے تک طویل جرح کرتے کہ کہیں میری زبان تو لڑکھڑا نہیں رہی!

مجھے یوں لگتا جیسے میں کسی ایسے پیچیدہ کیس کا ملزم ہوں۔ جس کے جرائم کے بارے میں تفتیش ہو رہی ہے اور کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے سے پہلے میں ان کی نظروں کے حوالات میں قید ہوں وہ کسی سائے کی طرح میری نگرانی کرتے تھے اکثر میرے دوستوں سے ملنے جاتے میرے بارے میں کرید کرید کر ان سے سوالات کرتے اور جب اگلے روز وہ لوگ ہنس ہنس کر ان کے تفتیشی سوالات کے بارے میں مجھے بتاتے تو میں اپنی جگہ پانی پانی ہو جاتا۔

"اور جا یار تجھ پر تو تیرے باپ کو اعتبار نہیں وہ سارے شہر میں تیرے بارے میں گواہیاں لیتا پھرتا ہے کل کو اگر تو سگریٹ رکھنے کے الزام میں بھی دھر لیا جائے تو وہ تیری ضمانت بھی نہ کروائے بلکہ کسی اور کیس میں تجھے عمر قید کرا دے۔" اور میں کھول کر رہ جاتا۔

"چچ چچ بیچارہ۔ ایک تو بیروزگار اوپر سے ایسا ہٹلر ٹائپ باپ۔" رضوان مجھے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتا۔

"ویسے عمر یار یہ تمہارے اصلی تے خالص، والے ابو جی ہیں کبھی پتا تو کرواؤ۔" اور مشکوک لہجے میں پوچھتا۔

"یار ہم بھی بیروزگار ہیں گھر والے طعنے بھی مارتے ہیں پر اتنی انکوائریاں کوئی نہیں کرتا جتنی

تمہارے ابو جی کرتے ہیں تو بہ ہر وقت کا سہم ہے یہ تو۔ ننگی تلوار نہ معلوم کب سر پر آن برسے۔" فہیم بھی لقمہ دیتا۔

ایسے میں میرا جی چاہتا میں یہ ملک چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں کم از کم ابو جی کی کل وقتی نگرانی سے تو جان چھوٹ جائے گی اور میں نے ایک بار یہ کوشش کی بھی تھی جب میں نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے آسٹریلیا جانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا اور جس روز ابو جی کی الماری سے پچاس ہزار نکال کر میں لایا اور جیسے ہی ایجنٹ کو دینے کے لیے میں نے بریف کیس کھولا عین اسی وقت ابو جی نے پیچھے سے آ کر میری گردن ناپ لی اور پھر جو انہوں نے ٹریولنگ ایجنسی کے اس ٹھنڈے کمرے میں میری مزاج پرسی کی اس نے زندگی بھر پھر کبھی مجھے ایسا سوچنے بھی نہیں دیا۔

اور مجھے اس وقت اپنے اوپر کتنا ترس آیا تھا جب ایم فارمیسی کے پریولیس اور فائنل کے امتحان میں جاتے وقت انہوں نے میری مکمل جامہ تلاشی لی تھی صرف ایک بار بی اے کے انگلش کے پیپر کے لیے میں نے پھرلے تیار کیے تھے جو گھر سے نکلتے وقت نہ جانے کیسے میری نیلی شرٹ کی بغل سے جھانک پڑے اور ابو جی کی خوردبینی نظروں سے انہیں تاڑ لیا اس دن سے ہر امتحان میں جانے سے پہلے وہ میری مکمل تلاشی لیتے تھے اور پھر اپنی نگرانی میں مجھے ایگزامینیشن ہال کے دروازے تک چھوڑنے جاتے مجھے کتنی شرم آتی تھی جب وہ مجھے اپنی آفس کی گاڑی میں بٹھا کر امتحان کے لیے لے کر جاتے یونیورسٹی کے گیٹ سے لے کر ایگزامینیشن ہال تک جتنے میرے واقف کار مجھے اس حال میں دیکھتے وہ ٹہوکا دے کر ساتھ کھڑے بندے کو ضرور میرے احوال سے باخبر کرتے اور پیپر کے بعد جو میرا ریکارڈ لگتا وہ الگ تھا پیپر دے کر میں اتنی تیزی سے منہ چھپا کر یونیورسٹی سے باہر آتا جیسے کسی کی بھینس کھول کر بھاگ رہا ہوں۔

ابو جی کی اس کڑی نگرانی نے میری عزت کو دو کوڑی کر دیا تھا دوبارہ اپنا اعتماد بحال کرتے کرتے مجھے کتنے دن لگ جاتے۔

"وہ ابو جی تو مجھے اس لیے چھوڑنے آتے رہے تھے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی ڈاکٹر نے مجھے ڈرائیونگ سے منع کیا تھا، میں جواز گھڑتا۔

"اچھا تمہاری طبیعت صرف امتحان کے دنوں ہی میں اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ تم سے خود سے ڈرائیونگ بھی نہیں کر سکتے اور تمہارے ابو جی تمہیں انگلی پکڑ کر چھوڑنے آتے ہیں۔" اسد معنی خیز انداز میں کہتا۔

انہوں نے کبھی دونوں بھائیوں کی تو اتنی نگرانی نہیں کی تھی جتنا میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے

رہتے تھے میں جتنا ان سے چھپتا پھرتا تھا وہ اتنا میرا پیچھا کرتے تھے ان کے اس رویے نے مجھے ان سے دور اور امی سے قریب تر کر دیا تھا۔

☆☆☆

میرا بخار اگلے روز ہی اتر گیا ساتھ ہی ابو جی کا محبت و شفقت بھرا رویہ پھر سے تشدد آمیز ہو گیا اور اگلی شام تک وہ مکمل طور پر سابقہ ابو جی بن چکے تھے مختلف حیلوں بہانوں سے مجھے ہڈ حرامی کام چوری اور مفت خوری کے طعنے دے چکے تھے اور مجھے دو تین بار یہ بھی کہا تھا کہ میری یہ دونوں خصلتیں موروثی نہیں بلکہ ان کی فارمیشن میں زیادہ تر ہاتھ امی مرحومہ کا بھی تھا کہ انہوں نے میرے گھناؤنے جرائم، پر پردے ڈال ڈال کر مجھے ناکارہ بنا دیا۔ میں چپ چاپ بستر پر لیٹا ان کے طعنے گھونٹ گھونٹ پیتا رہا۔

اسد کے ابو کتنے اچھے ہیں اسد نے تو مجھ سے ایک سال پہلے ماسٹر کیا تھا اب تک اسے ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی تھی اور وہ تین سالوں سے نا صرف اسے سہہ رہے ہیں بلکہ اس کا حوصلہ بھی بڑھاتے کہ آج نہیں تو کل اسے یقیناً اچھی نوکری مل جائے گی وہ ہمت نہ ہارے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے کبھی ہمارے ابو جی کی طرح ہراساں کرنے کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال نہ کیے تھے نہ اس کا جیب خرچ بند کر کے اسے کوڑی کوڑی کا محتاج کیا تھا اس لیے اسے بھی غم ہے بیروزگاری کا مگر آرام کے ساتھ!

اور ادھر تو ابو جی نے بستر میں بھی سوئیاں چبھو رکھی ہیں بندہ دو گھڑی سکون سے لیٹ بھی نہیں سکتا۔ میری بیروزگاری کا دکھ ہے اپنی پنشن کا زعم ہے بھلا میں کتنا کھا جاتا ہوں یا پہن اوڑھ لیتا ہوں جو سب کھاتے ہیں اسی میں سے دو تین روٹیاں اگر میں کھا لیتا ہوں تو کونسا گھر میں قحط پڑنے کا خطرہ پڑ جاتا ہے دونوں بھائی اتنی اعلیٰ پوسٹوں پر فائز ہیں آج میں ان سے کہوں تو وہ ہنس کر میرا خرچ برداشت کر لیں بلکہ اظہر بھائی نے تو ایک بار مجھے بہت ڈانٹنے پر ابو جی سے کہا بھی تھا کہ۔

''آپ عمر کو کچھ نہ دیا کریں میں دے دیا کروں گا۔'' تو انہیں اظہر بھائی کی یہ محبت بھی طعنہ لگی تھی۔

''میں ابھی زندہ ہوں جب مر جاؤں گا تو اس کے خرچے اٹھا لینا پھر دیکھوں گا کتنے دن سہارتے ہو اس سفید ہاتھی کو۔''

بھائی کا تو جو موڈ آف ہوا سو ہوا میرا دل چاہا کہ میں جا کر ریل کی پٹڑی پر اپنا سر دے ماروں۔

اور وہ رضوان کے ابو۔ دو بار رضوان نوکری کو لات مار آیا کہ باس کے ساتھ اس کی بن نہیں سکی تو اس کے ابو کو اس کی یہ اصول پسندی، کتنی بھائی تھی کہ میرا بیٹا بڑا خوددار ہے ابھی تک اسے تیسرا کوئی

باس پسند نہیں آیا پھر بھی اس کے گھر والے اسے بڑے مان سے بٹھا کر کھلا رہے ہیں۔

اور فہیم کے ابو تین سالوں سے پیرالائز ہیں تینوں بھائیوں نے باپ کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا ہے ایک سر دباتا ہے دوسرا منہ ہاتھ دھلاتا ہے تو تیسرا صبح و شام سیر کے لیے لے جاتا ہے اور ان تینوں کو دعائیں دیتے باپ کا منہ سوکھ جاتا ہے ساری دنیا واہ واہ کرتی ہے بیٹوں کی جانثاری اور خدمت گزاری دیکھ کر اور باپ کی شیریں گفتاری ایک مثال ہے ان دوستوں کے درمیان۔ ایک ہمارے ابو جی ہیں آج تک انہیں سر درد تک نہیں ہوا بندہ خدمت کیا کرے بھلا؟

''لاحول وقوہ۔'' میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی اپنی اس گھٹیا سوچ پر لعنت بھیجی ویسے یہ حقیقت بھی تھی کہ ابو جی آج تک کبھی ذرا سے بیمار بھی نہ ہوئے تھے بس ہر وقت ننگی تلوار بنے سب کے سروں پر لٹکتے رہتے۔

اور اگلے روز میں خوب دل لگا کر تیار ہوا۔ تازہ شیو کی نہا دھو کر سب سے اچھا سوٹ زیب تن کیا Identity کی آدمی شیشی اپنے اوپر انڈیلی دو دن کی بیماری سے اچھی خاصی طبیعت بیزار ہو گئی تھی اس لیے آج میرا دوستوں کے ساتھ لمبا چوڑا انجوائے منٹ کا پروگرام تھا۔

''کہاں جا رہے ہو۔'' دس بجے مجھے تک سک سے تیار ہو کر باہر جاتے دیکھ کر ابو جی نے پودوں کو پانی دیتے مجھے پیچھے سے پکارا۔

''جی وہ Abott لیبارٹریز کی طرف پچھلے ہفتے ایک ایڈ آیا تھا۔''

''ریجنل برانچ لیبارٹریز میں اسسٹنٹ کی ویکنسی خالی ہے اسی سلسلے میں آج انٹرویو ہے وہیں جا رہا ہوں۔'' میں نے سعادت مندی سے مہذب لہجے میں جواب دیا۔

''دیکھ لو لیبارٹریز میں انٹرویو ہے یا کسی نئی فلم کا پہلا شو دیکھنے جا رہے ہو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔

''ابو جی مجھے کوئی شوق نہیں ہے فلمیں دیکھنے کا۔ وہ تو فراغت سے تنگ آ کر کبھی کبھار کوئی دوست لے جاتا ہے تو چلا جاتا ہوں۔'' میں نے روشن دن جیسا سفید جھوٹ تلخی سے بولا۔

''خیر شوق تو تمہیں میری شکل دیکھنے کا بھی نہیں ہے مگر مجبوراً دیکھنی پڑتی ہے۔'' ان کا لہجہ ہنوز طنزیہ تھا۔ ''اور یہ تو مجھے پتا ہے کہ تمہیں کتنا شوق ہے اور کوئی تمہیں فلم دکھانے کے لیے مرا نہیں جا رہا ہوتا تم ہی یاروں کے یار بنے پھرتے ہو جس دن جیب خرچ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا پھر دیکھوں گا یہ بیکار معاش کتنے دن تمہارے گرد منڈلاتے ہیں۔'' انہیں یہی خوش فہمی تھی کہ ان کے چند سو روپوں پر سارے شہر کے بیروزگار عیش کر رہے ہیں۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے میں جاؤں۔" میں نے منہ بنا کر کہا اور ان کے ہونہہ پر قدم آگے بڑھا دیئے۔

"ویسے بیٹا جی یہ انٹرویو رات بارہ بجے سے پہلے اختتام پذیر ہو جائے گا نا۔" انہوں نے پیچھے سے پوچھا۔

"دیکھیے۔" میں نے ڈھٹائی سے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"بیٹا جی پھر میں نہیں آپ ہی دیکھیے گا کیونکہ پھر میں دیکھوں گا نہیں دکھاؤں گا۔"

ان کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"رات نو بجے کے بعد ادھر کا رخ نہ کرنا میں تمہیں صاف بتا رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔" میں نے سر ہلا کر کہا اور باہر نکل آیا۔

پھر انٹرویو تو ایسا ہی تھا جیسے میں اب تک بیسوں دے چکا تھا اپائنٹمنٹ پہلے سے ہو چکا ہوتا تھا انٹرویو کی فارمیلٹی نبھانے کے لیے یا شاید ہم جیسے بیروزگاروں کا مذاق اڑانے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا جاتا ہے کسی نے صحیح کہا ہے کہ "علم آگہی ہے اور آگہی اس کائنات کا سب سے بڑا عذاب ہے۔"

اور میں بھی آج کل اسی عذاب سے گزر رہا تھا پہلے پہل میں خوب ہرٹ ہوتا تھا جی بھر کر کڑھتا تھا کہ یہ انٹرویوز اور ٹیسٹ وغیرہ سب فراڈ ہیں جب میری کوالیفکیشن اتنی اعلیٰ ہے تو پھر میرے نہ سلیکٹ ہونے کی کیا وجہ ہے پھر ابو جی کے طعنے کئی بار انہوں نے میری ڈگریاں چیک کیں کہ کہیں نمبر دو، تو نہیں اتنی انسلٹ گھر میں بھی اور باہر بھی۔ کئی بار جان سے گزر جانے کا سوچا۔ مگر پھر جوں جوں وقت گزرتا رہا میں بھی ڈھیٹ ہو گیا اور اب یہ سارا پروسیجر مجھے اپنے سسٹم کا ایک حصہ لگنے لگا تھا ابو جی نے بھی شاید یہ کڑوا سچ مان لیا تھا اس لیے اب مجھ دیکھ کر انہیں کبھی کبھار ترس بھی آ جاتا تھا اور جو کسی نے کہا ہے کہ بیروزگار اور کاہل بیٹا چھٹی انگلی کی طرح ہوتا ہے کاٹو تو تکلیف ہوتی ہے رکھو تو عیب بنتا ہے اور ابو جی بھی اس مرحلے سے گزر کر اب وہ مجھے اپنی چھٹی عیب دار انگلی مان چکے تھے اور میں بھی زندگی کو As it is گزار رہا تھا۔

انٹرویو کے بعد میں اور اسد رضوان کے طرف چلے گئے اس کے گھر لنچ کیا ایک عدد مووی دیکھی پھر تینوں فہیم کی طرف چلے گئے اس کی بھابھی نے چائے کے ساتھ گرم گرم پکوڑے کھلائے اس کے بعد ہم چاروں ریس کورس کی طرف چلے گئے۔ آج موسم بہت اچھا ہو رہا تھا سردیوں کی نرم نرم دھوپ اب اپنے پر سمیٹ رہی تھی ہلکی ہلکی خنک ہوا بہت خوشگوار لگ رہی تھی ہم کچھ دیر باغ کی روشوں پر ٹہلتے رہے صبح کے انٹرویو پر مقدور بھر تبصرے کیے یونیورسٹی انتظامیہ سے لے کر گورنمنٹ کی پالیسیوں

میں ایک ہزار ایک کیڑے نکالے۔

"یار نوکری کو گولی مارو میں کہتا ہوں ہم چاروں کوئی اعلیٰ قسم کا بزنس کر لیتے ہیں۔" رضوان پر باغ کی پرفضا ماحول کا پہلا خوشگوار اثر ظاہر ہوا۔

"آئیڈیا تو بہت اچھا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بزنس کے لیے کچھ سرمائے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ میرے پاس تو ہے نہیں۔ ہاں اگر تم تینوں ایسی کوئی چیز رکھتے ہو تو میں رضا کارانہ شمولیت کے لیے تیار ہوں۔" فہیم نے فراخدلی سے کہا۔

"بھئی بزنس کے لیے بزی ہونا پڑتا ہے اور میرا تو ان سردیوں کو فارغ رہ کر انجوائے کرنے کا پروگرام ہے۔ سائنسدان کہہ رہے ہیں آئندہ چند سالوں تک زمین اور سورج کے درمیان قربت اتنی بڑھ جائے گی کہ سردی نہ ہونے کے برابر رہ جائے گی اس لیے جتنا ہو سکے ان مزیدار سردیوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے آنے والی نسلوں کو سردیوں کے متعلق بتانے کے لیے کوئی میٹریل تو ہو اور بھئی یہ بزنس نوکریاں وغیرہ تو سبھی کرتے ہیں ہم بھی کر ہی لیں گے۔" اسد نے بزنس نہ کرنے کا یونیک ریزن بتایا۔

"بالکل۔" رضوان اور فہیم نے یک زبان کہا۔ "ساری بات نصیب کی ہے۔ نصیب میں ہو گی تو نوکری خود چل کر آئے گی۔"

"آ گئی۔" اسد نے چونک کر کہا۔

"کون نوکری آ گئی۔" فہیم نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے اندھو نوکری کو گولی مارو وہ دیکھو سامنے سے قلوپطرہ آ رہی ہے۔ واہ کیا چال ہے۔"

اس نے سامنے سے آتی بلیک سوٹ میں ملبوس لڑکی پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

"قلوپطرہ۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "لعنت ہو تمہارے حسن انتخاب پر۔ میرا خیال ہے اپنی نظر چیک کراؤ۔ بیچاری قلوپطرہ کی روح کس اذیت سے گزری ہو گی تمہیں اندازہ ہے۔" میں نے افسوس سے کہا "اور اس کی اس چال میں بھی جوتے کا قصور لگتا ہے ورنہ ایسی چال کوئی نارمل انسان نہیں چل سکتا جھکا جھکا دائیں طرف ہے۔" وہ ایک واجبی شکل کی لڑکی تھی اسد پتا نہیں کیوں پھڑکا تھا۔

"دائیں طرف وہ رومیو جو ہے دونوں میں لگتا ہے جھگڑا ہو گیا ہے چلو صلح کروا دیتے ہیں۔" رضوان نے ایک ہی لمحے میں معاملے کو بھانپ لیا اور لڑکی کے دائیں طرف چلتے ہوئے ایک اسمارٹ سے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دفع ہو تم جا کر یو این او کے نمائندے، یہاں اپنے مسئلے حل نہیں ہو رہے۔"

اسد نے جل کر کہا "چلو کافی پیتے ہیں۔"

''انگور کھٹے ہیں۔'' فہیم گنگنایا تو ہم دونوں ہنس پڑے۔

پھر کافی پی گئی کچھ دیر گوسپ کی پھر نو بجے والا آخری شو جب ساڑھے بارہ بجے میں گیٹ پھاند کر دبے پاؤں اپنے کمرے کے دروازے کے پاس پہنچا کمرے کی لائٹ جل رہی تھی دروازے سے میں نے جھانک کر دیکھا ابو جی کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے میں خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور آرام سے جا کر گیسٹ روم میں سو گیا۔ اس وقت بچت کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

☆☆☆

امی بچپن سے لے کر آج تک میری ہر چھوٹی چھوٹی بے ضرر شرارتوں کے آگے ڈھال بن جایا کرتی تھیں۔ جب ایک بار میں اسکول کی فیس کے پیسے مزے سے کینٹین میں اڑا گیا تھا اور اگلے ماہ ڈبل فیس دو فائن کا نوٹس گھر آیا تو امی نے مجھے ہلکی سے ڈانٹ پلائی اور ایک ماہ کی فیس اور فائن اپنے پلے سے ادا کر دیا اور اس ہلکی سی ڈانٹ میں اتنا مزہ تھا کہ میں نے دو ماہ بعد پھر وہی حرکت کی ابو تک اطلاع پہنچے بغیر امی نے میری اس ننھی سی شرارت پر آرام سے پردہ ڈال دیا لیکن جب ایک ماہ چھوڑ کر تیسری بار پھر میں نے ایسا ہی کیا تو امی بدقسمتی سے بہاولپور ماموں کے پاس گئی ہوئی تھیں جب ڈبل فیس بھی پندرہ دن لیٹ ہو گئی تو بے صبرے پرنسپل نے ابو جی کو ان کے آفس فون کھڑکا دیا۔

اور شام کو جب امی گھر میں داخل ہوئیں تو میں تھپڑ زدہ سرخ چہرہ لیے مرغا بنا اپنے پچھلے سارے جرائم مان چکا تھا اور ابو جی چھڑی کو اپنی دائیں ٹانگ پر مسلسل مارتے ہوئے مجھے خود کو اور اپنے والد صاحب کو مسلسل سرکاری خطابات سے نواز رہے تھے اور اس شام کمرہ بند کر کے جتنی میں نے فیسیں ہضم کی تھیں ابو جی نے گن گن کر چھڑی کے ذریعے اتنی ہی اسٹیمپس میری کمر پر لگائی تھیں کہ پھر کبھی فیس کا لفافہ نہ غلطی سے مجھ سے ہضم ہو سکا اور نہ کسی اور پتے پر گم ہو سکا کیونکہ اس کے بعد دو ہفتے میں بستر سے اٹھ ہی نہ سکا تھا اور فیس کے لیے تو میں نے ہمیشہ کے لیے اپنا اعتبار گنوا دیا تھا پھر یونیورسٹی تک ابو جی نے کبھی ایک دھیلے کے لیے میرا اعتبار نہ کیا ہمیشہ دفتری مصروفیات کے باوجود میری فیس خود جمع کروائی۔

پھر دوسری یادگار چار چوٹ کی مار مجھے سکس کلاس میں تھا جب پڑی انگلش کا ٹیسٹ تھا میرا پین گھر رہ گیا تھا۔ عثمان پانی پینے باہر گیا تھا میں نے چپکے سے اس کی چیئر پر پڑے جیومیٹری بکس سے اس کا پارکر کا پین اڑا لیا جس کی وہ گزشتہ تین دنوں سے شو مار رہا تھا کہ ماموں نے لندن سے بھیجا ہے۔ ٹیسٹ شروع ہونے پر عثمان نے تو مس کی ڈانٹ کھاتے ہوئے پنسل سے ٹیسٹ دیا اور مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ بعد میں پین اس کے بیگ میں رکھنا بھول گیا اگلے روز اس بنیے کے بچے نے میڈم شازیہ عرف ہٹلر کی موجودگی میں جب اپنے پین کی تلاش میں سب کے بیگ کھنگالے تو وہ پین بڑے آرام سے

میرے بیگ کی بیرونی پاکٹ سے نکل آیا میڈم مجھے کان سے پکڑ کر پرنسپل کے آفس لے گئیں اور وہ پرنسپل نہ صرف بے صبرا تھا بلکہ کینہ پرور بھی تھا۔ اس نے پچھلی کلاس میں ہونے والی تمام چوریاں میرے کھاتے میں ڈالیں اور فوری طور پر ابو جی کو فون کر دیا۔

اور پھر اس شام امی کی التجائیں اور گڑگڑاہٹیں ابو جی کی جابر طبیعت کو موم نہ کر سکیں اور میں نے اس معصوم سی بے ضرر چوری کا اتنا بھیانک نتیجہ بھگتا کہ آئندہ کے لیے ہر قسم کی منقولہ وغیرہ منقولہ چوری سے توبہ کر لی۔

اور پھر سب سے آخری یادگار دھلائی جو ابو جی کے ہاتھوں میری ہوئی وہ تو مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی مجھے فرسٹ ایئر میں آئے بمشکل دو ماہ ہوئے تھے جب میں نے اپنی نوخیز جوانی، کا پہلا بھرپور عشق کیا تھا کالج کی نئی نئی آزادی ہم دوستوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھی اور ہم آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے تیسرے پیریڈ کے بعد ہی ہم نے کالج سے بھاگ آنا اور اپنے کالج سے تقریباً ایک میل دور گرلز کالج کے آگے کھڑے ہونا اور چھٹی تک وہیں کھڑے رہنا اپنا وطیرہ بنا لیا۔

انیلا بھی فرسٹ ایئر میں تھی وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ جب چھٹی کے وقت کالج سے نکلتی میں دوستوں کو وہیں چھوڑ کر چپکے سے ان کے گروپ کے پیچھے ہو لیتا۔ ان کا پیدل کا راستہ تھا اس کی تینوں فرینڈز تو تھوڑی دور جا کر موڑ مڑ جاتیں اور باقی کے راستے میں اس کی ہمراہی کی ڈیوٹی سنبھالی لیتا۔ راستہ سنسان دیکھ کر میں بالکل اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا تازہ دیکھی ہوئی انڈین فلموں کے گانے ے سرے سے گنگناتا کبھی پاس ہو کر ہمکلام ہونے کی کوشش کرتا۔ دو بار اسے لیٹر دینے کی کوشش کی انہیں ا کے ساتھ اپنا دل بھی اس کے قدموں میں رکھا مگر اس سڑیل ناک چڑی حسینہ نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہ تو دیکھا اور نہ میرے تحفہ دل کو قبول کیا۔

یہ سلسلہ کوئی دو ہفتے چلا ہو گا جب اچانک ابو جی کی چھٹی حس نے انہیں ہوشیار کر دیا وہ میری گیری کے لیے کالج چلے گئے۔ وہاں تین دن میں نے مکمل کلاسز اٹینڈ کی تھیں جن کے ذمے اٹینڈنس لگنے کی ذمہ داری لگا کر آتا تھا وہ بھی اگلے پیریڈ کے بعد بھاگ آتے تھے۔

ابو جی پولیس کی جیپ میں اسی وقت میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور میں کون سا سوئی انہیں نہ ملتا گرلز کالج سے محض دس منٹوں کے فاصلے پر جب میں انیلا کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے میں تقریباً کامیاب ہو چلا تھا جب اچانک پیچھے سے نوے کی اسپیڈ پر دوڑتی ہوئی جیپ ہم دونوں کے سروں پر آن لی۔

''سر سر دیکھیں یہ لڑکا مجھے بہت دنوں سے تنگ کر رہا ہے پلیز میری مدد کریں۔''

میں تو ابھی اپنے اوسان ہی درست کر رہا تھا کہ اس مکار حسینہ نے میری اتنی دنوں کی
محبت کو پل بھر میں بازاری بنا دیا اور اس کی فریاد پر ابو جی جیپ سے چھلانگ لگا کر نیچے اتر آئے اور
جو بھاگنے کی سوچ رہا تھا انہیں دیکھ کر میرے پیر زمین میں گڑ گئے۔

ابو جی نے مجھے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس چھپکلی کو گھر چھوڑنے کی آفر کی جس کو اس
فوراً قبول کر لیا اسے اس کے گھر اتار کر پانچ منٹ کے راستے میں اس نے میرے کردار میں کوئی پانچ
بیل بوٹے جڑ دیے اور ان بیل بوٹوں کو جو ابو جی نے گھر جا کر پانی دیا وہ بانس کے درخت کی طرح
لخت کئی فٹ بلند ہو گئے اور اس چار چوٹ کی مار کے کانٹے آج بھی میری روح میں گڑے ہیں،
سالوں بعد آج بھی اگر کسی لڑکی کی طرف غور سے دیکھنے کی کوشش کروں تو میری آنکھوں کے سا
قرمزی تارے چمکنے لگتے ہیں یونیورسٹی میں بھی لڑکیاں مجھے اتنا بے ضرر سمجھتی تھیں کہ کوئی مجھ سے نہ
ڈرتی تھی۔

اللہ میاں نے مجھے بہن کی محرومی دی تھی ابو جی کی مار نے اس کی کمی کو ہمیشہ کے لیے ایسا
کیا کہ آج تک مجھے اس کی کمی کا احساس نہیں ہوا کیونکہ اس مار کے بعد سارے جہاں کی لڑکیاں مجھے
بہن لگنے لگیں۔

اور یہ کہ پہلی محبت ہمیشہ یاد رہتی ہے مجھے اس مقولے پر آج بھی اپنے وجود سے زیادہ یقین
ہے اور میری وہ پہلی محبت آج بھی آخری ہے۔

ان سب باتوں نے میرے اندر اس خیال کو جما دیا کہ اگر کوئی کہے کہ اس روئے زمین پ
جی سے بڑھ کر کوئی جابر شخص ہے تو میں کہوں گا کہ اس شخص سے بڑا جھوٹا بھی روئے زمین پر کوئی نہیں
گا۔

یہ نہیں تھا کہ اظہر اور مظہر بھائی بے حد شریف تھے اور فطرت کی یہ خباثتیں صرف میرے
تھیں بلکہ ان خباثتوں میں میرے بھی کان کترتے تھے لیکن چونکہ وہ مجھ سے بڑے تھے نہ صرف عمر
بلکہ عقل میں بھی، اس لیے صاف بچ جاتے انہوں نے اپنا طریقہ واردات اس قسم کا رکھا تھا کہ ا
جائے وقوع ابو جی کے رینج سے کم از کم دو ہزار فٹ کے فاصلے پر ہوتا تھا۔ وہ کبھی رنگے ہاتھوں نہ پکڑ
گئے تھے اور میں ہمیشہ عین موقعہ واردات پر پکڑا جاتا یہی میری بدقسمتی تھی اسی وجہ سے بہت عرصہ تک
جی ان دونوں کو نہایت شریف اور بے ضرر سمجھتے رہے تھے اور میرے بارے میں ان کا خیال تھا کہ م
بنیادوں میں آلودہ پانی چلا گیا ہے۔ جس کی نکاسی کا اہتمام وہ اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔

ان کے اس رویے نے مجھ سے زندگی کا ہر مزہ، چھین لیا تھا صرف امی کی محبت مجھے جی

مجبور کرتی تھی ورنہ میں تو نا معلوم کب کا اس سنگدل دنیا سے منہ موڑ چکا ہوتا مگر امی پر بھی ان کے مظالم کچھ
کم نہ تھے بلکہ ابو جی جیسے سخت گیر شخص کے ساتھ زندگی گزارنا عمر قید با مشقت سے کم نہ تھا اور صبر عظیم کا یہ
سبق میں نے امی ہی سے سیکھا تھا!

☆☆☆

اور صبح جب اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ابو جی کے کمرے میں جھانکا تو وہ پانی
کے ساتھ کوئی دوائی نگل رہے تھے۔ ”یہ صبح صبح کون سی دوا کھا رہے ہیں۔“ مجھے ایک لمحے کو فکر نے گھیرا پھر
میں نے سر جھٹک دیا ”یقیناً وٹامن کی گولیاں لے رہے ہوں گے انہیں تو کبھی معمولی سا سر درد نہیں ہوا۔
دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو لمبی واک کرتے ہیں صبح کو ہلکی پھلکی ایکسرسائز بھی کرتے ہیں اپنی خوراک کا
بے حد خیال رکھتے ہیں اس عمر میں بھی ان کی صحت قابل رشک ہے۔“ یہی کچھ سوچتے ہوئے میں نے
کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں گھس گیا۔

اور تھوڑی دیر بعد جب میں بالوں میں برش کر رہا تھا تو وہ کمرے میں داخل ہوئے میرے
ہاتھ سے برش چھوٹ کر ڈریسنگ ٹیبل پر گر گیا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ بے حد سنجیدہ ہو
رہا تھا میں دل ہی دل میں جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرنے لگا۔

”رات کتنے بجے آئے تھے۔“ وہ کافی دیر بعد گمبھیر آواز میں بولے۔

”ساڑھے بارہ بجے۔“ میں کوشش کے باوجود جھوٹ نہ بول سکا۔

”ہوں، کھانا کھا لیا تھا۔“

”جی۔“

”کل انٹرویو کیسا ہوا تھا۔“ ان کی طبیعت مجھے واقعی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”بس ایسے ہی۔“ میں نے بھی ان کے سادہ سادہ سوالوں سے نڈر ہو کر بیڈ کے کنارے پر
ٹک گیا۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”انٹرویو تو اچھا ہی ہوتا ہے میرا۔ آپ کو پتا ہے۔“

”ہاں تبھی تین سالوں سے کسی نے ایک بار بھی آفر نہیں کی نوکری کی۔“ وہ سلگے۔

”تو اس میں میرا کیا قصور۔“ میں نے بھی دو بدو جواب دیا۔

”انٹرویو کیا رات بارہ بجے تک تھا۔“ انہیں پھر رات یاد آ گئی۔ میں چپ رہا۔

”ایسے کب تک کرتے رہو گے زندگی یوں نہیں گزرتی۔“ وہ کچھ دیر بعد بولے۔

"گزر تو رہی ہے۔" میں نے دل میں کہا۔

"تم کوئی بزنس کرلو۔" مجھے جیسے جھٹکا لگا۔

"بزنس کیا ہوا سے ہوتا ہے پیسہ چاہیے ہوتا ہے۔"

"پیسے کی خیر ہے پارٹنر شپ کرلو کسی کے ساتھ۔"

"ابو جی آپ کو پتا ہے مجھے بزنس وغیرہ کی سمجھ کہاں، ہماری سات پشتوں میں بھی شاید بزنس مین نہیں تھا۔" میں نے جیسے انہیں سمجھایا۔

"بزنس مین تو شاید ہو مگر تم جیسا نکما بھی کوئی نہیں تھا۔" وہ مجھے گھور کر بولے۔

پھر ہم دونوں چپ کر گئے۔

"نوکری تمہیں مل نہیں رہی بزنس تم کرنا نہیں چاہتے پھر۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا آج ان کا موڈ کچھ فیصلہ کن سا لگ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے تم شادی کرلو۔" انہوں نے بم کا دھماکا میری سماعتوں کے پاس کیا، میں کھلا کا کھلا رہ گیا کل شام تک بھی ان کا بنیادی طعنہ یہ تھا کہ کم از کم اس شہر میں مجھے کوئی عزت دار شخص بیٹی نہیں دے گا اور آج۔

"ابو جی آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" میں نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

"پاگل نہیں ہوا ابھی میں البتہ تمہاری فکر مجھے پاگل کر دے گی۔" وہ جل کر بولے۔

"آپ فکر نہ کریں اللہ مالک ہے۔" میں نے اپنے تئیں انہیں تسلی دی۔

"میرا خیال ہے تم عائزہ سے شادی کرلو۔" میں ابھی ان کے پہلے جھٹکے سے نہیں سنبھلا انہوں نے مجھے ہزار وولٹ کا ایک اور جھٹکا دیا۔

"کیا، کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" میں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ "آپ کو پتا ہے زہر لگتی ہے مجھے۔" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کبھی آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے کون سے سرخاب کا پر جڑے ہیں تم میں شکر کرو بات پر۔" انہوں نے ملامتی انداز میں کہا۔

"جی آپ کی بڑی مہربانی۔ میں جیسا ہوں خوش ہوں بلکہ آپ کی بھانجی کے قابل ... میں نے بھی ادھار نہ رکھا۔

"بہر حال میں نے سوچا ہے کہ اب دو ماہ میں عائزہ سے تمہاری شادی کر دوں عورت کے نصیب سے بھی رزق مل جاتا ہے اس کے علاوہ تو تم میں احساس ذمہ داری پیدا

انہوں نے مجھے ذمہ دار بنانے کا انوکھا کلیہ دریافت کیا۔

"ابو جی بس بہت ہو گیا۔" میں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"اور اگر مجھے ذمہ دار بننا ہی ہوا تو کم از کم عائزہ نہیں۔ وہ مغرور لڑکی خود کو پتا نہیں کیا سمجھتی ہے۔ ہونہہ۔" آخری فقرہ میں نے دل میں کہا اور باہر جانے لگا۔

"بات سنو میری غور سے۔" وہ زور سے بولے "تمہارے پاس صرف پندرہ دن ہیں اس بات پر غور کرو اور جواب ہاں میں ہونا چاہیے اب میں بہت عرصہ تک تمہاری یہ غیر ذمہ دارانہ حرکات برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ کھڑے ہو گئے۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی ابو جی۔ یہاں میں اپنا خرچ اٹھانے کے قابل نہیں اور آپ کسی اور کی ذمہ داری مجھ پر ڈال رہے ہیں کیا آپ اس کا بھی خرچ اٹھا لیں گے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہاں اٹھا لوں گا تمہیں بھی تو جھیل رہا ہوں۔ مگر اب میں نے اس کام کا فیصلہ کر لیا ہے تم بھی سوچ لو۔" وہ پتا نہیں کیا ٹھانے بیٹھے تھے۔

"پتا نہیں کیسی باتیں کر رہے ہیں اور میں اس نک چڑی کے ساتھ چند منٹ نہیں گزار سکتا اور آپ پوری زندگی کی بات کر رہے ہیں بھانجی ہو گی آپ کی میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں آئی ایم سوری۔" میں نے کڑوے لہجے میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

صبح صبح یہ نیا شوشا چھوڑ کر انہوں نے میری طبیعت مکدر کر دی تھی ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل آیا کتنی دیر یونہی فٹ پاتھ پر چلتا رہا سوچ سوچ کر خون جلاتا رہا پھر بھوک نے ستایا تو اسد کی طرف چلا آیا وہ ابھی تک بستر میں اینٹھ رہا تھا مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ پھر جتنی دیر تک وہ نہا دھو کر تیار ہوا اور اس کا ناشتا آیا میں اتنی دیر تک اس کی نیو البمز ڈیک میں لگا لگا کر اپنا غم غلط کرتا رہا۔

ناشتے کے بعد حسب معمول ہم آوارہ گردی کے لیے سڑک پر نکل آئے۔

"کیا بات ہے تمہارا منہ کیوں سوجا ہوا ہے۔" کچھ دیر یونہی ٹہلنے کے بعد اسد نے پوچھ ہی لیا۔

"ایسے ہی۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"ایسے ہی کیا۔ ایسے ہی اگر منہ سوجنے لگیں تو میرا بھی سوجا ہونا چاہیے تھا۔" اس نے ٹوکا۔

اس کے اصرار پر میں نے ابو جی کے نازل کردہ نئے فرمان کے بارے میں بتا دیا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اتنی اچھی کہ اس کا خیال میرے بے حس گھر والوں کو بھی نہیں آیا اور تمہارے ابو جی اوپر سے اتنے سخت ہیں اندر سے تمہارے لیے اتنے اچھے خیالات رکھتے ہیں ویری گڈ

آئی لائیک دا آئیڈیا۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"بکواس نہیں کرو یہ بہتری ہے یہاں اپنے کھانے کے لالے پڑے ہیں اٹھا کر ایک اور ڈھول گلے میں ڈال لو اور ٹن ٹن بجاؤ۔ اصل میں ابو جی نے یہ بھی میری سزا کا ایک طریقہ ڈھونڈا ہے تا کہ میری ذلت میں جو کسر باقی رہ گئی ہے وہ اس طرح پوری ہو جائے لیکن میں ان کی یہ چال کامیاب نہ ہونے دوں گا۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"لو بھئی تمہاری کھوپڑی تو واقعی الٹی ہے۔ وہ تمہارا بھلا کرنا چاہ رہے ہیں اور تم نہ جانے کیا سمجھ رہے ہو ویسے بھی والدین ہمیشہ اولاد کا اچھا ہی سوچتے ہیں۔" اس نے جیسے مجھے بڑے پتے کی بات بتائی۔

"وہ اور والدین ہوں گے تمہیں میرے والد صاحب کی محبت کا پتا ہے انہوں نے آج تک مجھے ایسا نہیں کرنے دیا جس میں میری خوشی ہو۔ کپڑوں کی چوائس سے لے کر اسکول سبجیکٹس تک۔ میں بلیک ٹراؤزر لینا چاہتا وہ بلو لے کر دیتے کیونکہ ان کا خیال تھا وہ مجھ پر سوٹ کرتی ہے میں جس کلر کی شرٹ لینا چاہتا وہ اس کے بالکل الٹ رنگ کی لیتے کیونکہ ان کی پسند مجھ پر زیادہ سوٹ کرتی تھی پرفیوم تک اپنی پسند کا لے کر دیتے اسکول لیول سے لے کر یونیورسٹی تک انہوں نے اپنی پسند کے مضمون مجھے رکھوائے۔

اور اب شادی بھی ان کے خیال میں میرے لیے سودمند ہے بھانجی کو میرے سر منڈھ کر بہن کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہیے بھائیوں نے اپنی پسند سے شادیاں کیں انہیں کچھ نہیں کہا ساری پابندیاں میرے لیے ہیں میں ان کی پسند پر سر جھکا دوں اور پھر وہی دن رات کے طعنے شروع کر دیں گے ان حالات میں آنے والی کی نظروں میں بھلا میری کیا عزت ہوگی۔" بچپن سے لے کر آج تک ان کی محبت کا ایک ایک انداز میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

"اچھا انہوں نے جو یہ سب کچھ تم پر مسلط کیا اور تم کرتے چلے گئے کبھی تم نے ان سب کے کرنے پر کوئی بہت بڑا نقصان برداشت کیا۔ سارے دوستوں میں سب سے اچھی ڈریسنگ تمہاری ہوتی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تمہاری نہیں تمہارے ابو کی چوائس ہوتی تھی اور اسکول لیول سے لے کر یونیورسٹی تک تمہارا رزلٹ ہمیشہ بہت اچھا رہا ہے اگر تم اپنی پسند کے سبجیکٹس رکھتے تو شاید اتنا اچھا رزلٹ شو نہ کر پاتے۔

تم خوش قسمت ہو کہ وہ تمہیں اس حد تک سمجھتے ہیں کہ تمہارے ذہنی رجحان کو ہمیشہ انہوں نے مد نظر رکھا جبکہ تمہیں پتا ہے کہ میرے ابو پڑھے لکھے تو ہیں مگر انہوں نے کبھی میری تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ اوٹ پٹانگ لباس پہنے محض اس لیے کہ وہ فیشن میں

ہوتے تھے چاہے وہ مجھ پر سوٹ کرتے یا نہ کرتے یہ تو اب کہیں جا کر عقل آئی ہے کہ انسان کو وہی کچھ پہننا چاہیے جو اس کی شخصیت کو ڈیسنٹ بنائے اور اسکول لیول سے لے کر یونیورسٹی تک میں نے چار سبجیکٹس بدلے اسی لیے ہر لیول پر میرا رزلٹ مختلف ہوتا تھا کبھی بہت اچھا اور کبھی بالکل لو اور تم اس معاملے میں لکی ہو کہ تمہارے ابو تمہیں اتنا سمجھتے ہیں۔" اس نے مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھا۔

"ہونہہ سمجھتے ہیں رہنے دو۔ سمجھتے ہوتے تو یہ نہ سمجھ جاتے کہ نوکری نہ ملنے میں میرا کوئی قصور نہیں اور اگر ہے بھی تو اس قدر نہیں کہ مجھ پر کسی انتہائی ناپسندیدہ ہستی کو مسلط کر دیا جائے۔"

"کون؟" اسد نے چونک کر پوچھا۔

"کوئی نہیں چھوڑو۔" میں نے اکتا کر کہا اور میں کون سا مان جاؤں گا یہ کوئی شرٹ یا ٹائی کا معاملہ تو نہیں کہ میں ڈر کر ہاں کر دوں گا۔"

"کیا زیادہ اصرار کر رہے ہیں۔" اسد نے تشویش سے پوچھا۔

"کریں بھی تو کیا۔" میں نے بے فکری سے کہا "ویسے پندرہ دن سوچنے کے لیے دیے ہیں۔"

"پھر۔"

"پھر کیا۔ میری طرف سے صاف انکار ہے یار یہ کوئی مذاق ہے بھلا اپنے جیب خرچ کے لیے بھی ان کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں بعد میں بیوی کے لیے بھی بھائیوں اور ابو جی کی جیبیں ٹٹولوں گا۔ توبہ کرو۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"انہوں نے کچھ تو سوچا ہوگا۔"

"سوچتے رہیں۔" میں نے کندھے اچکائے ارے ہاں اسد یار تم کہہ رہے تھے کیوں نہ ہم شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے چلیں ہم چاروں۔ آج کل وہاں موسم بڑا زبردست ہو رہا ہوگا" مجھے یکا یک خیال آیا۔"

"ہاں موسم تو اب خاصا کھل گیا ہے وہاں جانے کے لیے آئیڈیل سیزن ہے بات کرتے ہیں فہیم اور رضوان سے۔" اسد نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

"پیسوں کا بندوبست ہو جائے گا۔" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"کر لیں گے کچھ نہ کچھ۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"پھر میں نے اظہر بھائی کو ابو جی کے پاس سفارش کے لیے بھیجا۔ وہ آرام سے مان گئے مگر جاتے جاتے مجھے یاددہانی کرا دی کہ" وہ بات جو میں نے تم سے کہی ہے اس پر سوچنا اس لیے دو ہفتے سے

زیادہ نہ لگاتا۔“ میں نے سر ہلا دیا۔ اسی مسئلے سے بچنے کے لیے تو میں یہاں سے بھاگ رہا تھا۔

☆☆☆

پیسوں کے لیے میں نے تقریباً ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلائے تھے۔ اظہر بھائی م
بھائی شہلا بھابھی اور حتیٰ کہ بینا بھابھی کے آگے بھی وہ چاروں اپنا کماتے تھے انہوں نے بلا حیل وحج
مجھے پیسے دے دیے اور ابو جی نے بھی۔ واقعی یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا
ان تینوں نے بھی اپنے اپنے گھروں سے اسی طرح رقوم اینٹھیں۔

اسد کے ماموں اسلام آباد ہوتے تھے ہم نے وہاں سے ان کی گاڑی لی، رضوان بڑا ا
ڈرائیور تھا مری سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد پہنچے۔ مانسہرہ تک یہ گاڑی ہمارے ساتھ رہی پھر وہاں س
آگے کی دشوار گزار ڈرائیونگ کے لیے ہم نے جیپ ہائر کی اور ایک عدد گائیڈ بھی۔ یہ سفر میری زندگی کا
گار سفر تھا کہ اس میں کہیں بھی ابو جی کا نگران سایہ میرے ہمراہ نہ تھا ایک عجیب سا آزادی کا طمانیت بخ
احساس تھا ساری تلخیاں، پریشانیاں اور فرسٹریشن ہزاروں میل نیچے میدانی علاقے میں رہ گئی تھیں مان
سے وادی کاغان سوات اور جھیل سیف الملوک کے چھوٹے سے چھوٹے دلکش نظارے ہم نے خو
خوب انجوائے کیے۔ جنگلوں میں گھری دلکش و سرسبز وادیاں ہمیں مادی دنیا سے بہت دور لے گئیں پتا
نہ چلا اور پندرہ دن گزر گے۔

سترہ دن کے انتہائی خوشگوار سفر کے بعد ہم گھر لوٹے۔ دو دن تو آرام میں گزر گے۔ گھر
حالات ویسے ہی تھے جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا وہی صبح وہی شام۔ دونوں بھائیوں اور بھابھیوں کی
مصروف سی روٹین، لیکن ابو جی میں مجھے کچھ تبدیلی سی نظر آ رہی تھی انہوں نے صاحباں کو جیسے اس
حال پر چھوڑ دیا تھا وہ اپنی مرضی سے صفائی کرتی اور آدھے گھنٹے میں ان کی آنکھوں کے سامنے فار
کر بھاگ جاتی۔ بٹلر کو ڈانٹنا ڈپٹنا کچن کے سامان کی چیکنگ کرنا اور جاتے ہوئے اس کی خورد بینی نظر
سے تلاشی لینا کم کر دیا تھا وہ مجھے کچھ کمزور لگ رہے تھے البتہ لہجے کا دبدبہ اور رعب اسی طرح قائم تھا۔

رات کو اظہر بھائی اور شہلا بھابھی ساڑھے بارہ بجے کے قریب ایک دوست کی ڈنر پارٹی
لوٹے تو ابو جی نے کھڑے کھڑے ان دونوں کی وہ عزت افزائی کی کہ انہیں کہیں بھاگنے کا رستہ نہیں مل
تھا شہلا بھابھی بالآخر چمک اٹھیں۔ اظہر بھائی کو باپ کا کچھ لحاظ یا ڈر تھا شہلا بھابھی کے ساتھ ایسا
مسئلہ نہیں تھا۔

”ابو جی ہم اپنی مرضی کے خود مالک ہیں آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ ہمیں آتے جا
یوں ذلیل کریں۔ ہم اپنا کماتے ہیں اپنا کھاتے ہیں کسی کو اس کا دکھ نہیں ہونا چاہیے یہاں رہتے ہی

اگر آپ کہتے ہیں تو ہمیں ہمارا حصہ دیں گھر میں سے ہم کہیں اور انتظام کر لیتے ہیں۔“ ان کا لہجہ تمیز اور ادب کی ساری حدیں پھلانگ گیا۔

”بہت خوب اظہر۔ خوب بیوی کو چھوٹ دے رکھی ہے اور سنو بی بی یہ کھانے کمانے کا اتنا مان نہ کرو یہ وقت سب پر آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور جو تمہاری طرح اس کے تکبر میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ان کے چہروں کو مسخ کر جاتا ہے کہ پھر ان کی اولاد بھی ان سے گھن کھانے لگتی ہے تمہیں ابھی یہ میری باتیں سمجھ نہیں آئیں گی لیکن جب آئیں گی تو تم کسی کو سمجھا نہ سکو گی۔

اور حصہ میں تمہیں کس بات کا دوں ذرا سمجھاؤ تو مجھے ایسا کیا تم نے کارنامہ انجام دیا ہے کہ میں تمہارے لیے اپنی چار دیواری کا بٹوارہ کر دوں میری مرضی ہو گی تو تمہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گا اپنی کمائی کا اتنا غرور ہے تو جا کر اپنا بندوبست کر لو۔

شریفوں کے گھروں کے دروازے آدھی رات کے بعد بند ہو جاتے ہیں یہ میرا گھر ہے یہاں وہی کچھ ہو گا جو میں چاہوں گا اور مجھے اپنے چند سو روپوں سے نہ ڈراؤ۔ اتنے نوٹوں کو تو میں نے ٹھوکروں میں رکھا ہے کبھی اپنی صاف ستھری کمائی کو غلاظت کے چند سکوں کے عوض غلیظ نہیں کیا۔“

ان کی طیش بھری بلند آواز سن کر مظہر بھائی اور بینا بھابھی بھی باہر آ گئے بینا بھابھی نے اس وقت بھی پنسل ہیل پہن رکھی تھی حالات کی نزاکت کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی اور یہ ساری کاروائی میرے کمرے کے دروازے کے آگے ہو رہی تھی میں دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔

”تو آپ کا مطلب ہے ہم حرام کماتے ہیں رشوتیں کھاتے ہیں۔“ شہلا بھابھی تڑپ اٹھیں۔

”یہ تو تمہیں پتا ہو گا کیونکہ جس بے دردی سے تم اس پیسے کو لٹاتے ہو اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ اس کو کمانے میں تم نے کوئی تکلیف نہیں اٹھائی یہ آرام سے تمہاری جیبوں میں آ گیا اور Easy come Easy go میں تو یہی کہوں گا۔“ انہوں نے آرام سے کہا۔

”بس ابو جی بہت ہو گیا یہاں رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری کوئی عزت ہی نہیں۔“ اظہر بھائی شہلا بھابھی کے گھورنے پر ذرا ہمت کر کے اونچی آواز میں بولے۔

”تمہاری عزت کا تو مجھے پتا ہے بیوی کے جوتے پالش کرنے والے۔“ پولیس والوں کا طرہ امتیاز یہی تو ہے کہ ان کی زبان کے آگے کوئی ناکہ نہیں ہوتا۔

”چلیں آپ بہت ہو گیا اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“ شہلا بھابھی نے طیش میں آ کر اظہر بھائی کا بازو کھینچا اور تن فن کرتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”یہاں رہنا ہے تو میرے اصولوں کی پابندی کرنی ہو گی ورنہ دروازہ کھلا ہے کل اتنی دیر کی تو

بیل دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی، تمہیں، سامان باہر گیٹ پر ہی مل جائے گا تمہیں۔'' ابو جی نے ان کے پیچھے جلتی ہوئی پھلجھڑی پھینکی۔ اظہر بھائی نے مڑ کر کچھ کہنا چاہا مگر پھر ابو جی کی خونخوار نظروں کو دیکھ کر واپس مڑ گئے مظہر بھائی اور بینا بھابھی سین کے ٹھنڈا پڑ جانے پر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے گہرا سانس لیا اور اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔

''ہاں تو صاحبزادے بہت اچھے دن گزار کر آئے ہو خوب عیش کیے ہیں آنکھوں کو بھی تراوٹ پہنچی طبیعت بھی بحال ہوئی۔'' ان کی اچانک آواز پر میں اچھل ہی پڑا وہ کمرے کے عین وسط میں آ کر کھڑے ہو گئے ''اگر ان پر فضا وادیوں نے تمہاری یادداشت پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ ڈالا ہو تو میں یاد دلاؤں کہ میں نے جانے سے پہلے آپ سے کیا فرمایا تھا۔'' بھائی اور بھابھی کی دھلائی کے بعد بھی ان کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی اس لیے وہ میرا سانس خشک کرنے چلے آئے۔

''جی۔'' میں نے تھوک نگلا۔

''کیا جی۔'' وہ تنک کر بولے ان کا لہجہ صاف ڈرانے والا تھا۔

''مجھے یاد ہے۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''صرف یاد ہے یا کچھ سوچا بھی ہے۔'' انہوں نے اوپر سے نیچے تک مجھے گھورا۔

''ابو جی ابھی تو نوکری۔'' میں منمنایا۔

''بھاڑ میں گئی تمہاری نوکری۔'' وہ زور سے بولے۔ ''اس وقت نوکری کی کوئی بات نہیں ہو رہی۔ میں نے تم سے عائزہ کے متعلق جو کہا تھا وہ پوچھ رہا ہوں اس کے بعد نوکری کے بارے میں سوچنا۔'' بچے، بادشاہ اور بوڑھے اپنی ہٹ کے پکے ہوتے ہیں کسی بات پر اڑ جائیں تو پھر انہیں کوئی نہیں ہلا سکتا۔

''ابو جی پلیز۔'' میں گڑگڑایا۔

''دیکھو عمر بہت ہو گئی۔ اب تمہیں سنجیدہ ہونا ہی پڑے گا ورنہ مجھے تمہارے ساتھ زبردستی کرنی پڑے گی اور تم جانتے ہو۔'' ان کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''آپ کو پتا ہے مجھے عائزہ بالکل پسند نہیں وہ......'' میں نے کہنا چاہا۔

''کیا کیڑے پڑے ہیں عائزہ میں بھائیوں کی طرح پر کٹی کبوتریاں لانا چاہ رہے ہو جنہوں نے گھر کو بھی ہوٹل بنا رکھا ہے جواب ان دونوں کے بس کی بھی نہیں ہیں۔ عائزہ نہیں تو کوئی بھی نہیں پھر جدھر چاہے منہ مارو میری طرف سے خود کو فارغ سمجھنا یہ میرا آخری فیصلہ ہے چاہے ابھی مان جاؤ چاہے کچھ دنوں بعد۔'' وہ حتمی انداز میں بولے۔

''ابو جی مجھے کچھ وقت دیں۔'' کافی دیر بعد میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے پندرہ دن اور لے لو۔'' وہ فراخدلی سے بولے۔

''نہیں ایک ماہ۔''

''تمہیں وقت کی قدر نہیں ہے پندرہ دنوں سے آگے پندرہ دن اور ہوں تو مہینہ بنتا ہے مگر تمہارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بہر حال اگر تم ایک ماہ چاہتے ہو تو ایسے ہی سہی۔ مگر اس کے بعد ایک منٹ بھی نہیں۔ تم نے خود کو صرف ذہنی طور پر تیار کرنا ہے ورنہ فیصلہ تو میں کر چکا ہوں۔''

واقعی فیصلہ تو وہ کر چکے تھے مجھے تو محض چھیڑ رہے تھے میں نے جل کر سوچا۔

''اب سو جاؤ اور ایک ماہ میں سنجیدگی سے اس بارے میں سوچو اور ملازمت کے بارے میں بھی اب ایسا بھی اندھیر نہیں کہ کہیں تمہاری جگہ نہ ہو اپنی جگہ ڈھونڈو تبھی زندگی کی حقیقت کو جانو گے کوئی تمہیں اپنی جگہ میں سے ایک انچ بھی نہیں دے گا خود ہاتھ پیر مارو۔ یہ دوستیاں اور یاریاں تو سب وقت گزاریاں ہوتی ہیں برا وقت آ جائے تو سب سے پہلے ہی منہ موڑتی ہیں اس وقت کے آنے سے پہلے سنبھل جاؤ تو بہتر ہے اب سو جاؤ۔'' وہ جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح اچانک باہر نکل گئے اور جس طرح کی سوچیں وہ مجھے دے گئے تھے اس کے بعد سونا کس کافر نے تھا۔

☆☆☆

اس وقت میں فرسٹ ایئر میں تھا جب سعدیہ پھوپھو کے گھر کی چھت گر گئی جانی مالی نقصان تو اتنا نہ ہوا مگر اس چھت کے گرنے سے پھوپھو اپنے چاروں بچوں سمیت ہماری گھر اٹھ آئیں یہاں ابو جی کی سخت گیر طبیعت کے ہاتھوں امی پہلے ہی گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہی تھیں پھوپھو کے آ جانے سے گویا نہلے پہ دہلا ہو گیا پھوپھو ایک ایک بات نمک مرچ لگا کر ابو جی کو بتاتیں ابو جی تو پہلے ہی سوا نیزے پر سوار رہتے تھے آملیٹ میں نمک تیز ہو جاتا وہ امی کی سات پشتوں کے بخیے ادھیڑ جاتے قمیص کے کالر پر ذرا سی میل لگی رہ جاتی وہ پل بھر میں امی کی ساری خدمتوں پر پانی پھیر دیتے۔

امی رات کو دودھ ٹھنڈا دے جاتیں تو نانی مرحومہ ساری رات قبر میں کروٹیں لیتے بتا دیتیں ہوں گی۔ پھوہڑ ماں کی بدسلیقہ بیٹی۔ یہ ایک عام سا جملہ تھا جو ابو جی دن کے ہر گھنٹے میں چار بار دہراتے تھے اور امی کو بھی ان کے اس جملے سے اب کوئی اختلاف نہیں رہا تھا۔

سعدیہ پھوپھو بھائی کے مزاج کے بالکل برعکس تھیں بھائی کے آگ بگولہ غصے کے برعکس ان کا مزاج ٹھنڈا ٹھار تھا تینوں بھتیجوں کو دن میں کئی بار ساتھ لپٹا لپٹا کر پیار کرتیں امی کا بھی ہاتھ بٹاتیں بلکہ اس نک چڑھی عائزہ کو بھی اکثر ساتھ لاتیں۔ وہ اس وقت نائنتھ میں تھی ان کے اتنے میٹھے رویے کے

باوجود امی کو سعدیہ پھوپھو ذرا اچھی نہیں لگتی تھیں جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں اس طرح ایک سلطنت کے دو حکمران نہیں ہو سکتے اس وقت شاید امی کے بھی ایسے ہی خیالات تھے اور سعدیہ پھوپھو خبر ہی نہ ہوتے دیتیں نہ جانے کس وقت ابو جی کے کانوں میں زہر اتار جاتیں اور وہ بات بے بات بھڑ کنے لگتے امی رونے لگتیں حالانکہ میرے خیال میں ابو جی کا رویہ امی کے ساتھ پھوپھو کے آنے سے کچھ بہتر ہو گیا تھا جھاڑ جھنکار کچھ کم ہونے لگی تھی لیکن اس کے باوجود ابو جی کے ذرا اونچا بولنے سے امی رونے لگتیں شاید حساس زیادہ ہو گئی تھیں یا پھوپھو کے سامنے زیادہ انسلٹ محسوس کرنے لگی تھیں۔ وجہ بہرحال کچھ بھی تھی وہ خود کو جیسے بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھیں اور مجھے لگتا ابو جی اور ان کی بہن کے ظلم وستم کا شکار صرف میں اور امی ہی ہو رہے ہیں اسی لیے میں امی کے اور بھی قریب ہو گیا۔

اسکول سے آنے کے بعد سارا وقت ان کے گھٹنے سے لگا رہتا ابو جی کے آنے کے وقت کتابیں لے کر بیٹھ جاتا اور وہ عائزہ سارا دن کتابوں میں سر دیے بیٹھی رہتی ویسے بھی ان لڑکیوں کی فطرت میں بڑا کمینہ پن ہوتا ہے اپنی فطری کمزوریوں کو چھپانے کے لیے ایسی ایسی اوچھی حرکتیں کرتی ہیں کہ باپ ٹائپ لوگ خواہ مخواہ ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

وہ سارا دن کتابیں رٹتی ابو جی کے آفس سے آتے ہی ان کے آگے پیچھے پھرتی۔ ان کے گھر کے کپڑے باتھ روم میں لٹکاتی وہ بوٹ اتارتے وہ سلیپر لا کر ان کے قدموں میں رکھ دیتی وہ نہانے جاتے وہ دوڑ کر جاتی اور پھوپھو سے چائے بنوا کر ان کے نکلنے تک ٹیبل پر لا سجاتی چائے کے دوران ان سے ادھر ادھر کی باتیں یونہی کیے جاتی اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے بیٹھا اس کی ساری چھچھوری حرکتیں دیکھ کر کڑھتا رہتا اور ابو جی بھی دل و جان سے اس پر فریفتہ تھے آتے جاتے عائزی عائزہ کرتے رہتے اور وہ کمینی جی ماموں جی ماموں جی کرتی رہتی اور مجھے دیکھتے ہی ابو جی کے منہ سے جو نیم گھلتی تھی اسے دیکھتے ہی شکر بن جاتی۔

جب مجھ سے برداشت نہ ہوتا تو میں امی کے آگے ابو جی کی بے انصافی کے دکھڑے روتا ادھر امی کے پاس بھی ہزاروں گلے ہوتے جب تبادلہ خیال سے دل کی بھڑاس نہ نکلتی تو میں جل کڑھ کر گھر سے نکل جاتا اور یہ میرا اور امی کا متفقہ فیصلہ تھا کہ دونوں ماں بیٹی جادوگرنیاں ہیں مکار اور چالاک۔ عاقب زیادہ تر اپنے ابو کے ساتھ تعمیر ہوتے گھر کی نگرانی کرتا وہ میٹرک میں تھا اسکول سے سیدھا ادھر ہی چلا جاتا صرف رات کو سونے کے لیے آتا اور باقی دونوں چھوٹے تھے یعنی انہیں ابھی یہ چالاکیاں نہ آئی تھیں۔

ایک دن میں کالج سے آیا تو وہ چالاکو، اپنا رزلٹ کارڈ لیے ایک ایک کے آگے پیچھے پھر رہی

تھی اس کا اے ون گریڈ آیا تھا دسمبر ٹیسٹ میں اس نے میری آنکھوں کے آگے بھی کارڈ لہرایا میں نے ہونہہ، کہہ کر پرے جھٹک دیا ابو جی نے اسے فوراً دو سو روپے نکال کر دیے اور گفٹ دینے کا وعدہ بھی کیا۔

اور صرف دو دن بعد بذریعہ ڈاک میرا رزلٹ کارڈ گھر آ گیا بدقسمتی سے وہ ہاتھ بھی ابو جی کے لگا اور کالج کے شروع کے دن تو میں نے کتابوں کو کھول نہیں دیکھا تھا رزلٹ بھی ویسا ہی آنا تھا اور پھر وہ انیلا والا واقعہ بھی تازہ تھا صبح تو میں رزلٹ کارڈ کا سنتے ہی ناشتہ کیے بغیر کالج بھاگ گیا اور شام کو جب ابو جی گھر آئے تو میں تیزی سے اسٹور میں جا کر لحاف میں گھس گیا ابو جی یونیفارم میں ہی میری تلاش میں کمرے میں آئے صبح جب میرا رزلٹ آیا تھا عائزہ اسکول جا چکی تھی ابو جی نے کمرے سے نکلتے ہی اس سے میرے بارے میں پوچھا تو اس نے کہہ دیا۔

”ماموں جی عمر بھائی تو اسٹور کی طرف گئے ہیں۔ بس اس کے بعد جو میرے ساتھ ہوا وہ ناقابل ذکر ہے ہاں بچایا مجھے ابو جی کی عتاب سے...... پھوپھو نے۔ لیکن مجھے عمران نے بتا دیا کہ آپ کے بارے میں ماموں جی کو عائزہ آپی نے بتایا، بس اس دن سے میرے دل نے فیصلہ دے دیا کہ اس لڑکی سے اب زندگی کے ہر محاذ پر صرف جنگ ہوگی یا نفرت نہ مفاہمت نہ محبت۔

کتنے دن میں نے سوچتے گزار دیے کہ اس دن کی مار کٹائی کا بدلہ کیسے لیا جائے۔ اگرچہ کسر تو میں نے بھی کوئی نہیں چھوڑی تھی چھوٹی چھوٹی شرارتیں تو معمول کا حصہ بن گئی تھیں وہ ابو جی کے لیے چائے بنانے جاتی میں جا کر اس میں چپکے سے نمک ڈال دیتا اس کا ہوم ورک خراب کر دیتا ابو جی نے اسے بلا بھیجتا میں نے کہہ دیتا وہ نہیں آ رہی لیکن ان سب باتوں کے باوجود ابو جی ابھی بھی اسے عائزی عائزی ہی پکارتے رہتے تھے۔

پھر اس کے نویں جماعت کے فائنل امتحان تھے۔ صبح اس کا فزکس کا پیپر تھا پڑھتے پڑھتے وہ اٹھ کر پھوپھو کے پاس آ گئی میں نے آرام سے اس کی کتاب اور نوٹ بک اٹھائی اور اپنے کمرے کی الماری کی چھت پر رکھ دی اور خود کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ جب مغرب کے بعد میں گھر لوٹا تو گھر میں عائزہ بی بی کے آنسوؤں سے بھونچال آیا ہوا تھا مگر میں نے پوچھا بھی نہیں ابو جی اس دن شہر سے باہر دورے پر گئے ہوئے تھے اس لیے مجھے آج ان کی فکر نہ تھی اس دن خدا جانے کس بات کی ہڑتال تھی کہ سب دکانیں بھی بند تھیں بیچارے مظہر بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ بازار سے کتاب لا دیتے اگر دکانیں بند نہ ہوتیں۔ سب دوستوں کو فون کر دیا کوئی بھی پیپر سے ایک شام پہلے کتاب دینے کو تیار نہ تھی اب تو عائزہ بی بی کے آنسو بھی سوکھ چلے تھے گلا رو رو کر بند ہو گیا لیکن مجھے خوشی راس نہیں آئی کہ ابو جی دورے سے اچانک بلا وجہ وہ واپس آ گئے رات دس بجے عائزہ کی کتاب اور نوٹ بک کی ازسرنو تلاشی شروع ہوئی۔

اور ابو جی کا پہلا اور آخری شک مجھ پر تھا لہٰذا میرے کمرے کی ایک ایک چیز الٹ پلٹ کی گ
اور کچے چور کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ مال مسروقہ اپنے ہی کمرے میں رکھ چھوڑا جو تھوڑی سی تگ و دو کے
بعد ابو جی نے لماری کے اوپر سے برآمد کرلیا۔

اور آگے تو بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہاں میں دو دن کالج نہ جا سکا۔
شک نشان تو کمر پر پڑے تھے لیکن درد نے دو دن بستر سے ہلنے نہ دیا اور اس دن میں نے نئے سر
سے اپنے دل میں ٹھان لی کہ دنیا میں قابل نفرت اگر کوئی ہے تو وہ عائزہ ہے جس کی وجہ سے میری اتن
معمولی سی شرارت کا اتنا بھیانک نتیجہ نکلا ویسے بھی اس عمر میں اپنی سب شرارتیں معمولی نظر آتی ہیں۔

پھر اس کے بعد میں نے عائزہ کو کبھی منہ نہ لگایا اور اس نے بھی ایسی کوئی کوشش نہ کی جس سے
ظاہر ہو کہ اسے اپنے کیے پر ذرا سی بھی شرمندگی ہے ہمارے درمیان ایک سرد سی بیگانگی ہمیشہ کے لیے پیدا
ہوگئی۔

پھر امی کو جو دکھ پھوپھو کے ہاتھوں ملے۔ ان کے گھر کی تعمیر میں سارا پیسہ ابو جی نے لگایا بقول
امی کے ایک لیکچرار کی بھلا اتنی اوقات کہاں کہ اتنا شاندار گھر بنا سکے اور پھر وہ جو ابو جی کے کان بھرا کر
تھیں بس میرا دل اس خاندان سے ہمیشہ کے لیے کھٹا ہوگیا۔ پھوپھو عجیب چاپلوس سی لگا کرتیں اور اب
ابو جی مجھے اسی ناپسندیدہ لڑکی سے ہمیشہ کے لیے رشتہ جوڑنے کو کہہ رہے تھے میں جس کی شکل بھی دیکھ
گوارا نہیں کرتا تھا۔ پھر امی کی روح مجھ سے کتنا خفا ہوتی توبہ میں توبہ توبہ کرتا سو گیا۔

☆☆☆

پھر مزید پندرہ دن گزر گئے میں جہاں ابو جی نظر چرا کر گزر جاتا انہوں نے بھی دوبارہ مجھ سے
کچھ نہ کہا اور ایک ایک کر کے مزید پندرہ دن گزر گئے نہ تو میں عائزہ کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر سکا اور نہ
دیے گئے پانچ انٹریو میں سے کسی ایک کے لیے کوالیفائی کر سکا۔ ہر طرف مایوسی اور ناامیدی سی تھی اسد کو
اس کے ابو نے اس کے چچا کے پاس کراچی بھجوا دیا تھا رضوان کو پی ئی اے میں جاب مل گئی تھی فہیم اپنے
بھائیوں کے ساتھ جنرل اسٹور پر بیٹھنے لگا ایک ہی مہینے میں میں جیسے تنہا ہو گیا کبھی کبھار فہیم کے پاس
بیٹھتا تو اس کے بھائیوں نے غصیلی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً میں نے وہاں جانا بھی چھوڑ د
اسد کے جانے کے بعد صرف ایک فون آیا تھا اس کے بعد وہ بھی مصروف ہو گیا تھا۔

دن رات کا اکلاپا مجھے مارنے لگا اب تو یہ حالت تھی کہ کوئی مجھے کلرک بھی بھرتی کر لیتا تو میں
نے ہامی بھر لینی تھی ابو جی سارا دن گھر سے غائب رہتے اور میں دل میں شکر ادا کرتا ورنہ ان کے سوالوں
کے جواب دینا بڑا مشکل تھا۔

آج ابو جی کی دی گئی مہلت کا آخری دن تھا وہ دوپہر کا کھانا کھا کر گھر سے نکلے تھے اور اب
رات کے نو بج رہے تھے وہ ابھی تک نہ لوٹے تھے دونوں بھائی اور بھابھیاں گھر پر ہی تھے ہم سب نے نو
بجے تک ان کا انتظار کیا اور پھر کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

میں تو جاتے ہی بستر میں لیٹ گیا لائٹ آف کر دی اور سوتا بن گیا۔ لیٹے لیٹے دس بج گئے مگر
نہ تو ڈور بیل ہوئی اور نہ ہی ابو جی کے آنے کا پتا چل سکا۔ مجھے کچھ فکر سی ہونے لگی رات گئے تک وہ کبھی
گھر سے باہر نہ رہے تھے پھر گیارہ بج گئے اور پھر بارہ۔ میں بے چینی سے اٹھ کر باہر آ گیا دونوں بھائیوں
کے کمرے بند تھے گھر میں ہو کا عالم تھا میں کچھ دیر گیٹ کے پاس ٹہلتا رہا پھر ان کے کمرے میں آ گیا۔
کمرہ خالی تھا اور بھائیں بھائیں کر رہا تھا میں کچھ دیر کھڑا دیوار پر لٹکی ان کی سنہری فریم شدہ جمبو سائز فل
یونیفارم میں اتری تصویر کو دیکھتا رہا اور پھر واپس آ کر لیٹ گیا پھر مجھے نیند آ گئی۔

صبح ہر وقت روشنی پھیلی ہوئی تھی جب فون کی مسلسل بیل سے میری آنکھ کھلی میں نے ٹائم
دیکھا آٹھ بج رہے تھے گھر کا سناٹا بتا رہا تھا کہ ابھی کوئی نہیں اٹھا ابو جی تو سیر سے لوٹ آئے ہوں گے پھر
فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے میں نے لیٹے لیٹے سوچا۔

''ابو جی رات کو کب آئے ہوں گے'' ''مجھے یاد آیا'' پتا نہیں آئے بھی کہ نہیں۔'' ایک دم سے
ہول کر اٹھا اور فون کی طرف ننگے پاؤں بھاگا میرے اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے بیل خاموش ہوگئی مجھے عجیب
سی الجھن ہونے لگی کچھ دیر یونہی فون کے پاس کھڑا رہا۔

پھر سست قدموں سے ابو جی کے کمرے کی طرف بڑھا ہاتھ بڑھا کا دروازہ پش کیا۔

ان کا کمرہ ویسے ہی تھا جیسا میں رات کو دیکھ کر گیا تھا بستر بالکل بے شکن تھا۔ اور کمرے کی
لائیٹ رات سے ویسے ہی جل رہی تھی میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''کیا ابو جی رات بھر گئے نہیں آئے۔''

ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا اپنی جاب کی انتہائی مصروفیت کے باوجود بھی وہ حتی الامکان کوشش
کرتے کہ رات کو ضرور آ جایا کریں اور آج۔ میں پریشان ہو گیا اور باہر لاؤنج میں گیا پھر کمرے میں
آ کر سلیپر پہنے اور دوبارہ لاؤنج کی طرف آ گیا فون کی خاموش بیل مجھے بے چین کر رہی تھی۔ اسی وقت
بینا بھابھی ٹک ٹک کرتی کمرے سے نکلیں۔

''کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے کہیں خدانخواستہ نوکری تو نہیں مل گئی تمہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے
میں بولیں۔

''بھابھی ابو جی رات کو گھر نہیں آئے۔'' میں نے ان کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا نہیں اب اس عمر میں رات گھر سے باہر گزارنے کا شوق چرایا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص دوسروں کے لیے ہمہ وقت God's Messenger بنا رہے خود کچھ کرنے کے لیے گھر سے باہر ہی جگہ سلیکٹ کرے گا۔" ان کا لہجہ نا قابل برداشت تھا۔

"شٹ اپ۔" میرا دل چاہا ان کا منہ نوچ لوں۔

"اس میں اتنا خفا ہونے والی کون سی بات ہے تم انہیں کیا سمجھتے ہو۔ عمر میاں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔" شہلا بھابھی آنکھیں ملتی آئیں اور بینا بھابھی کے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولیں۔

"توبہ ہے ہم اس رات ذرا ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئے تھے تو جناب نے زمین آسمان ایک کر دیے تھے سامان باہر نکالنے کی دھمکی دے ڈالی تھی اب کوئی انہیں کوئی کچھ کہنے والا ہو تو پوچھے نا۔" ان کا لہجہ زہر خند تھا اس سے پہلے کہ میں انہیں کوئی سخت جواب دیتا اسی وقت پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف کوئی اجنبی آواز تھی۔

"کس کا فون ہے۔" اظہر بھائی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مجھ سے پوچھا میں کندھے اچکاتا ہوا فون کی طرف متوجہ ہوا۔

"جی یہ حیات احمد کا گھر ہے سابق ایس پی۔" کوئی پوچھ رہا تھا۔

"جی جی۔ یہ انہیں کا گھر ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ ان کے کون بول رہے ہیں۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"میں ان کا بیٹا بول رہا ہوں۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہیں۔"

"جی وہ رات سے گھر پر نہیں ہیں۔" میں نے کچھ ہچکچا کر کہا۔

"آپ نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔" مخاطب کا انداز کچھ جتانے والا تھا۔

"جی جی ہاں۔" میں نے ہکلا کر کہا۔

"خیر میں میو ہاسپٹل سے ڈاکٹر الطاف بات کر رہا ہوں کارڈیالوجی سیکشن سے، آپ کے والد یہاں ہیں آپ برائے مہربانی فوراً پہنچیں تھینک یو۔" کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور مجھے ریسیور رکھنا دشوار ہو گیا۔

"کیا ہوا کس کا فون تھا۔" مظہر بھائی بھی اٹھ کر آ گئے تھے اور اب صوفے پر بیٹھے جمائیاں لے رہے تھے۔

"میو ہاسپٹل سے کوئی ڈاکٹر الطاف تھے کہہ رہے تھے کہ ابو جی وہاں ہیں۔" میں نے مری مری آواز میں کہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"وہ وہاں کیا کر رہے ہیں بھلا یہاں ہمیں پریشان کر رکھا ہے۔ دوسروں کو احساس ذمہ داری پر ہر وقت لمبا چوڑا لیکچر پلاتے رہتے ہیں اور اپنا پتا نہیں کہ رات بھر گھر نہیں آئے اور اطلاع دینے کی بھی زحمت نہیں کی۔" شہلا بھابھی نے کچن سے انڈے پھینٹتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ کیا مسئلہ ہے۔" اظہر بھائی نے بیوی کی بکواس کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں انہوں نے فون بند کر دیا۔" میں باہر کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو عمر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" جب میں بائیک باہر نکال رہا تھا اظہر بھائی نے مجھے پیچھے سے پکارا۔

"گاڑی سے چلتے ہیں کیا پتا ان کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔" وہ پورچ کی طرف بڑھتے ہوئے بولے میں نے خاموشی سے بائیک دوبارہ پورچ میں کھڑی کر دی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ڈاکٹر الطاف کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

"کیا آپ لوگوں کو خبر نہیں انہیں تقریباً دو سال سے انجائنا کی تکلیف تھی اور وہ ڈاکٹر صفدر کے مستقل پیشنٹ تھے۔

کل شام کو بھی شاید انہیں تکلیف ہوئی وہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے گئے کیونکہ ان کے والٹ سے کل شام کا نسخہ نکلا ہے ڈاکٹر نے انہیں مکمل بیڈ ریسٹ اور ذہنی کھچاؤ سے بچنے کی ہدایت دی تھی پتا نہیں پھر وہ گھر کیوں نہیں گئے۔ پھر تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد انہیں اٹیک ہوا تقریباً رات کے دس اور گیارہ کے درمیان۔

وہ سڑک کے کنارے گر گئے وہاں سے انہیں ایک راہ گیر اپنی گاڑی میں ڈال کر یہاں لایا اور رات ایک بجے تک آئی سی یو میں ہم نے ان کی جان بچانے کی حتی الامکان کوشش کی مگر۔"

ڈاکٹر گہرا سانس لے کر چپ ہو گیا اور مجھے لگا جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے میرے بدن سے میری روح کھینچ لی ہو میں نے خالی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اظہر بھائی کی کیا حالت تھی مجھے اس کی خبر نہیں۔

"اور ہم ان کی ڈیڈ باڈی کو لاوارث اناؤنس کرنے والے تھے کیونکہ ان کی جیبوں سے کچھ نہیں نکلا تھا کہ صبح تقریباً ساڑھے سات بجے وہی رات والا راہ گیر مسٹر انور ان کا والٹ لے کر آ گیا جو

اس کی گاڑی میں گر گیا تھا۔ والٹ سے ان کا آئی ڈی کارڈ اور گھر کا فون نمبر وغیرہ ملا تو ہم نے فون
ڈاکٹر نے کچھ دیر بعد کہا۔

"آیئے میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔ ایمبولینس بھی تیار ہے۔"

اور میں اپنے بے جان وجود کو گھسیٹتا ہوا ان دونوں کے پیچھے چل پڑا۔

سفید چادر میں لپٹا سرد خانے میں پڑا ان کا سرد وجود میری دھڑکنوں کو سرد کرنے لگا سینکڑ
لاوارث لاشوں کے درمیان پڑا ان کا بے جان وجود جیسے ہمارا مذاق اڑا رہا تھا۔

"میری تو دعا ہے کہ مرتے دم تمہارے ہاتھوں سے ایک چمچہ پانی کا نہ لوں۔ خدا مجھے محتاج نہ کرے۔" اور خدا نے ان کے کہے کی لاج رکھ لی۔

اور جب ڈاکٹر نے ان کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو یک لخت جیسے میرے جسم میں کرنٹ گیا میں تڑپ کر آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ان کا سرد چہرہ تھام کر انہیں بے تحاشا چومنے لگا۔

"ابو جی ابو جی یہ کیا کیا آپ نے کوئی ایسے خفا ہوتا ہے۔ ابو جی ابھی تو مہلت کے چند باقی تھے آپ مجھ سے اس درجہ مایوس ہو گئے تھے کہ مجھ سے جواب لینا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ کیا کیا آپ نے مجھے کیوں تنہا چھوڑ گئے ہیں ابو جی میں کیا کروں گا۔" میرے آنسو ان کی بند آنکھوں پر گرنے لگے۔

"عمر حوصلہ کرو۔ چلو ابو جی کو گھر لے چلتے ہیں اٹھو۔" اظہر بھائی نے مجھے کندھے سے اٹھایا۔

"نہیں نہیں ابو جی نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ انہوں نے مجھے دھوکا دیا ہے ابو فاؤل ہے یہ چیٹنگ ہے ابھی چند گھنٹے تھے مہلت کے پھر آپ نے مجھ پر بھروسا کیوں نہیں کیا۔" میں ہاں نہیں کیے بغیر ہی مجھ سے خفا ہو گئے مجھ سے پوچھا تو ہوتا میں کیا آپ کی بات سے انکار کرتا ابو جی پلیز ایسا نہ کریں۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اظہر بھائی نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور گاڑی ہی کی طرف لے گئے اور اب وہاں رکھا بھی کیا تھا ان کا خاموش وجود ان کی گھن گرج کڑک اور سب خاموش ہو گئے تھے ایک دم سے چپ!

☆☆☆

اور میں جو یہ سمجھتا تھا کہ مجھے ابو جی سے ذرا برابر محبت نہیں ان کے جانے کے بعد انکشاف ہوا کہ میں تو پورا پورا ان کی محبت میں جکڑا ہوا تھا اتنا سناٹا اتنا سوگ تو امی کے بعد میرے اندر اترا تھا جتنا ابو جی کے جانے کے بعد میرے چاروں طرف پھیل گیا تھا اداسی تنہائی اور سناٹے کے

کل جیسے میرا تنہا وجود بھٹک رہا تھا۔

اور کسی کی محبت بھری کڑک مجھے راستہ دکھانے نہیں آ رہی تھی میں گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا کوئی مجھے آواز بھی نہ دیتا اپنا ہی نام سننے کے لیے میرے کان ترس جاتے میں جو ابو جی کے کمرے سے کترا کر گزرتا تھا اب سارا سارا دن ان کے کمرے میں بیٹھا ان کی تصویر کو تکتا رہتا۔ کتنی شکایتیں ان کہی باتیں اور گلے جو میرے اندر دم توڑ رہے تھے میں ان کی تصویر کو سناتا رہتا۔

دونوں بھائی اور بھابیاں چند ہی دنوں میں اپنے روٹین کے کاموں میں مگن ہو گئے جیسے کچھ ہوا نہ تھا اور واقعی ان کے لیے کچھ بھی نہ ہوا تھا وہ تو محض دن میں اک آدھ بار ان سے ملا کرتے تھے اب وہ ملنا بھی نہ رہا تو انہیں کیا فرق پڑتا تھا بلکہ انہیں تو جیسے آزادی مل گئی تھی جب چاہتے رات کو واپس آتے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا تھا۔

صاحباں سے شہلا بھابی نے کہہ دیا تھا۔ "صبح کو آ کر ناشتہ بنا دیا کرے اور صفائی دھیان سے کیا کرو۔"

اور واقعی اس نے دھیان سے صفائی کرنا شروع کر دی کچن میں سے راشن جلد جلد ختم ہونے آٹا چینی تو ہر دوسرے ہفتے ختم ہونے لگے دونوں بھائیوں کے کمرے تو وہ اچھی طرح صاف کر دیتی باقی گھر میں صرف پھیرا ہی ڈال کر چل دیتی ڈرائنگ روم کے صوفے گرد سے اٹ گئے۔ قالین سے مٹی جھانکنے لگی ابو جی کے ہاتھوں کے خریدے ہوئے قیمتی مینٹل پیس دھول کی نذر ہونے لگے ابو جی کے کمرے سے قیمتی چیزیں غائب ہونے لگیں اور اس کمرے۔ میں تو دوبارہ کسی نے جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا جیسے وہاں کسی بھوت کا بسیرا ہو گیا ہو۔

میرے کمرے کی صفائی وہ اکثر کرنا بھول جاتی۔ تنخواہ تو اسے شہلا بھابی دیتی تھیں پینا بھابی اکثر اس کی مٹھی گرم کرتی رہتی تھیں میری بیوا بھلا وہ کس خوشی میں کرتی مجھے دیکھتے ہی بد دماغ عورتوں کی طرح ماتھے پر آنکھیں رکھ لیتی اور بڑے احسان سے مجھے ناشتہ بنا کر دیتی ساتھ ساتھ مہنگائی کا رونا رونے لگتی اور جب دیکھتی اس کے رونے، بیکار جا رہے ہیں تو برتن پٹخنے لگتی۔

اور وہ بٹلر گیارہ بجے سے تین بجے تک مختاری اس کے ہاتھ آ جاتی جو چیزیں صاحباں کے ہاں بچ جاتیں اس پر وہ نذیر ہاتھ صاف کر جاتا اس کے جانے تک شہلا بھابی آ جاتی تھیں وہ خوب نمک مرچ لگا کر صاحباں کی کارگزاریاں اور فریب کاریاں سناتا۔ بھابی کی ہمدردیاں بٹورتا اور ... باتیں حاصل کرتا۔

ابو جی کی زندگی میں وہ چاروں حتی الامکان میری سائیڈ لیا کرتے تھے اور اب کچھ دنوں سے

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ چاروں مجھے دیکھ کر کچھ ناگواری کا اظہار کرتے ہیں اس کا اندازہ مجھے اس
ناشتے پر ہوا۔ شہلا بھابھی اس دن گھر پر تھیں جب صاحباں نے آملیٹ کے ساتھ تین سلائس اور دودھ کا
گلاس میرے آگے رکھا تو شہلا بھابھی نہ جانے کیوں اس پر برس پڑیں۔

"یہ گھر ہے کوئی لنگر خانہ نہیں جسے دیکھو سر چڑھا مہمان بنا جا رہا ہے دن رات جان مارتے
ہیں تو چار پیسے ہاتھ آتے ہیں اور بازار جاؤ تو پتا چلے کتنے روپوں کے سیر ہیں۔
ہم بچت کیے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں کہ اس گھر کی ساکھ بنی رہے مگر کسی کو احساس
نا۔ ہر چیز پانی کی طرح بہائی جاتی ہے جیسے یہ سب حرام کی کمائی سے آ رہا ہو اور تیری آنکھوں
صاحباں شاید دم نہیں رہا ایک آملیٹ بنانے کے لیے آدھا ڈبہ گھی کا الٹ دیتی ہے جیسے گھی نلکوں
ہے۔ "آخر انسان میں کچھ تو احساس ہونا چاہیے۔"

"یہاں کون بے احساس ہوا جا رہا ہے آخر ہم بھی برابر کا حصّہ ڈالتے ہیں، کوئی
روٹیاں نہیں توڑتے جو آپ سب کے ساتھ ہمیں بھی رگڑا لگا رہی ہیں۔" بینا بھابھی پتا نہیں کہاں
تک کرتی آ نکلیں۔

"سارا دن جو گھر سے باہر جان کھپاؤ تو پھر طعنے سنو کہ ہمیں احساس نہیں" وہ تلملائیں
"ویسے تو میں تمہیں نہیں کہہ رہی جو تمہیں اس قدر برا لگا ہے میں صاحباں سے کہہ رہی
احتیاط کیا کرے اتنی مہنگائی کا زمانہ ہے اور اگر تمہیں اس قدر زعم ہے اپنے حصّے کا تو الگ الگ
کھانا پینا۔ خود ہی پتا چل جائے گا کون کتنا حصّہ ڈالتا ہے اور کون یونہی، سب کچھ اڑا جاتا ہے
بھابھی نے پانسہ پلٹا۔ نوالے میرے حلق میں اٹکنے لگے میں ناشتہ اسی طرح چھوڑ کر اٹھ آیا کمرے
آتے آتے آنکھیں بھیگ گئیں۔

"ابھی تو باپ کی کمائی پر عیش کر رہے ہو نا اس لیے پتا نہیں چلتا کل کو میں نہ رہا تو پھر
کون تمہیں بٹھا کر دو وقت کی کھلاتا ہے۔" ابو جی سامنے کرسی پر بیٹھے تھے میں سسک اٹھا۔

"ابو جی آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔" وہ مسکرائے۔

"اگر میں اس رات واپس آ جاتا گھر تو اپنی ایمانداری سے بتاؤ کیا تم وہی کہتے
چاہتا تھا عمر سچ بولنا۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے تو میرا سر جھک گیا۔

☆☆☆

پھر جوں جوں دن گزرتے گئے نشتر بڑھتے گئے تیر سیدھے نشانے پر بیٹھنے لگے بھا

ساتھ اب بھائیوں کی نظریں بھی بدلنے لگیں گھر کی دیواریں جیسے سمٹنے لگیں میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوتا
سارے گھر کی اینٹیں مل کر شور مچانے لگتیں۔

آٹا مہنگا ہو گیا ہے۔ چینی کا ریٹ دو روپے بڑھ گیا ہے۔ دودھ تین روپے کلو مہنگا ہو گیا ہے۔
پیسہ محنت سے کمایا جاتا ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے دو چار ہزار کی شکل نظر آتی ہے۔

ایک اینٹ چلاتی۔ "تمہیں نہیں پتا انڈے مہنگے ہو گئے ہیں۔" دوسری کہتی" اور آلو۔ آلوؤں
کو دیکھو ان کے بھی بھاؤ آسمان کو چھونے لگے۔" تیسری اینٹ شور مچاتی "پیاز تو آج کل پاکستان میں
اگ ہی نہیں رہے۔" چوتھی اینٹ کہتی" دفع کرو اس مہنگائی کو تمہیں پتا ہے اس بار بجلی کا بل کتنا آیا ہے"
دوسری کہتی" اور جو گیس کا بل آیا ہے وہ۔" تیسری کہتی "فون تو لگتا ہے اس بار کٹ ہی جائے گا۔"

برآمدے کا ستون کہتا" بھلا یہاں احساس ہی کس کو ہے جن کے منہ کو مفت کی چاٹ لگی ہے
وہ ان باتوں کی پرواہ کب کرتے ہیں بابا۔"

کمرے میں آتا تو گندا بستر گرد آلود فرش دھول میں اٹی ہوئی کرسی پر پڑے میرے میلے
کپڑوں کا ڈھیر منہ چڑھا رہا ہوتا۔

"لانڈری والا گاؤں گیا ہوا ہے ایک مہینے کے لیے اظہر کے اور اپنے کپڑے میں نے خود
دھوئے ہیں بینا نے مظہر کے، تم کہیں اور سے دھلوا لو۔" شہلا بھابھی ڈھیر میرے کمرے میں پھینک کر
جاتے ہوئے بتا گئیں۔

میں سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

"کیا کروں۔"

"ابو جی کا کہا مانا ہوتا تو کم از کم آج یہ ڈھیر تو دھلا ہوتا۔" میرے اندر سے کوئی بولا۔

"ہاں اور میرے ساتھ آج وہ بھی ذلیل ہو رہی ہوتی بلکہ مجھے ان چاروں کے ساتھ مل کر
ذلیل کرتی۔ اچھا ہی ہوا جو میں نے ہامی نہیں بھری۔" میں کرسی سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

شہلا بھابھی ساڑھی اور سبز بلاؤز میں اظہر بھائی کے ساتھ کہیں جا رہی تھیں بینا بھابھی اور
مظہر بھائی پہلے ہی کسی دوست کی شادی میں جا چکے تھے اور رات بارہ ایک بجے سے پہلے ان کی واپسی
ممکن نہ تھی۔

اور پھر رات دس بجے تک جب چاروں میں سے کوئی نہ لوٹا تو مجھے مجبور ہو کر کچن کا رخ کرنا پڑا
خالی کچن میرا منہ چڑا رہا تھا حتیٰ کہ فریج بھی بالکل خالی تھا سوائے پانی کی بوتلوں کے دودھ بھی کہیں نہیں
تھا نہ کوئی انڈہ نہ ڈبل روٹی۔ ابو جی کی زندگی میں اس فریج اور فریزر میں چیزیں رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی

اور آج۔ ایسا لگ رہا تھا یہ صفائی جان بوجھ کر کی گئی ہے ورنہ دوپہر جب میں فریج سے پانی کی بوتل لینے آیا تھا تو درجن بھر انڈے پڑے تھے انہیں کوئی جن تو کھا نہیں گئے تھے۔ میں نے فریز کی تلاشی لی تو ایک کونے میں برف میں سکڑا سمٹا ایک سیب پڑا تھا میں نے اسے اٹھایا اور پانی کی بوتل لے کر کمرے میں آ گیا۔

اور پھر رات کے ایک بجے اظہر بھائی اور شہلا بھابھی آئے اور ان کے آدھ گھنٹہ بعد بینا بھابھی اور مظہر بھائی۔ ابو جی کی ڈیوٹی اب میرے ذمے تھی ہاں جو کچھ نہیں کرتے وہ پھر چوکیداری کرتے ہیں اور چاروں میں سے کسی نے بھی نہ پوچھا کہ "عمر تم نے کچھ کھایا؟"

زندگی از حد تلخ ہو چلی تھی۔ مہروز اینڈ برادرز میڈیسن کی پرائیویٹ کمپنی تھی اس کا ایڈ اخبار میں آیا تھا میں انٹرویو دے کر باہر نکلا تو پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا جتنا ابو جی مجھے گھر میں رکھنا چاہتے تھے میں اتنا ہی وہاں سے بھاگتا تھا اور اب جتنا گھر مجھ سے گریزاں تھا وہاں جانا میرے لیے اتنا ہی ضروری تھا۔ باہر کی دنیا بھی تنگ ہو گئی تھی اور گھر کی بھی، یونہی سوچوں میں غلطاں چلا جا رہا تھا پتا نہیں کون سا موڑ مڑا اور چونک اٹھا۔

"ارے یہ تو سعدیہ پھوپھو والی سڑک آ گئی۔" صرف چند قدموں کے فاصلے پر ان کا گھر تھا۔ ابو جی کے چالیسویں کے بعد وہ صرف ایک بار ہمارے گھر آئی تھیں اسی طرح مجھے لپٹا لپٹا کر پیار کیا تھا اور شاید پہلی بار مجھے ان کے پیار سے خوشامد کی بو نہیں آئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل نے کبھی ان سے ملنے کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی تھی۔

آج یونہی ادھر آ نکلا تو سوچا ان سے ملتا چلوں۔ گیٹ کھلا پڑا تھا میں اندر بڑھتا چلا گیا۔ پھوپھو کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اندر سے ان کی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

"امی بس کہیں عاقب کی داخلہ فیس کا انتظام ہو جائے پھر انشاء اللہ ساری پریشانی ختم ہو جائے گی عاقب کے یہ چند ماہ ہی تو ہیں۔" یہ عائزہ کی آواز تھی۔

"ہاں اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن رقم کا بندوبست کہاں سے ہو۔" پھوپھو کی پریشان آواز تھی۔

"عاقب کہہ تو رہا تھا کہ ایک دو دوستوں سے کہہ رکھا ہے شاید کچھ انتظام ہو جائے ویسے میں نے اپنی پرنسپل صاحبہ سے بھی بات کی تھی وہ کہہ تو رہی تھیں کہ کوشش کریں گی۔ اگر اس بار عمران اور فائزہ کی داخلہ فیس کا بھی ساتھ ہی چکر نہ پڑتا تو اتنی مشکل نہ ہوتی۔"

"میں سوچ رہی تھی کہ اوپر کے کرائے دار ہاشمی صاحب سے کہتی ہوں کہ ایک مہینے کا کرایہ

ایڈوانس دے دیں تو۔" پھوپھو نے اوپر کا پورشن کرائے پر دے رکھا ہے میں نے کچھ حیرت سے سوچا۔

"ہاں ایک بار ابو جی نے ذکر تو کیا تھا میں نے غور نہیں کیا۔"

"وہ نہیں دیں گے مجھے پتا ہے ان کے اپنے اتنے بکھیڑے ہیں انہوں نے جواب دے دینا ہے آپ ان سے بات نہ کیجئے گا۔" عائزہ بولی۔ "اگر کچھ نہ ہو سکا تو میں یہ ٹاپس بیچ دوں گی۔"

"نہ بیٹا ایسا نہ کہو تمہیں پتا ہے تمہارے ماموں نے کتنے شوق سے تمہیں پاس ہونے پر گفٹ کیے تھے۔" پھوپھو جیسے تڑپ کر بولیں۔

"امی ایسی چیزیں ضرورت کے لیے ہی تو ہوتی ہیں میں کونسا اپنی خوشی سے بیچوں گی۔ ماموں جی کا دیا ہوا ایک ایک گفٹ میرے پاس محفوظ ہے مگر یہ ضرورت زیادہ اہم ہے۔" اس کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا۔

"ضرورتیں تو بیٹا کبھی اہم ہوتی ہیں اس وقت جب گھر بنایا تھا میں نے سارا زیور بیچ دیا کتنا عرصہ آرٹیفشل چوڑیاں پہنتی رہی ہماری بھابھی بندے کو سونے کے حساب سے ڈیل کیا کرتی تھیں اگر اس وقت انہیں پتا چل جاتا کہ میں نے سارا زیور بیچ دیا ہے بلکہ ڈیڑھ لاکھ کے مقروض بھی ہو گئے ہیں تو انہوں نے مجھے اپنے گھر میں ایک دن بھی ٹکنے نہیں دینا تھا۔

امیری غریبی اچھے برے دن انسان کے اپنے بس میں نہیں لیکن بانو بھابھی کا مزاج ذرا دوسرا تھا۔ انہیں غریبی۔ خیر چھوڑو اللہ انہیں جنت نصیب کرے اور میرے بھائی کو بھی۔ ان کا احساس کرنا ہی بڑی بات تھی اور تمہارے ابو کو ڈیڑھ لاکھ کا قرض چکاتے چکاتے یہ دن آ گئے خدا کا شکر ہے قرض تو چکتا ہوا اور بھابھی مرحومہ یہی سمجھتی رہیں کہ میں نے بھائی جان سے پیسے لیے ہیں بھائی تو خود ان دنوں بہت پریشان تھے ایک ڈاکے میں پکڑی جانے والی لاکھوں کی رقم ادھر ادھر ہو گئی تھی اس کی انکوائری ان دنوں ہو رہی تھی بعد میں لاکھ انہیں اپنی جیب سے سرکاری خزانے میں جمع کرانے پڑے اور بھابھی نے اس کا الزام بھی مجھ پر لگایا کہ میں نے ان سے یہ دو لاکھ اینٹھے ہیں آتے آتے انہوں نے کہہ دیا تھا کہ جتنا بھائی کو کھا لیا ہے نا بس اتنا ہی غنیمت سمجھنا آئندہ ادھر کا رخ کرنے سے پہلے اپنی عزت کو کہیں لپیٹ کر رکھ آنا کیونکہ تم نے میرے بچوں کا حق کھایا ہے اور میں اتنی احمق نہیں کہ محض شوہر کے ڈر سے تم جیسے غاصبوں کو پلنگ پر بٹھا کر تواضع کرتی رہوں۔

ان کے یہ الفاظ آج بھی مجھے یاد آتے ہیں تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے اور میں کوشش کے باوجود بھابھی کی زندگی میں انہیں اپنی طرف سے مطمئن نہ کر سکی اور نہ پھر دوبارہ...... ان کے گھر جانے کی ہمت کر سکی تمہارے ابو کی بے وقت موت نے مجھے سارے زمانے سے ڈرا دیا تھا بھائی آتے

جاتے رہتے تھے مجھے یہی بہت تھا۔'' پھوپھو رونے لگیں۔

اور باہر کھڑے میرے قدم جیسے من من کے ہو گئے۔

☆☆☆

اور پھر بالکل غیر متوقع طور پر مہروز اینڈ لیبارٹریز کی طرف سے مجھے اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا خو
سے میرا جسم کانپنے لگا حالانکہ یہ کوئی ایسی اچھی آفر نہ تھی کہ بہت خوش ہوا جاتا لیکن پھر بھی میری خوشی
کوئی ٹھکانہ نہ تھا انہوں نے فی الحال دوسرے شہروں کے لیے مجھے میڈیسن ڈسٹری بیوٹر کے طور پر اپائنٹ
تھا اسٹارٹ سیلری بھی اچھی تھی اور نیکسٹ بھی مہروز صاحب نے مجھے مزید چانسز کی امید دلائی تھی۔

اور میرے لیے تو فی الحال یہ بھی بہت تھا دوسرے دن سے میں نے جاب پر جانا شروع کر
جب رات کو کھانے پر میں نے بھائیوں اور بھابھیوں کو بتایا تو اظہر بھائی نے مبارکباد دی جبکہ مظہر بھا
خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

''بس اسی جاب کے انتظار میں اتنے عرصے سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے یہ کون سی
نے توپ چلائی ہے۔'' شہلا بھابھی نے حقارت سے کہا۔

''چلو بھابھی کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے omething is better than
nothing دیور جی کسی دھندے سے تو لگے چاہے پھیرے والے ہی سہی۔''

بینا بھابھی کے گھٹیا ریمارکس پر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''ابو جی آپ کچھ عرصہ انتظار کر لیتے صرف چار ماہ جاب تو مل ہی گئی۔ پھر میں آپ کا
مان ہی لیتا۔'' کمرے میں آکر میں ان کی تصویر سے مخاطب ہو کر بولا جوان کے کمرے سے اٹھا کر ا
کمرے میں لے آیا تھا۔

''کیا واقعی مان جاتے پھر تو اور بھی اکڑ جاتے۔'' ابو جی معنی خیز انداز میں مسکرائے جب
ابو جی تصویر میں سمائے تھے وہ بہت مسکرانے لگے تھے انہوں نے مجھ پر ہر وقت خفا ہونا چھوڑ دیا تھا
روتا وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھتے اور مجھے گلے لگا لیتے میں مایوس ہوتا تو ان کی مسکراہٹ مجھے جی
حوصلہ دینے لگتی یا شاید میرے تخیل نے انہیں اتنا خوب صورت گھڑ لیا تھا کہ ان کے تصور سے غصے
جلال کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔ ابو جی نے اپائنٹمنٹ لیٹر ملنے پر تصویر کے چوکھٹے سے نکل کر باقاعدہ
گلے سے لگایا اور ماتھا چوما مگر اس کے باوجود ساری رات میں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ گزاری۔

زندگی کیا ہے یہ زندگی۔ ہم گئے ہوؤں کی آواز آڈیو میں سن سکتے ہیں تصویروں میں ا
مکمل وجود کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں مگر اپنی اس تشنگی کی تسلی نہیں کر سکتے جو زندہ وجود کرتا ہے۔ وجود کا

اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ آگ کتنی ہی کیوں نہ بھڑک رہی ہو ساری دنیا کے سائنسدان مل کر اس کا درجہ حرارت بتاتے رہیں پھر یقین نہیں کریں گے جب تک اس آگ کو چھو نہیں لیں گے ہمیں اس کی حدت اس کی تپش کا اندازہ نہیں ہوگا۔

میں تصویر میں ان کے گلے سے بھی جا لگا لیکن حقیقت میں میرا اندران کے لمس کے لیے کرلاتا رہا اور رات بھر اس محرومی پر قطرہ قطرہ آنکھ سے گرتا رہا۔ وہ صبح کتنی روشن کتنی نئی نئی سی تھی جب میں نے جاب پر جاتے ہوئے اپنے وجود کو محسوس کیا اپنے ہونے کو محسوس کیا۔ پہلی بار محسوس ہوا کہ میرے قدم بھی مضبوطی سے زمین پر پڑے ہیں ناشتے کے دوران صاحباں کی بکواس پر ذرا دھیان نہ دیا۔ شہلا بھابھی کی تیکھے تیکھے طنز میں نے آرام سے چائے کے گھونٹوں کے ساتھ حلق سے نیچے اتار لیے۔

پھر روزگار کا چکر جو شروع ہوا تو میں جیسے خود بھی گھبرا اٹھا بے شک یہ تو مجھے پتا تھا کہ کمپنی کی پروڈکٹس انٹروڈیوس کرانے کے لیے آؤٹ آف اسٹیشن جانا پڑے گا۔ لیکن اتنا نہیں کہ میرے پیروں میں چکر ہی آ جائے گا صبح کہیں تو شام کہیں اس بھاگ دوڑ میں وقت کی رفتار کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا کہ فراغت میں جو میں خود ترسی کا شکار ہو جاتا تھا اس سے نجات مل گئی۔

وہ دسمبر کی انتہائی سرد رات تھی جب میں سرگودھا سے رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے لاہور پہنچا۔ شام سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے سارے راستے میں بھی دھند اور بادل رہے جیسے ہی گاڑی لاہور میں داخل ہوئی بارش شروع ہو گئی اور جب گاڑی نے مجھے گھر کے آگے ڈراپ کیا اس وقت تک بارش خاصی تیز ہو چکی تھی۔

''سر آپ بیل دے کر گاڑی میں آ جائیں جب تک گیٹ کھلے گا تو آپ اتر جایئے گا بارش خاصی تیز ہے۔'' تنویر نے مجھے آفر کی۔

''نہیں تم جاؤ۔ تم نے بھی تو کافی دور جانا ہے میں بیل دوں گا۔ ابھی گیٹ کھل جائے گا۔''
میں نے اسے تسلی دی اور بھیج دیا اور خود بیل بجانے لگا۔

رات کے تقریباً پونے ایک بجے گھر میں بیل کی آواز گونجی مگر کہیں حرکت نہ ہوئی میرے دانت مارے سردی کے بجنے لگے اوپر سے بارش تیز ہو گئی میں نے پھر بیل بجائی۔ مگر پانچ منٹ تک جب کوئی باہر نہ آیا تو میں نے بیل پر انگلی رکھ دی اور مجھے بے اختیار وہ رات یاد آ گئی جب میں رات ایک بجے فلم دیکھ کر آیا تھا اور ابو جی میرے انتظار میں ٹہل رہے تھے اور آج۔ ایک بارش آسمان سے برس رہی تھی دوسری میری آنکھوں سے برسنے لگی۔

پھر میں گھنٹی بجا بجا کر تھک گیا مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا میرے

کپڑے بارش میں شرابور ہوگئے اور جسم تھر تھر کانپنے لگا آخر ہار کر میں نے ساتھ والے راجا صاحب کی بیل بجائی تیسرے بار بیل بجانے پر راجا صاحب نے میرا نام پوچھ کر گیٹ کھولا۔

مجھے اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئے میں شرمندہ ہوگیا۔

''وہ انکل میں دوسرے شہر سے باہر گیا ہوا تھا ابھی آیا ہوں کوئی گیٹ نہیں کھول رہا میرا خیال ہے سب گہری نیند سو رہے ہیں اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ذرا فون کر کے کہہ دیں کہ گیٹ کھول دیں۔'' میں نے شرمسار لہجے میں کہا۔

''اچھا کر دیتا ہوں فون تم اندر تو آؤ کیسے بھیگ گئے ہو۔'' انہوں نے کہہ کر جلدی سے گیٹ بند کیا اور اندر کی طرف بڑھے پھر ان کے اصرار کے باوجود میں ان کے گھر نہ ٹھہرا انہوں نے فون کیا کافی دیر بعد اظہر بھائی نے فون اٹھایا اور تھوڑی دیر بعد گیٹ کھولا تو ان کے ماتھے پر ہزاروں بل پڑے تھے۔

''میرا خیال ہے کوئی چوکیدار رکھ لو کیونکہ ہم تو یہ ڈیوٹی نہیں نبھا سکتے کہ دن میں دفتروں میں کام کریں اور رات کو تمہاری چوکیداری کریں۔'' اندر جاتے جاتے وہ کتنی باتیں سنا گئے۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے بار بار گیٹ پھاندنے کی وجہ سے ابو جی نے اپنی وفات سے تین چار ماہ پہلے ہی گیٹ کے اردگرد کی دیواریں اونچی کرا دی تھیں اور گیٹ کا جنگلا اونچا کروا لیا تھا ورنہ میں آج بھی وہی حربہ استعمال کرتا۔

کمرے میں آکر میں نے نہا کر کپڑے بدلے تو بھوک چمک اٹھی کچھ دیر ہیٹر کے آگے ہاتھ سینکتا رہا پھر جب صبر نہ ہوا تو کچن کی طرف بڑھا۔

''چار انڈوں کا آملیٹ بنا لو میں بھی کھاؤں گا مجھے بھی بھوک لگ گئی ہے۔'' میں انڈہ توڑ رہا تھا جب ابو جی کی آواز میرے کانوں میں گونجی تو انڈہ میرے ہاتھ سے گر گیا اور فریج میں وہی اکلوتا انڈہ تھا جو گر گیا اور توڑ پھوڑ تو میرے اندر دور کہیں ہوئی تھی انڈے کے نقصان سے زیادہ ناقابل تلافی نقصان کا احساس کسی برچھی کی طرح مجھے کاٹ گیا تھا میں کچن کی لائٹ بند کر کے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

☆☆☆

اور پھر صبح حسب توقع مجھے تیز بخار ہو چکا تھا کتنی دیر تک یونہی لیٹا رہا مظہر بھائی نے آفس جاتے جاتے دروازہ کھول کر مجھے آواز دی۔ ''عمر اٹھ جاؤ تم نے جانا نہیں ہے۔'' اس کے بعد کوئی نہ آیا۔ یہ بات جانتا تھا مگر پھر بھی یونہی انتظار سا تھا۔

آخر ہار کر دس بجے میں نے صاحباں کو آوازیں دیں اور خلاف معمول اس نے سن بھی لیں اور ویسے بھی وہ آج کل میری بات کچھ سننے لگتی تھی اسے کچھ امید، جو بندھ گئی تھی پھر میں نے فون کرے

میں منگوا کر ڈاکٹر ریاض کو فون کیا وہ کلینک کے لیے نکلنے والے تھے میرا فون سن کر آ گئے انہوں نے ٹمپریچر چیک کیا اور دوائیں لکھ دیں میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب یہاں تو کوئی نہیں ہے دوائیں کہاں سے منگواؤں۔'' کہنے لگے ''اچھا میں اپنے نوکر کے ہاتھ بھجوا دیتا ہوں۔''

پھر صاحباں نے مجھے دودھ گرم کر کے دیا اور میڈیسن آنے پر میں نے دوائی کھائی اور منہ سر لپیٹ کر سو گیا۔

اگلے دن چھٹی تھی میرا بخار اتر چکا تھا پورا دن اور رات آرام کرنے کی وجہ سے آنکھ منہ اندھیرے ہی کھل گئی۔

''عمر، عمر بیٹا اٹھ کر نماز پڑھ لو ٹائم نکلا جا رہا ہے۔'' میں نیم غنودگی میں تھا جب ابو جی کی آواز میرے کان میں پڑی میری آنکھ کھل گئی کچھ دیر میں اس آواز کو محسوس کرتا رہا اور پھر اٹھ بیٹھا وضو کر کے نماز پڑھی۔ باہر دھند کا سینہ چیر کر ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ میں نے سویٹر اوپر جیکٹ پہنی ابو جی کی گرم شال اوڑھی اور باہر آ گیا گیٹ کھول کر باہر سے تالا لگایا اور آگے بڑھ گیا۔

اگرچہ بخار اگلے روز اتر گیا تھا مگر ایک دن کے بخار نے اچھی خاصی کمزور کر دی تھی چلتے چلتے میں قبرستان جا پہنچا پرسوں کی بارش سے قبروں کی مٹی ابھی تک گیلی تھی میں نے امی اور ابو کی قبروں پر فاتحہ پڑھی اور گورکن کو بلا کر قبروں کی لپائی کے لیے پیسے دیے اور افسردہ دل لے باہر آ گیا سڑک پر ٹریفک شروع ہو چکی تھی۔

نعمتیں جب چھن جاتی ہیں تو ہمیں کیسے اندر سے خالی کر جاتی ہیں میں سر جھکائے چلتا رہا اور خود بخود میرے قدم سعدیہ پھوپھو کے گیٹ کے آگے جا کر رک گئے۔ میں نے بیل بجائی تو دروازہ عائزہ نے کھولا مجھے دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔

''پھوپھو کہاں ہیں۔'' میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اندر کچن میں۔'' کہہ کر وہ دوسری طرف نکل گئی۔

پھوپھو کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں مجھے دیکھ کر نہال ہو گئیں کتنی دیر مجھے اپنے ساتھ لپٹائے کھڑی رہیں میں نے الگ ہونا چاہا تو انہوں نے پھر سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور کچھ دیر بعد وہ پیچھے ہٹیں تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''پھوپھو آپ رو کیوں رہی ہیں۔'' میں نے انہیں بازوؤں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''یونہی بیٹا۔ آج تم اس طرح آئے تو بہت اچھا لگا۔ بھائی جان کی یاد آ گئی وہ اسی طرح صبح

صبح آ جایا کرتے تھے اور تمہارے وجود سے ان کی خوشبو آ رہی تھی اس لیے۔'' وہ بولیں۔ میں بھی ان کے برابر بیٹھ گیا وہ کتنی دیر چپ چاپ آنسو بہاتی رہیں میں انہیں کچھ دیر روتے دیکھتا رہا پھر ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''پھوپھو نہ روئیں ابو جی کو تکلیف ہوگی۔'' میں صرف یہی کہہ سکا۔

''ہاں بیٹا تم صحیح کہتے ہو۔'' انہوں نے آنسو صاف کیے۔

''اور گھر میں سب ٹھیک تھے۔ اظہر، مظہر شہلا اور بینا۔'' انہوں نے موضوع بدلا۔

''جی ٹھیک ہیں سب یہ عاقب کہاں ہے۔''

''وہ اپنے آفس کی طرف سے ایک ہفتے کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔''

''عاقب کو جاب مل گئی۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں اللہ کا شکر ہے اتنی اچھی تو نہیں مگر پھر بھی خدا نے سن لی دو ماہ ہو گئے اب تو۔ ناشتا تو کرو گے۔ انہوں نے محبت سے پوچھا تو میں، نہ، نہ کہہ سکا۔

''جی پھوپھو۔'' تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''امی! آپ بیٹھیں آپ کی طبیعت اچھی نہیں میں بنا لیتی ہوں ناشتا۔'' عائزہ اندر آ کر بولی۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں میرا بیٹا اتنی مدت کے بعد آیا ہے میں اس کے لیے خود ہی ناشتا بناؤں گی تم جا کر عمران اور فائزہ کو اٹھاؤ چھٹی کا یہ مطلب نہیں کہ پڑے سوتے رہیں۔'' پھوپھو نے کہا تو وہ مجھے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''عائزہ نے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے۔'' میں نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔

''نہیں آج چھٹی ہے نا ویسے چھوڑ ہی دے گی اگلے مہینے تک۔'' پھوپھو نے پراٹھا توے پر ڈالا۔

''کیوں کوئی اور جاب مل گئی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا اب کیا ساری عمر نوکری ہی کرتے رہنا ہے۔'' انہوں نے آملیٹ کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے کہا۔

''تو پھر۔''

''پھر کیا۔'' وہ چپ ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے ٹرے میں ناشتا میرے آگے رکھ دیا۔ پراٹھے کے ساتھ آملیٹ اور

گاجریں گوشت تھا میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''اس روز تم بھائی جان کے ساتھ آئے تھے آخری بار اس دن رات کو گاجریں گوشت پکا ہوا تھا مجھے یاد ہے۔'' پھوپھو نے میرے سانس بھرنے پر کہا۔

''جی۔''

''چلو کھاؤ نا۔'' میرے ایسے ہی بیٹھے رہنے پر انہوں نے کہا۔

''آپ بھی لیں نا۔''

''نہیں تم کھاؤ مجھے تو ڈاکٹر نے چکنائی سے منع کیا ہے ابھی عائزہ آتی ہے تو مجھے پھلکا بنا دے گی۔'' میں خاموشی سے کھانے لگا۔

میں ناشتا کر کے فارغ ہوا تو انہوں نے برتن اٹھا لیے۔

''اور تمہاری نوکری کیسی جا رہی ہے مجھے عاقب نے بتایا تھا۔''

''جی بس ٹھیک ہے۔''

''چلو اللہ کا شکر ہے مصروف تو ہوئے چائے پیو گے نا۔''

انہوں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا۔

''عائزہ کے لیے ایک بڑا اچھا پرپوزل آیا ہوا ہے بھائی جان ہوتے تو میں ان سے مشورہ کر لیتی۔ عاقب نے چھان بین تو کی ہے لیکن پتا نہیں کیوں دل نہیں مان رہا عاقب آخر بچہ ہی تو ہے، خیر لڑکا اچھا ہے بینک میں ملازم ہے چار بہن بھائی ہیں ایک بہن اور بھائی شادی شدہ ہیں اچھے لوگ ہیں کافی اصرار کر رہے ہیں میں سوچ رہی ہوں اگلے جمعہ کو ہاں کر دوں آخر کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی ہے جب وہ اتنی چاہت کر رہے ہیں تو۔''

انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''عائزہ نہیں مان رہی کہتی ہے ابھی تو عاقب کو سیٹ ہونے دوں پھر دیکھی جائے گی لیکن میں کہتی ہوں عاقب تو سیٹ ہوتا ہی رہے گا اچھے رشتے بار بار نہیں آتے اور نعمتوں کو ٹھکرانا نہیں چاہیے بس اسی وجہ سے کچھ دیر ہو رہی ہے ورنہ جتنا وہ لوگ اصرار کر رہے ہیں میں شاید آج ہی ہاں کر دیتی۔'' اور میں گم صم بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''اچھا پھوپھو میں چلتا ہوں۔'' میں ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا، کیا ہوا عمر بیٹا۔ چائے تیار ہے تم بیٹھو تو۔" وہ بوکھلا سی گئیں۔

"نہیں پھر پی لوں گا چائے اس وقت مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے خدا حافظ۔"

میں جلدی جلدی سے باہر نکل گیا دروازے سے عائزہ اندر داخل ہو رہی تھی میرا کندھا زور سے اسے لگا کہ وہ دروازے کی چوکھٹ سے جا لگی۔

"توبہ ہے دیکھ کر نہیں چلتے سر پھاڑ نا تھا میرا کیا۔" وہ بدلحاظی سے اونچی آواز میں بولی۔

"سوری۔ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔" میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور تیزی سے گیٹ طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

جب میں گھر میں داخل ہوا تو وہ چاروں ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔

"آؤ آؤ عمر کہاں چلے گئے تھے ناشتا کر لو۔" بینا بھابھی مجھے دیکھتے ہی خلاف توقع انتہا گرمجوشی میں بولیں۔

میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا لو گے جیم سلائس پر لگا دوں یا آملیٹ کے ساتھ۔" وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔

"تھینک یو میں نے ناشتا کر لیا ہے باہر ایک دوست مل گیا تھا اس کے ساتھ۔"

"اچھا چائے تو پیو گے۔" آج وہ پوری طرح نہال تھیں۔

"جی وہ دے دیں۔" جبکہ باقی تینوں ناشتے میں مگن تھے۔

"کیا بات ہے بھابھی آپ بہت خوش ہیں۔" مجھ سے رہا نہ گیا تو پوچھ ہی لیا۔

"ہاں بات ہی خوشی کی ہے۔" ان سے بھی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی جھٹ بولیں شہلا بھابھی نے فرائی انڈے کو کانٹے میں الجھاتے ہوئے ایک نظر بینا بھابھی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

وہ تمہارے بھائی کو آفس کی طرف سے ڈنمارک بھیجا جا رہا ہے ڈیپوٹیشن پر۔ چار سال کے لیے، اگلے ماہ جانا ہے فیملی کے ساتھ۔ ہے نا خوشی کی بات۔" وہ جلدی جلدی بولیں۔

"بالکل۔" میں نے چائے کا سپ لیا۔

"اور اب ہم سوچ رہے ہیں کہ اس گھر کا کیا کیا جائے۔" ان کی بات پر سب نے انہیں حیران ہو کر دیکھا۔

"کیوں ہم مر گئے ہیں جو تمہارے جاتے ہی یہ گھر ویران ہو جائے گا۔" شہلا بھابھی تلخی سے بولیں۔

"خدا آپ کو سلامت رکھے میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں دیکھیں نا وہاں جا کر ہمیں پیسے کی ضرورت ہو گی اور صاف بات ہے ہمارا جو اس گھر میں حصہ بنتا ہے وہ ہمارے حوالے کر دیں۔ اتنی سی بات ہے۔" ان کی بات سب کے لیے حیران کن تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو تم بینا۔" اظہر بھائی نے کہا۔

"کیوں اس میں حیرانگی والی کون سی بات ہے ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے۔" وہ سنگدلی سے بولیں۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا یہ ہمارے والدین کی نشانی ہے اور ہم اسے بیچ دیں۔"

"اظہر بھائی کی بات بینا بھابھی کی بات سے بھی زیادہ حیران کن تھی۔ "مظہر تم کچھ نہیں بولتے۔" وہ مظہر بھائی سے بولے۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے بھائی۔ آخر لوگ ساری زندگی تو کھنڈرات کو سینے سے لگا کر نہیں بیٹھتے نا۔" لگتا تھا دونوں میاں بیوی میں سارا معاملہ طے ہو چکا تھا۔

"میں تو اس کے حق میں نہیں ہوں۔" اظہر بھائی نے مجھے دیکھا جیسے مجھے رائے دینے کو کہہ رہے ہوں میں چپ رہا۔

"میرا تو خیال ہے بینا کا آئیڈیا اچھا ہے گھر بیچ کر تینوں برابر برابر رقم تقسیم کر لیتے ہیں جس کا جو جی چاہے وہ کرے۔" شہلا بھابھی بولیں۔

"نہیں اس بات کے لیے میں بالکل متفق نہیں ہوں۔" اظہر بھائی نے سب کو دیکھا۔ "پھر آپ ہمیں گھر کی قیمت لگوا کر رقم دے دیں ابھی جانے میں ایک مہینہ باقی ہے۔" بینا بھابھی بولیں۔

"ٹھیک ہے ایسا کر لیتا ہوں۔" اظہر بھائی فوراً مان گئے۔

"ٹھیک ہے پھر، ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔" بینا بھابھی اٹھ کھڑی ہوئی کچھ دیر بعد میں بھی اٹھ گیا۔

"عائزہ کا بڑا اچھا پروپوزل آیا ہوا ہے۔ میں آج ہی ہاں کر دیتی۔" میں کمرے میں آ کر ابو جی کی تصویر کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میرا خیال ہے تمہارے لیے عائزہ مناسب رہے گی اور یہ میری خواہش بھی ہے۔" ابو جی مسکرائے۔"

"ماموں جی عمر بھائی اسٹور میں چھپے ہوئے ہیں۔" میری پیٹھ پر کانٹے اگ آئے۔

"ہم یہ گھر بیچ دیتے ہیں تین برابر حصے رقم کے کر لیتے ہیں۔"

"ارے بڑی بدنصیب ہوتی ہے وہ اولاد جو ماں باپ کی نشانیوں کا بٹوارہ کرتی ہے اپنی جڑوں کو بیچنے والوں کو پھر کوئی زمین پناہ نہیں دیتی۔" ابو جی ایک بار اپنے دوست سلطان سے کہہ رہے تھے جن کے بھتیجوں نے ان کی بھائی کے مرتے ہی گھر اور فیکٹری بیچ کر رقم برابر بانٹ لی تھی میں وہیں بیٹھا تھا۔

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے ایک نہ ایک دن تو ہونا ہی ہے۔"

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے ایک نہ ایک دن تو تمہیں شادی کرنا ہی ہے۔" ابو جی پھر مسکرائے۔

"ہاں واقعی اس میں حرج ہی کیا ہے۔ پھوپھو کا کردار کلیئر ہو چکا ہے کبھی کبھی خواتین کی گھریلو، سیاست بچوں کے ذہنوں کو پراگندہ کر دیتی ہے ذرا سی رقابت ذرا سا حسد، ذرا سا بغض نسلوں کے ذہنوں میں زہر گھول جاتا ہے اور ہمیں اکثر اس کا احساس ہی نہیں ہو پاتا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں عائزہ ٹھیک ہے اور پھوپھو ہماری چاپلوسی کیوں کرنے لگیں انہیں کون سا جائیداد کا لالچ تھا یا ہم کوئی بہت اونچی شے تھے جسے ہتھیانے کے چکر میں تھیں وہ بس کبھی کبھی ہم محبت کو اوور اسٹیمیٹ کر جاتے ہیں بس ذرا سی اندازے کی غلطی!

ہاں ابو جی ٹھیک کہتے ہیں آخر اس میں حرج ہی کیا ہے اچھا ہی ہوا ابو جی آخری رات گھر نہیں آئے میں نے یقیناً انکار کر دینا تھا ان کا وقت تو وہی لکھا تھا البتہ پھر میں ان کی موت کا ذمہ دار ہوتا۔ اب جو میں خود سے یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ آ جاتے مجھے موقع دیتے تو میں یقیناً مان جاتا یہ جھوٹ ہے وہ جاتے جاتے بھی میرا بھرم رکھ گئے تھینک یو ابو جی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کی تصویر کو چوم لیا۔

میں اظہر بھائی کے کمرے کی طرف بڑھا کہ انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کروں۔

"وہ چلے جائیں ڈنمارک اور ہم یہاں پڑے سڑتے رہیں۔" شہلا بھابھی کا لہجہ آگ اگل رہا تھا۔

"تو تم بھی چلی جاؤ ان کے ساتھ۔" اظہر بھائی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"آپ انہیں کہاں سے دیں گے رقم۔" وہ بھنک کر بولیں۔

"اتنا اکاؤنٹ تو ہے میرا اور جو کمی ہو گی وہ تم بیلنس کر دینا۔" وہ آرام سے بولے۔

"اور وہ پیراسائیٹ (طفیلیا) وہ پیراسائیٹ کیوں ہونے لگا۔ برسر روزگار ہے۔" اظہر بھائی بولے۔

"برسر روزگار، ہونہہ چند ہزار کی نوکری اور گھر مفت میں مل جائے اسے اور ساری زندگی کا سر درد وہ ہمارے لیے رہے۔" ان کا لہجہ ہنوز زہر آلود تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو کھل کر کہو۔" اظہر بھائی تنگ آ کر بولے۔

"ٹھیک ہے اگر مظہر کو رقم دینی ہے تو دیں اور گھر بیچ دیں۔"

"میں گھر نہیں بکنے دوں گا۔" وہ غصے سے بولے۔

"تو پھر گھر کے تین حصے نہیں کریں گے اس گھر کے تقریباً تین چوتھائی حصے میں دیوار کر دیں اور باقی کا حصہ عمر کو دیں۔ جتنا مظہر کے حصے کی رقم دینے کے بعد اس کا حصہ بنتا ہے اتنے کی ملکیت اسے دیں۔" شہلا بھابھی کے والد سیاست میں تھے بیٹی ان کی جانشینی کے لائق تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو تم۔" اظہر بھائی الجھ کر بولے۔

"میں نے صاف صاف بتا دیا ہے اگر یہ نہیں کرنا تو گھر بیچ دیں ہم کہیں اور خرید لیں گے مگر میں ایک پائی کی قربانی نہیں دوں گی۔ یا تو عمر مظہر کی رقم میں حصہ ڈالے یا پھر اپنے حصے میں سے آدھے کی قربانی دے۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولیں۔

"ویسے کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ میرا خیال ہے یہی صحیح ہے مگر یہ بات عمر سے تم کرنا۔" اظہر بھائی بھلا مجھ سے کیوں گریزاں تھے میں حیران ہوا میرے لیے تو یہی خوشی کیا کم تھی کہ گھر فروخت ہونے سے بچ جائے گا چاہے مجھے اس کی چار اینٹیں ہی کیوں نہ ملیں ابو جی کے نام کی تختی تو لگی رہے گی نا شہلا بھابھی کی تجویز سے میں پوری طرح متفق تھا اس لیے خوشی خوشی باہر نکل آیا۔

☆☆☆

میں نے ڈور بیل بجائی تو تھوڑی دیر بعد عائزہ نے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر حیران ہوئی مگر مجھے راستہ دینے کی بجائے دروازے کے آگے کھڑی رہی۔

"تم کب سے چوکیدار ہو گھر کی، جب اور جس وقت بھی آ کر بیل بجاؤ تم فرشتے کی طرح
آموجود ہوتی ہو۔" میں نے کچھ بیزاری سے کہا حالانکہ میرے لب مسکرا رہے تھے۔

"جی صبح سے دو بار گیٹ میں نے ہی کھولا ہے اور دونوں بار کھولنے پر افسوس ہوا کہ کیوں
کھولا۔" وہ کون سا ادھار رکھنے والی تھی۔

"اب راستہ تو دو کیا دیوار بن کر کھڑی ہو گئی ہو۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے۔" وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"تم بھی نہیں ہو۔"

"میں ہوں اسی لیے آپ کو آنے کی اجازت نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پھوپھو کہاں ہیں۔"

وہ سامنے والوں کے گھر میں میلاد تھا فائزہ کے ساتھ ادھر گئی ہیں عمران کرکٹ کھیلنے گیا ہے

"اچھی بات ہے۔ بہرحال مجھے تم سے ہی ضروری بات کرنی تھی اور میں تمہیں کھا نہیں جاؤں
جو یوں تن کر کھڑی ہو راستہ دو۔" وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"عائزہ یہ میری پھوپھو کا گھر بھی ہے اور میرا خیال ہے اتنے مینرز تو تمہیں آتے ہی ہیں
وہ تھوڑا دوسری طرف کھسک گئی۔

"خیر ویسے تو آپ مجھے ہضم نہیں کر سکیں گے لیکن بات اصول کی ہے۔" وہ مجھے جتا کر
میں نے اسے جواب نہ دیا اور اندر جا کر لاؤنج میں بیٹھ گیا وہ دروازے تک آ گئی۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے۔" اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں پھوپھو آئیں گی تو پھر پیوں گا تم ذرا ادھر آ کر بیٹھو۔" میں نے دروازے کے پا
پڑی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ایک نظر مجھے دیکھ کر بیٹھ گئی۔

"سنا ہے آج کل تمہارے بڑے پرپوزلز آ رہے ہیں۔" میری بات پر اس نے تنگ کر
دیکھا۔

"پھر۔"

"پھر کیا انہیں اونگے بونگے پرپوزلز میں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو اس ناچیز کو بھی شا
لو۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"میں ادھر ہوں اس صوفے پر۔" تم مجھے کدھر تلاش کر رہی ہو۔"

"میں ناچیز کو ڈھونڈ رہی تھی کیونکہ آپ تو بڑی چیز ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "ویسے
آج سورج کدھر سے نکلا ہے ایک تو آپ کا زمین پر ظہور اور پھر یوں زمین سے مخاطب ہونا اچنبھے کی
بات ہے۔" اس نے طنز کیا۔

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔"

"جو آپ ہیں۔"

"جو تم مجھے سمجھتی ہو میں وہ نہیں ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور مجھے دوہرے چہرے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"میرے چہرے دوہرے نہیں ہیں تمہاری سوچ کا انداز میرے بارے میں صحیح نہیں ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میری سوچ کا انداز صحیح نہیں ہے۔" اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"تمہارے رویے سے۔"

"اور آپ کا رویہ۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے اپنے رویے پر۔" اس نے مجھے جتایا۔

"غور کیا ہے تو آیا ہوں۔" میں کچھ دیر بعد بولا۔

"صرف غور کیا ہے یا سوچ سمجھ کر آئے ہیں۔"

"غور سوچ سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے۔" میں چڑ کر بولا۔ "میں بھی خوب سوچ سمجھ کر آیا ہوں۔"

وہ چپ ہو گئی۔

"اب بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے۔" میں نے پھر سے پوچھا۔

"میں اپنے خیالات ہر کسی کو نہیں بتایا کرتی۔"

"میں ہر کسی نہیں ہوں۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"اپنے لیے نہیں ہوں گے میرے لیے تو ہر کسی ہی ہیں۔" وہ کون سا ہارنے والوں میں سے
تھی۔

"یہ دروازہ کھلا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔" پھوپھو کی آواز باہر صحن سے آئی۔

"پھر تم نے جواب نہیں دیا۔" اس کے اٹھنے پر میں نے بے صبری سے پوچھا اس نے ذرا غور
سے میری شکل دیکھی۔

"میرا تو خیال ہے میں نے جواب دے دیا ہے۔" وہ جانے کو مڑی۔

"کیا، کیا جواب دیا۔" میری بات بیچ ہی میں رہ گئی۔

"ارے عمر بیٹا تم۔" پھوپھو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"سلام پھوپھو۔" میں نے کچھ بے دلی سے سلام جھاڑا وہ باہر بھاگ گئی تھی۔

"بیٹھو میں ذرا سامنے گئی تھی پڑھتے پڑھتے طبیعت کچھ خراب ہوگئی تو میں فائزہ کو بٹھا کر آ گئی۔ تم کب آئے۔" وہ میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئیں۔

"میں بس ابھی تین چار منٹ ہوئے۔"

"کچھ کھایا پیا تم نے۔"

"ارے نہیں پھوپھو ابھی تو صبح کا پراٹھا ہضم نہیں ہوا۔" میں جلدی سے بولا۔

"اور سب ٹھیک ہے گھر میں۔" انہیں مجھے دوبارہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

"جی۔" وہ خاموش ہوگئیں۔

"پھوپھو آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" میں نے کچھ دیر بعد ہچکچا کر کہا۔

"ہاں کہو۔" انہوں نے محبت سے مجھے دیکھا۔

"اگر ابو جی زندہ ہوتے تو وہ خود یہ بات کرتے لیکن اب......" میں نے انگلیاں آپس میں پھنسائیں۔

"بیٹا تم بھی مجھے بھائی جان سے کم عزیز نہیں ہو جو کہو گے میں توجہ سے سنوں گی۔" ان کا کہنا ہی کافی تھا۔

"پھوپھو ابو جی نے اپنی وفات سے تقریباً ایک مہینہ بھر پہلے مجھ سے کہا تھا کہ۔" میں جھجکا وہ مجھے دیکھتی رہیں۔

"ہاں کیا کہا تھا انہوں نے۔" جب میں کچھ دیر نہ بولا تو انہوں نے پوچھا۔

"انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں۔ عائزہ سے شادی کرلوں اس کے لیے میں راضی نہ میں نے نظریں جھکا کر کہا وہ خاموش رہیں "ایک تو ابھی مجھے نوکری نہیں ملی تھی دوسرے میں ایسا مناسب نہیں سمجھتا تھا شاید میں ابھی ذمہ داری سر پر نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے انکار کر دیا انہوں نے سوچنے کو کچھ دن دیے اور آخری رات جب وہ گھر نہیں آئے میں نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر

مگر قدرت نے انہیں مہلت نہ دی اور اس کے بعد تو بات کرنے کا فائدہ ہی نہیں تھا کہ مجھے تقریباً چار پانچ ماہ بعد نوکری ملی تھی۔ اس لیے آج صبح آپ نے بات کی تو میں نے اس بات پر بہت سوچا اور پھر فیصلہ کر کے آپ کے پاس آ گیا اب جو آپ کہیں۔" میں نے اپنے فیصلے کی بات بیچ میں سے نکال کر سب کچھ بتا دیا۔

"ہوں۔" کافی دیر بعد انہوں نے ہنکارا ابھرا۔

"آخری رات جب وہ گھر نہیں گئے تھے ڈاکٹر کو چیک اپ کرانے کے بعد وہ ادھر آئے تھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے انہوں نے اس وقت مجھ سے تمہارے سلسلے میں عائزہ کے لیے بات کی تھی کہ ابھی تو تمہاری نوکری بھی نہیں لگی مگر اس کے باوجود فیصلہ کر چکے ہیں کہ دو چار ماہ میں اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے میں چپ رہی تو انہوں نے پوچھا کہ کیا یہ بات پسند نہیں آئی جو میں نے کہا بھائی جان آپ کی بات میرے لیے حرف آخر ہوتی ہے لیکن آپ کو عمر سے بھی پوچھنا چاہیے تھا تو انہوں نے کہا کہ اس کی تم فکر نہ کرو میں عمر سے بات کر چکا ہوں وہ راضی ہے تو میں نے بھی ہاں کہہ دی لیکن اگلے روز ان کی وفات کی خبر مل گئی پھر میں کوئی بھی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی پھر میں نے کتنے ماہ تمہارا انتظار کیا کہ اگر بھائی جان تم سے بات کر چکے تھے اور تم راضی تھے تو پھر تم ضرور آؤ گے آخر تھک کر میں نے اس رشتے کے بارے سوچنا شروع کر دیا اور شاید دو چار روز میں اقرار کر ہی دیتی کہ بیٹیوں کی مائیں اتنا لمبا انتظار نہیں کر سکتیں۔" ان کی بات اپنی جگہ بالکل درست تھی مجھے شرمندگی ہونے لگی ابو جی کو مجھ پر کتنا مان تھا۔ یہ تو اچانک صبح ادھر آنے کا خیال اگر میرے دل میں نہ آتا تو شاید پھر بہت دیر ہو جاتی پھوپھو ابو جی کو جھوٹا سمجھ بیٹھتیں اور آخری رات انہوں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ادھر ہی گزارا تھا۔ یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔

"پھر اب آپ کیا کہتی ہیں۔" میں کافی دیر بعد بولا۔

"میں نے کیا کہنا ہے بیٹا میں نے تو جو کہنا تھا بھائی جان سے کہہ چکی ہوں تم مجھے اس کائنات کے ہر رشتے سے زیادہ عزیز ہو تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر لبوں سے لگا لیا تو ان کی والہانہ محبت پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تھینک یو پھوپھو میں تو ڈر رہا تھا شاید آپ خفا ہوں کیونکہ میں نے کبھی بھی آپ کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔" میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''نہیں بیٹا بچے اکثر محبتوں کو صحیح طرح پہچان نہیں پاتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بڑے اپنے قدم پیچھے ہٹالیں یا ان کی نادانیوں کا جواب نفرت سے دینے لگیں تم کل بھی مجھے عزیز تھے آج بھی ہو۔ ہر شخص کے محبت کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے کوئی فوراً سب کچھ جتا دیتا ہے اور کوئی برس ہا برس کی ریاضت کے بعد دلوں میں بڑا گہرا اثر پیدا کر دیتے ہیں۔''

''اور پھوپھو آپ نے عائزہ سے بات کی۔'' میں آخری پھانس بھی نکال لینا چاہتا تھا۔

''عائزہ سے میں نے اسی رات بھائی جان کے کہنے پر دوسرے کمرے میں جا کر پوچھا تھا اسے ہم دونوں کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا تھا۔ اب اگر تم کہتے ہو تو دوبارہ پوچھ لیتی ہوں۔''

شاید اسی لیے وہ کہہ رہی تھی کہ وہ جواب دے چکی ہے۔ اسی وقت چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

''نہیں پھوپھو اس کی ضرورت نہیں کسی کو جتنا سر پر چڑھاؤ اس کا دماغ اتنا ہی عرش معلیٰ کو چھونے لگتا ہے۔'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا وہ جیسے سمجھ گئی ٹرے زور سے ٹیبل پر پٹخ کر باہر نکل گئی۔

اور مجھے یقین ہے آج ابو جی مجھ سے بہت خوش ہوں گے یہ میری زندگی کا پہلا فیصلہ تھا جو وہ کر تو چکے تھے مگر اقرار اور وہ بھی دل کی خوشی سے اقرار، انہوں نے مجھ سے کروایا اور اس رات کو جو افسوس آج بھی میرے دل میں ہے اب اس فیصلے کے بعد اس کا ملال بھی ختم ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے آج بس مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی اور مجھے بھی ان سے کوئی گلہ نہیں رہا۔ اگر وہ مجھ سے ایسا سلوک نہ کرتے تو شاید میں بہت پہلے کسی راستے کی خاک بن کر فضاؤں میں منزلوں کی تلاش میں سرگرداں ہوتا۔

''تھینک ابو جی۔'' چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے بے اختیار میرے منہ سے نکلا تو پھوپھو نے چونک کر مجھے دیکھا تو میں خود ہنس پڑا۔

☆☆☆

پھر موسم گل نے پکارا

''میری سمیطہ سے پہلی ملاقات یونیورسٹی میں کیفے کے پاس ہوئی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بری طرح رو رہی تھی۔ میں عثمان کے ساتھ اپنے ایم اے اکنامکس کے رزلٹ کا پتا کرنے آیا تھا۔ وہ اگست کے آخری دن تھے۔ دھوپ جتنی تیکھی تھی، حبس اس سے زیادہ شدید تھا۔ ہمارا پیاس کے مارے برا حال تھا۔ ہم پیپسی پینے کیفے ٹیریا کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ عثمان مجھ سے کافی آگے تھا، وہ چوتھے اسٹیپ کے آخری کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ پتا نہیں عثمان کی نظر اس پر پڑی تھی یا نہیں، میں البتہ ٹھٹھک گیا۔ اس کی دوست اس کے پاس کھڑی اسے چپ کروانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ اس پوزیشن میں بیٹھی ہلکی ہلکی سسکیوں سے رو رہی تھی جس سے اس کا سیاہ بالوں سے ڈھکا خوب صورت سر ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ پہلے میں نے بھی سوچا کہ اسے نظر انداز کر کے گزر جاؤں مگر کوشش کے باوجود میں ایسا نہ کر سکا اور۔''

مغیث احمد سانس لینے کے لیے رکا تو گٹار کے وائرز ٹائٹ کرتے ایاز نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور پھر خاموشی سے سر جھکا کر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

''اور میں نے پاس جا کر کہا...... ایکسیکوزمی مس! کیا آپ بتائیں گی کہ آپ اتنی گرمی میں کیوں رو رہی ہیں؟''

یا تو میں کچھ بوکھلا گیا تھا یا موسم کی شدت کا اثر تھا کہ اس جملے میں سب سے فضول لفظ گرمی تھا۔

مغیث خود ہی ہولے سے ہنسا۔

''میری آواز پر پہلے تو ایک لمحے کو اس نے اپنی سسکیاں روکیں اور پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ رونے سے اس کی بڑی بڑی کشادہ آنکھیں جیسے ڈھل گئی تھیں اور اتنے حبس کے باوجود یک بارگی مجھے

شبنمی صبح کا خیال آ گیا۔ بے بی پنک کاٹن کے سادے سوٹ میں اس کی سفید رنگت میں گلابیاں گھلی ہوئی تھیں اس سے پہلے کہ میں مکمل طور پر اس کے سادہ حسن میں غرق ہو جاتا۔ اس نے چیخ کر مجھے جواب دیا۔

''کیوں کیا گرمی میں رونا منع ہے؟'' اس کی آواز بھی جیسے آنسوؤں سے دھل کر نکلی تھی صاف، کھنک دار۔

''نہیں، منع تو نہیں ہے مگر اس طرح راستے میں بیٹھ کر یہ شغل فرمانا بھی تو کوئی قابل تحسین کام نہیں ہے۔'' میں نے ذرا سنبھل کر کہا۔

''اگر آپ کو اس جگہ بیٹھ کر یہ شغل فرمانا ہے تو ہم اٹھ جاتے ہیں۔'' وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔

''میرا یہ مطلب نہیں۔ آپ جہاں مرضی بیٹھ کر یہ شغل فرما سکتی ہیں پورا کیمپس خالی پڑا ہے۔''

''میں یہ کہہ کر تیزی سے دو سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا۔ جب ذرا سی کھسر پھسر کے بعد اس کی دوست نے مجھے آواز دی۔

''مسٹر! سنیے۔''

''جی فرمایئے۔'' میں نے واپس اترے بغیر ذرا سا مڑ کر کہا۔

''اصل میں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔'' وہ دو سیڑھیاں چڑھ کر میرے پاس آ گئی اور وہ نک چڑھی حسینہ نچلی سیڑھیوں پر کھڑی ٹشو پیپر سے ناک رگڑتے ہوئے سوں سوں کرتی رہی۔

''وہ ایڈمیشن ہو رہے ہیں نا ایم اے کے تو ہم اسی لیے آئے تھے۔ آفس کے باہر بے حد رش تھا۔ کھڑے کھڑے ہمارا حشر خراب ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ کچھ کھا پی آتے ہیں اتنے میں شاید رش کم ہو جائے ہم نے یہاں آ کر کولڈ ڈرنکس پی اور پھر واپس آفس چلے گئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ میری دوست کی فائل جس میں اس کے سارے اوریجنل ڈاکومنٹس تھے۔ وہ تو ہم یہیں بھول آئے ہیں۔ بھاگ بھاگ یہاں پہنچے فائل ڈھونڈی یہاں موجود تقریباً سب ہی لوگوں سے پوچھا مگر فائل ہمیں نہیں ملی اسی لیے۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

''اچھا تو کیا رونے سے مل گئی؟'' میں نے طنز سے کہا۔

''نہیں ملی۔'' وہ مایوسی سے بولی۔ ''پلیز آپ ہماری کچھ مدد کریں۔'' وہ لجاجت سے بولی۔

''آپ سے کس عقل مند نے کہا تھا کہ اوریجنل ڈاکومنٹس لے کر گھر سے نکلیں۔'' میں نے

سیڑھیاں اتر کر اس ناک رگڑتی حسینہ سے بولا تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا مگر خاموش رہی۔

''بس جلدی میں نکلے تھے سوچا تھا۔ یہیں سے فوٹو اسٹیٹ کروا لیں گے۔ کل داخلے کی آخری تاریخ ہے اب کیا کریں۔'' اس کی دوست نے بتایا۔

''خیر میں نے ان سے فائل کا کلر اور ڈاکومنٹس کی تفصیل پوچھی پھر میں نے اور عثمان نے ان کے ساتھ مل کر فائل ڈھونڈنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر دو گھنٹے کی سر توڑ تلاش کے باوجود ہم فائل نہ ڈھونڈ سکے۔

''اس میں پیسے تو نہیں تھے۔'' میں تھک کر پیچھے آتی سمیطہ اور اس کی دوست سے پوچھا۔

''ایک ہزار روپے تھے۔'' وہ مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولی۔

''اور یہ جو اتنی بڑی بڑی عمرو عیار کی زنبیلیں لٹکا رکھی ہیں آپ لوگوں نے کندھوں پر، یہ کس مرض کی دوا ہیں؟'' میں نے ان کے شولڈر بیگز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''ہو جاتی ہے۔ بندے سے بھول چوک۔'' وہ تنک کر بولی۔

''تو پھر بھگتیں جا کر، ہمیں کیوں ساتھ خوار کر رہی ہیں۔'' میں نے بھی تلملا کر کہا اور عثمان کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف نکل گیا۔

''اور پھر مزے کی بات بتاؤں، وہ فائل کہاں سے ملی؟'' مغیث نے مسکراتے ہوئے گٹار پر جھکے ایاز سے کہا۔

''کہاں سے؟'' ایاز نے سر اٹھائے بغیر غیر دلچسپ انداز میں پوچھا۔

''وی سی صاحب کے آفس کے باہر جو پیون تھا، وہ یہ فائل ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ ہم آفس کی طرف جا نکلے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ فائل پیون سے لی اور شام کو میں اس کے گھر وہ فائل دینے گیا تو ڈاکٹر گیٹ سے باہر آ رہا تھا۔ ساتھ میں اس کے والد صاحب تھے میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور آنے کی وجہ بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔''

''اس بیوقوف لڑکی نے تو رو رو کر اپنا حشر کر لیا ہے ایک سو چار بخار ہے دوپہر سے اسے۔'' اس کے والد نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے بتایا تو میں نے فائل ان کے حوالے کی۔

''کل تو داخلے کی آخری تاریخ ہے سمیطہ کیسے جائے گی یونیورسٹی۔ اس کا بھائی بھی گھر پر نہیں ہے آج کل۔ بیٹا! یہ تم فارم فل کر کے آفس میں جمع کروا دینا۔'' وہ بولے تو میں کچھ جھجک گیا۔

''جی میں۔''

''ہاں ہاں تم۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی اگر تم یہ زحمت کر دو تو۔'' اور پھر میں نے وہیں بیٹھ کر

اس کا فارم فل کیا اور اگلے روز جا کر آفس میں فارم جمع کروا کے اس کی نمبر سلپ لی اور سلپ دینے کے لیے دوبارہ اس کے گھر گیا تو۔"

"Hey men what are you doing

It's time of your duty please

take your seats"

(آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں، یہ کام کا وقت ہے۔ پلیز اپنی سیٹوں پر جائیں)

مسٹر پیٹر نے ہال میں جھانکتے ہوئے ان دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر زوردار آواز میں کہا تو وہ گڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ مغیث نے ٹائم دیکھا، پب کے کھلنے کا وقت ہو چلا تھا۔ ویٹرز فرش کی صفائی کر چکے تھے اور اب میزوں کو از سر نو جھاڑا جا رہا تھا۔ ایاز گٹار اٹھا کر میوزک روم کی طرف چل پڑا اور مغیث کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"میرا خیال ہے، گیٹ کی بیل بج رہی ہے۔" رابعہ نے کروٹ بدل کر پاس سوئے اقبال صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "ایک بج گیا ہے اس وقت بھلا کس نے ہونا ہے میرا وہم ہوگا۔"

انہوں نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر سے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگیں کہ پھر سے بیل کی آواز سنائی دی اس دفعہ گھنٹی کا دورانیہ طویل تھا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔

"باہر دروازے کی بیل بج رہی ہے۔ اٹھ کر دیکھیں کون ہے۔" انہوں نے اقبال صاحب کو بازو سے ہلاتے ہوئے کہا تو انہوں نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"کون؟ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔" وہ لیٹے لیٹے سستی سے بولے۔ "میرا خیال ہے تمہیں وہم ہوا ہے۔"

"نہیں، میں نے خود دوبارہ آواز سنی ہے۔ آپ اٹھیں تو۔" وہ زور دے کر بولیں تو وہ اٹھ بیٹھے اور کچھ بےزاری کے عالم میں سلیپر پہننے لگے کہ پھر گھنٹی بج اٹھی تو رابعہ بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئیں اور دونوں آگے پیچھے باہر نکل گئے۔"

اقبال صاحب گیٹ کھول کر حیران رہ گئے۔

"پنکی! تم اس وقت؟ خیریت تو ہے بیٹا۔ اتنی رات کو؟" ان کی نیند سے بوجھل آنکھیں جیسے حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، وہ سیاہ چادر میں سارا وجود ڈھانپے کھڑی تھی۔

"جی۔ خیریت ہے۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا اور انہیں ذرا سا ہٹاتے ہوئے اندر کی طرف

بڑھی۔

انہوں نے حیرانی سے گیٹ سے باہر جھانکا۔ سنسان سڑک سائیں سائیں کر رہی تھی دور ایک موٹر بائیک کی لائیٹس اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں، وہ گیٹ بند کر کے واپس پلٹے تو وہ دور جا چکی تھی اور حیران پریشان سی رابعہ اس کے پیچھے گئی تھیں۔

"پنکی بیٹا! خیر تو ہے۔ اس وقت اتنی رات کو تم اکیلی آئی ہو؟" وہ لاؤنج میں پہنچی تھی کہ رابعہ نے پیچھے سے بےتاب ہو کر پوچھا تو اس نے پلٹ کر انہیں سپاٹ نظروں سے دیکھا۔

اس کی آنکھیں بےتاثر سی تھیں۔ البتہ ناک کی نوک ابھی تک سرخ تھی اور چہرہ آنسوؤں سے دھلا ہوا تھا۔

"اگر آپ لوگ میرے آنے سے اس قدر ہراساں ہو رہے ہیں تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔" خشک لہجے میں کہہ کر وہ واپس مڑی۔

"کیا کہہ رہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، کیا جھگڑا ہوا گیا ہے گھر میں؟" وہ گھبرا کر پاس آ کر بولیں اور ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی کو چھونا چاہا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"گھر کون سا گھر؟" اس کا لہجہ ڈرا دینے کی حد تک سنسان تھا۔ رابعہ حقیقتاً پریشان ہو گئیں۔

"تم آئی کس کے کے ساتھ ہو؟" اقبال صاحب اندر آ کر بولے۔

"اکیلی آئی ہوں اور اکیلی جا بھی سکتی ہوں اگر آپ لوگوں نے اسی طرح مجھ پر جرح جاری رکھی تو۔" اس کا لہجہ دھمکی سے آگے کا پتا دے رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر چپ کر گئے۔

"پھر بھی اس وقت آنا، صبح بھی تو۔" رابعہ نے ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا صبح، کیا رات، مجھے اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔" وہ بیزار لہجے میں کہہ کر اندر کی طرف بڑھی اور کاریڈور سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور وہ دونوں حیران پریشان سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"میرا تو دل گھبرا رہا تھا۔ خدا خیر کرے۔" رابعہ پریشانی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"یقیناً کوئی جھگڑا ہوا ہوگا۔" اقبال صاحب بھی بیٹھ گئے۔

"ظاہر ہے ورنہ یہ اتنی بیوقوف تو نہیں ہے کہ اکیلے اس وقت نکل کھڑی ہو کوئی سیریس بات ہی ہوگی۔" رابعہ نے تائید کی۔

"پتا نہیں ادھر کسی کو بتا کر بھی آئی ہے یا نہیں۔ کہیں وہ لوگ بھی پریشان نہ ہو رہے ہوں۔ تم فون کر کے پتا تو کرو۔" اقبال صاحب بولے۔

''اب جب تک اس کا غصہ نہیں اترے گا کچھ نہیں بتائے گی۔'' رابعہ اس کی طبیعت سے واقف تھیں۔

''تم اٹھ کر فون کرو۔ ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' اقبال صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

''پتا نہیں کیا بات ہو۔ کیا خبر کوئی زیادہ سیریس بات ہو اور جب تک پنکی نہیں بتائے گی میں ان کی کسی بات کا کیا جواب دوں گی اور پھر اس وقت فون کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔'' وہ تامل سے بولیں۔

''اس وقت اس کا اکیلے آنا فون کرنے سے زیادہ بڑی بات ہے تم اٹھ کر فون کرو۔'' وہ بے چینی سے کھڑے ہو کر بولے۔

''کوئی ادھر فون نہیں کرے گا اور نہ جائے گا۔ اگر آپ لوگوں نے ایسا کیا تو میں گھر چھوڑ کر کہیں نکل جاؤں گی یا زہر کھا لوں گی۔'' پتا نہیں وہ کس وقت سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ دروازے میں آ کر سخت لہجے میں بولی تو وہ جیسے ٹھہر گئے۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ، کیا بات ہوئی ہے۔؟'' رابعہ جھنجلا کر بولیں۔

''کوئی بات نہیں ہے بلکہ اب تو کوئی بات رہی ہی نہیں ہے میں سب کچھ ختم کر آئی ہوں۔ میں اب، دوبارہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کروں گی۔'' اس کی آواز اونچی تھی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا بات کر رہی ہو؟'' رابعہ غصے سے بولیں۔

''جو آپ کو سنائی دے رہا ہے۔ آپ بتائیں، مجھے یہاں پناہ دیں گی یا میں ابھی چلی جاؤں؟'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی تو اقبال صاحب اس کے تیور دیکھ کر آگے بڑھے۔

''اچھا ٹھیک ہے، تم جا کر آرام کرو۔ صبح دیکھیں گے۔ اب کوئی فون نہیں کرے گا۔ تم سو جاؤ جا کر۔'' وہ اس کے پاس آ کر ذرا نرمی سے بولے تو اس کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا اور وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

''پتا نہیں کیا کر آئی ہے۔ یا اللہ خیر۔'' رابعہ نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اللہ خیر کرے گا۔ اب چھوڑو۔ صبح دیکھیں گے۔'' وہ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

''یاسمین اور عظمیٰ پوچھیں گی صبح تو ان سے کیا کہیں گے۔'' رابعہ کو ایک اور فکر ستانے لگی اقبال صاحب کے قدم بھی رک گئے۔

''کہہ دینا۔ رات کو حسیب کے ساتھ آئی تھی اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو اسے ہم بہت دیر تک چھپا نہیں سکیں گے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولے ''اور ویسے تم اسے بھی زیادہ نہ کرید نا وہ غصے میں تو ہے

لیکن پریشان زیادہ ہے خود ہی سب کچھ بتا دے گی تم اصرار نہ کرنا۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے تو رابعہ آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''دیکھوں سو گئی ہے یا نہیں۔'' وہ باہر نکل کر اس کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ بند تھا انہوں نے ہلکا سا دھکیلا مگر اس نے شاید اندر سے لاک لگا لیا تھا وہ کچھ دیر کھڑی رہیں پھر واپس مڑ گئیں۔

☆☆☆

''اگرچہ ابھی ہمارا رزلٹ آؤٹ ہونے میں کم از کم مہینہ باقی تھا مگر میں تقریباً ہر روز یونیورسٹی جانے لگا۔ میرا جی چاہتا کہ ایک بار پھر سے ایڈمیشن لے لوں اور ایک چکر انگلش ڈیپارٹمنٹ کا ضرور لگاتا۔ پریولیس کی کلاسز ابھی اسٹارٹ نہیں ہوئی تھیں اور میں یونہی مٹرگشت کر کے واپس آ جاتا ایک اور بار خیال آیا کہ اس کے گھر خیریت پوچھنے کے بہانے چلا جاؤں مگر پھر ہمت نہیں پڑی۔''

''تم سو رہے ہو۔؟'' مغیث نے آنکھوں پر بازو رکھے چپ چاپ لیٹے ایاز سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے بازو ہٹائے بغیر بے تاثر سا نہیں، کہا تو مغیث نے سلسلہ گفتگو پھر سے جوڑ دیا۔

''پھر پریولیس کی کلاسز اسٹارٹ ہونے کے دوسرے روز ہی وہ مجھے اپنی اسی دوست کے ساتھ کاریڈور میں جاتی مل گئی۔ میں نے اس کی خیریت دریافت کی، پہلے روز کے برخلاف وہ بڑی شائستگی سے مجھے جواب دیتی رہی۔ اس نے میرا شکریہ بھی ادا کیا کہ میں نے اس کے ایڈمیشن فارم جمع کروائے تھے۔ اس کی دوست نے بھی میرا شکریہ ادا کیا پھر ان کی کلاس ہونے والی تھی۔ وہ معذرت کر کے کلاس لینے چلی گئیں اور میں فرحاں وشاداں واپس آ گیا۔

پھر ہفتے میں ایک آدھ دن میں ان کے ڈیپارٹمنٹ کا چکر ضرور لگاتا کبھی کسی دوست سے ملنے کے بہانے کبھی کسی پروفیسر کے اور ایک دن وہ مجھے دور سے آتے دیکھ کر ہنس پڑی اور جب میں پاس پہنچا تو ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''مغیث صاحب! آپ کو کیوں وہم ہو گیا ہے کہ ایک دو دن بعد میرا حال خراب ہو جاتا ہے یا میری طبیعت گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ آپ یقین کریں میں بالکل خیریت سے ہوں اور انشاءاللہ آئندہ بھی رہوں گی اور آپ کی خیریت کی بھی دعا کرتی ہوں۔ اب اس سے آگے بات شروع کریں۔''

اس کی شوخ ہنسی اور ذومعنی بات نے مجھے گڑبڑا دیا اور پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔''

بات کرتے کرتے اس نے ایاز کی طرف دیکھا تو اس کے ہلکے ہلکے خراٹے اسے سنائی دیے۔ مغیث بل کھا کر رہ گیا۔

"لعنت ہو تم پر۔" کہہ کر اس نے تکیہ گھسیٹا اور سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اس میں نہ تو ایا
نیند کا قصور تھا اور نہ مغیث کی داستان گوئی کا۔ ایاز اس کی یہ کہانی کوئی بیسویں بار سن رہا تھا۔ سار
واقعات اسے ازبر ہو چکے تھے اور مغیث بیچارہ کیا کرتا، ایاز کے سوا وہ یہ کہانی اور کسے سناتا، ایاز کے
اس کا کوئی دوست بھی نہیں تھا یہاں۔

وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ
غافل ہو گیا۔ ابھی اسے سوئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ ان کے فلیٹ کے باہر کسی کے زور زور
چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسی آوازیں ہیں نیند کے غلبے سے و
ہی حواس معطل ہوئے جا رہے تھے مگر جب باہر شور بڑھا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف ایاز بھی لا
سرخ آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیسی آوازیں ہیں؟" اس نے نیند سے بوجھل بھاری کندھے اچکائے۔

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی

"دروازہ کھولو۔ خدا کے لیے دروازہ کھولو۔" آواز کسی لڑکی کی تھی۔

مغیث نے ایک نظر ایاز کو دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایاز بھی
کے پیچھے اٹھ آیا۔ اس نے جیسے ہی لاک میں چابی گھما کر دروازہ کھولا کوئی دھڑام سے اس کے اوپر آگ
وہ حواس یافتہ ہو کر پیچھے ہٹا مگر گرنے والے نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ میں آپ لوگوں کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں اس درندے سے مجھے
لو۔" چیخنے کی وجہ سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی اس کے درندہ، کہنے پر انہوں نے باہر کی طرف دیکھ
پچیس چھتیس سالہ ایک نوجوان اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر وہ لڑکی مغیث سے چمٹ گئی تو مغیث گھبر
اس نے مدد طلب نظروں سے اپنے پاس کھڑے ایاز کی طرف بے بسی سے دیکھا تو ایاز آگے بڑھا۔

"دیکھیں بی بی! یہ کوئی طریقہ نہیں ہے مدد مانگنے کا۔ آپ ٹھیک سے بات کریں کیا
ہے؟" اس نے لڑکی کے کندھے سے اس کی شرٹ کا کونہ پکڑتے ہوئے مغیث کو اس کی گرفت
چھڑانا چاہا۔

"نہیں، نہیں۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے بچا لو۔" وہ اور زور سے بولی اور مغیث کے باز
اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

"تم لوگ بیچ میں مت آؤ، یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ رابیل چلو گھر۔ کیوں تماشا لگا
ہو۔" وہ آدمی آگے بڑھ کر اپنے غصیلے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اس لڑکی کے قریب آ کر بولا۔

"نہیں، نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی یہ مجھ سے غلط کام کروانا چاہتا ہے، یہ مجھے مار دے گا۔ مجھے
بچا لیں۔" وہ اپنے ساتھ مغیث کو گھسیٹتی ہوئی کمرے کے وسط میں لے آئی۔

مغیث کے اتنی سردی میں پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے زور سے لڑکی کو پرے دھکیلا اور خود
تیزی سے اس آدمی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، شاید ان دونوں کے درمیان پہلے باقاعدہ، جنگ وجدل ہو
چکی تھی اور اس لٹکتی ہوئی دھجی پر ان کی نظر پہلی بار پڑی تھی مغیث نے تو جلدی سے نظریں چرا لیں البتہ ایاز
نے آگے بڑھ کر بیڈ پر پڑی چادر اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی تو اسے بھی جیسے یاد آ گیا، اس نے جلدی
سے چادر لے کر اپنے اوپر لپیٹ لی۔

"دیکھیں جی، معمولی سی بات ہے۔ میرے کچھ دوست آئے تھے انہیں نے پی کر کچھ ہلا گلا کیا
تو اس گاؤدی نے طوفان اٹھا دیا۔ یہاں تو جی یہی کچھ ہوتا ہے مگر یہ لوگ پاکستان سے چل پڑتے ہیں
امریکہ میں رہنے اور ساتھ میں ٹنوں کے حساب سے یہ منحوس شرم وحیا بھی ساتھ لے آتے ہیں۔ میرے
ایک دوست نے ذرا سا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نیک پروین نے ہنگامہ کر دیا۔ ان لوگوں کے سامنے میری جو سبکی
ہوئی، وہ علیحدہ ہے۔" وہ آدمی خونخوار نظروں سے لڑکی کو گھورتے ہوئے بظاہر نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"جھوٹ مت بولو غلیظ انسان!" لڑکی غرائی "یہ ان لوگوں سے پوری ڈیلنگ طے کر کے انہیں
لایا تھا۔ آپ خدا کے لیے مجھے آج کی رات اس سے بچا لیں کل میں اپنا کوئی بندوبست کر لوں گی۔" وہ
ایاز کے پیچھے ہوتے ہوئے منت آمیز لہجے میں بولی۔

"رابیل! کیوں اپنا اور میرا تماشا بنوا رہی ہو۔ چلو گھر، وہ لوگ تو کب کے جا چکے ہیں۔" وہ
آدمی اس کی طرف بڑھتے ہوئے ذرا نرمی سے بولا۔

"ہرگز نہیں۔ میں اس کھڑکی سے کود کر جان دے دوں گی مگر تمہارے جیسے نیچ اور گھٹیا کے
ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

اس کی نظر شاید کھڑکی پر اسی وقت پڑی تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر کھڑکی کی طرف بڑھی، ایاز اور
مغیث کی جان ہی نکل گئی اس کے کھڑکی سے کودنے کا صاف مطلب ان دونوں کے لیے جیل یا موت
تھا۔ ایاز تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"دیکھیں محترمہ! اگر آپ کو یہ شوق فرمانا ہی ہے تو اپنے فلیٹ میں جا کر فرمائیں ہمیں کیوں
مروانا چاہ رہی ہیں ساتھ۔" وہ کھڑکی کے آگے کھڑا ہو گیا۔

"تو پھر آپ لوگ مجھے پناہ دیں۔ میں اس کے ساتھ کسی صورت نہیں جاؤں گی۔" وہ ڈٹ کر
بولی۔

"آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کہیں نہیں لے جا سکتا، یہ امریکہ ہے، یہاں
جبری کام نہیں کروائے جا سکتے۔" ایاز نے طنز بھرے لہجے میں اس آدمی سے کہا۔

"آپ آرام سے بیٹھ کر ہمیں بتائیں کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔" اس نے رابیل سے کہا۔

"میں بتاؤں گی سب آپ کو مگر پہلے اس معلون سے کہیں، یہاں سے دفعان ہو جائے
بتاؤں گی۔" وہ اس آدمی کو دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولی۔

"میں تمہیں یہاں سے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ سنا تم نے۔ تم میری بیوی ہو۔ کوئی مذا
نہیں۔ چلو میرے ساتھ۔ بہت ڈرامہ ہو گیا۔"

وہ سختی سے کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تو لڑکی نے جھپٹ کر کھڑکی کھول دی برف م
ڈھلی ہوئی ہوا کا سرد جھونکا اندر آ گیا تو ایک پل میں ان کے جسم میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔

"کھڑکی بند کر دیں۔" مغیث نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کرنا چاہی مگر وہ اس کے
مضبوطی سے تھام کر کھڑی ہو گئی۔

"میں کھڑکی اس وقت تک بند نہیں کروں گی جب تک یہ یہاں سے نہیں جائے گا ورنہ
مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ انہیں دھمکاتے ہوئے بولی۔

ایاز نے ایک نظر لڑکی کے فیصلہ کن انداز پر ڈالی اور دوسری نظر غصے سے بھرے اس شخص
ڈالی۔

"کیا کہتے ہیں آپ پھر؟" اس نے اس آدمی سے کہا۔

"اس کی تو ایسی کی تیسی۔" وہ دانت پیس کر آگے بڑھا تو ایاز نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

"میرا خیال ہے۔ فضول غصہ کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اس وقت آپ واپس
جائیں۔ صبح یہ خود ہی آ جائیں گی آپ کے پاس یا ہم چھوڑ جائیں گے۔ ویسے بھی دن نکلنے میں دو اڑ
گھنٹے ہی تو ہیں۔" ایاز نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ اس میں شرم کی بات نہیں۔ میرے دوست تمہارے لیے وحشی درندے تھے اور ا
جوان دونوں کے پاس رہنا چاہ رہی ہو؟" وہ اس لڑکی کے پاس آ کر تیوری چڑھا کر معنی خیز انداز
پھنکارا۔

"تم گندی ذہنیت کے مالک ہو تمہارا ہر خیال گندگی سے جنم لے گا۔ اگر ایسا ہے بھی تو یہ میری
مرضی ہے۔ تم ہی تو کہتے ہو کہ یہاں ہر کوئی اپنی مرضی سے جیتا ہے میں بھی اپنی مرضی سے یہاں رہ
ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی تو وہ آدمی اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو، اس ریت کی دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر مجھ سے بچ جاؤ گی تو یہ تمہاری
بھول ہے۔ میرا حق تم پر ثابت ہے۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"حق تھا، اب نہیں ہے اور ثابت تو میں تمہیں کرواؤں گی کہ کون ریت کی دیوار ہے۔ تمہاری
ہوس یا میری مضبوطی۔" لڑکی اسی کے لہجے میں دو بدو بولی تو وہ آدمی اسے گھورتے ہوئے باہر کی طرف
بڑھا۔

"اسے میری کمزوری نہ سمجھنا۔ تم جیسی بہت دیکھی ہیں میں نے سمجھ لوں گا تمہیں بھی۔"

وہ دھمکی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا، وہ لڑکی زمین پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی۔ اس کے اس طرح اچانک تبدیل ہو جانے پر وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت اور تشویش سے
دیکھنے لگے۔

☆☆☆

اس رات کی صبح بھی عجیب سی تھی۔ خاموش اور پراسراری۔ اگرچہ گھر میں روزانہ کی طرح شور
ہنگامہ برپا تھا۔ بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ یاسمین اور عظمیٰ جلدی جلدی کچن میں ان
کے ناشتے کا انتظام کر رہی تھیں۔ عظمیٰ کو تو اسکول بھی جانا ہوتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ کچن میں ہوتی اور
دوسری اپنے کمرے میں، اس کے دونوں بچے ابھی چھوٹے تھے ایک پہلی میں اور ایک پریپ میں۔ ان
دونوں کو تیار کرنا اور پھر فہیم کی تیاری کا ہنگامہ۔ یاسمین کے تینوں بچے بڑے تھے، اس لیے وہ خود ہی تیار ہو
جاتے تھے اور عظیم کو ویسے بھی فیکٹری ذرا دیر سے جانا ہوتا تھا اور اقبال صاحب اس کے بعد تقریباً دس
گیارہ بجے فیکٹری جایا کرتے تھے۔ اس لیے وہ ذرا دیر سے اٹھ کر آتے تھے مگر آج وہ بھی صبح ہی سے
چپ چاپ لاؤنج میں اردگرد ہونے والے شور سے بے نیاز بیٹھے تھے اور رابعہ تین بار صبح سے پنکی کے بند
دروازے کے چکر لگا چکی تھیں۔

"امی! میری جرسی نہیں مل رہی۔" علینہ نے کچن میں آ کر انڈہ فرائی کرتی یاسمین سے کہا۔

"کمرے میں دیکھو، وہیں ہو گی۔" یاسمین نے مصروف انداز میں کہا۔

"نہیں ہے۔ میں دیکھ چکی ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے ڈھونڈ کر دیں۔" علینہ بیزاری سے
بولی۔

"میں کہاں ڈھونڈوں۔" اس نے انڈا پلیٹ میں رکھا "ہاں یاد آیا، وہ امی کے ساتھ والے
کمرے میں کل عظمیٰ نے رکھی تھی جب تم اسے لاؤنج میں اتار کر پھینک گئی تھیں، وہیں دیکھو جا کر۔" تو
علینہ باہر نکل گئی۔

''امی! وہ کمرے کا دروازہ تو لاک ہے، پتا نہیں اندر کون ہے۔'' علینہ چند لمحے بعد پھر کے سر پر کھڑی تھی۔

''وہ کس نے لاک کر دیا، وہاں تو کوئی نہیں سویا۔'' یاسمین حیرت سے بولی۔ ''اچھا چلو دیکھتی ہوں۔'' اس نے ناشتے کی ٹرے ڈائنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے باقی بچوں کو آواز لگائی اور کمرے طرف بڑھی۔

دروازہ واقعی لاک تھا، اس نے دوبارہ دستک دی مگر وہاں مکمل خاموشی تھی۔

''امی! یہ کمرہ کیوں لاک ہے۔ کوئی اندر ہے؟'' یاسمین نے لاؤنج کے دروازے پر کھڑ ہوکر رابعہ سے پوچھا۔

''ہیں۔ کون سے کمرے میں۔'' وہ جیسے غائب دماغی سے بولیں پھر انہیں یاد آ گیا ''ہاں آئی ہوئی ہے رات سے طبیعت اس کی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ شاید ابھی تک سو رہی ہے۔'' وہ کچھ اٹ بولیں۔

''پنکی آئی ہے کب؟'' یاسمین حیرت سے بولی ''ہمیں تو پتا نہیں چلا۔ اکیلی آئی ہے بچے آئے ساتھ؟'' وہ ذرا پاس آ کر بولی۔

''ہاں، وہ حبیب کے ساتھ آئی تھی۔ بچے گھر پر ہی چھوڑ آئی ہے اپنی طبیعت اس کی کچھ نہیں تھی اس لیے ڈاکٹر کے ہاں سے سیدھا ادھر ہی آ گئی۔'' وہ بہو سے نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔

''دادو! میری جرسی ہے اندر کمرے میں، مجھے اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' علینہ دونو ڈائیلاگ سے اکتا کر بولی۔

''تو بیٹا! دروازہ کھٹکھٹا لو، کھول دے گی یا پھر میں دیکھتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ ہوئیں۔ پھر انہوں نے کتنا ہی دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

''بیٹا! تم کوئی دوسری جرسی پہن جاؤ۔ شاید دوائی میں نیند زیادہ ہو۔ اس لیے ا کرنے دو۔'' رابعہ نے برے برے منہ بناتی علینہ سے کہا۔

''دوسری جرسی تو گندی ہے دادو!'' وہ پیر پٹخ کر بولی۔

''اچھا کچھ نہیں ہوتا اگر ایک دن گندی جرسی پہن جاؤں گی تو۔'' وہ ذرا سختی سے جھنجھلاتے ہوئے واپس مڑ گئی۔

پھر جو بھی ناشتہ کرنے آتا، پنکی کی اچانک آمد کا سن کر حیران ہوتا۔ رابعہ بہانے گھڑ اور اقبال صاحب خاموشی سے ان کے جھوٹ سنتے رہتے۔

''کم از کم چھوٹو کو تو لے آتی۔ وہ چھوٹا سا بچہ رات سے اکیلا پریشان ہو گیا ہو گا؟'' یاسمین نے کہہ ہی دیا۔

''ارے بھابی! وہاں ہیں سب، وہ سنبھال لیں گے۔ ہو سکتا ہے پنکی کی طبیعت زیادہ خراب ہو، اب میں دوبارہ گئی ہوں مگر وہ شاید گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ مجھے اسکول سے دیر ہو رہی ہے امی! آپ میری طرف سے اسے پوچھ لیجئے گا اور اسے جانے نہ دیجئے گا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔''

''عظمٰی جلدی جلدی بچوں کا لنچ پیک کرتے ہوئے بولی۔ تھوڑی دیر میں اس کی وین آ گئی وہ دونوں بچوں کو لے کر چلی گئی۔ بڑے بچے بھی ان کے ساتھ ہی نکل گئے۔ علینہ اور نبیل پہلے ہی جا چکے تھے۔ اس کے بعد باری باری فہیم اور عظیم بھی نکل گئے۔ اب اقبال صاحب سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے جائیں یا پنکی کے اٹھنے کا انتظار کریں۔

''میرا خیال ہے، اب اسے اٹھ جانا چاہیے۔ اتنی دیر تک خالی پیٹ پڑے رہنا اچھی بات نہیں میں اٹھاتی ہوں جا کر۔'' یاسمین بے یقینی سے بولی اور پنکی کو اٹھانے چل پڑی۔

اور تھوڑی دیر میں مایوس لوٹ آئی، اقبال صاحب اس سے کچھ پوچھے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

''امی! ایسا بھی کیا طبیعت کا خراب ہونا کہ اس نے دروازہ ہی لاک کر لیا ہے۔ آپ بلا کر انہیں میرے تو دل کو کچھ ہو رہا ہے۔'' یاسمین رابعہ کے پاس آ کر بولی۔

''ہوں!'' رابعہ ایسے ہی بیٹھی رہیں۔

''کہیں کوئی جھگڑا وگڑا تو نہیں ہو گیا گھر میں؟'' وہ پاس بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔

''شاید...... اس نے کچھ بتایا نہیں۔'' رابعہ نظریں چرا کر بولیں۔

''ہوں، یہی بات ہو گی ورنہ اتنی رات گئے آنا اور وہ بھی بچوں کے بغیر اور پھر یوں سوئے رہنا خدا خیر کرے۔'' یاسمین کا انداز جتانے والا تھا۔

''وہ تو پتا نہیں کب سو کر اٹھے۔ آپ تو ناشتہ کر لیں۔ لے آؤں؟'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں، ابھی رہنے دو۔ میرا جی نہیں چاہ رہا۔'' رابعہ بے دلی سے بولیں تو یاسمین ٹیبل سے برتن سمیٹنے لگی۔

پھر بارہ بجے کے قریب پنکی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا

اور آنکھیں لال سرخ۔ شاید وہ ایک پل کو بھی سو نہیں سکی تھی۔ اقبال صاحب اس کے اٹھنے کا انتظار کر کے ابھی نکلے تھے رابعہ ڈائننگ ٹیبل پر سبزی رکھے بنا رہی تھیں۔

''امی! پنکی آ گئی ہے اٹھ کر۔'' یاسمین نے کچن کی کھڑکی سے اسے لاؤنج کی طرف جا... دیکھ کر انہیں اطلاع دی۔

''اچھا!'' انہوں نے چھری ہاتھ سے رکھ دی اور شاید اٹھنے لگی تھیں مگر پھر کچھ سوچ کر سبز... بنانے لگیں۔ ''جاؤ اسے ناشتے کا پوچھ لو۔''

''کیا حال ہے پنکی؟ رات پتا ہی نہیں چلا کہ تم کب آئیں۔؟'' یاسمین نے صوفے پر گم... بیٹھی پنکی کو مخاطب کیا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' کچھ دیر بعد وہ مدھم آواز میں بولی۔

''بچے نہیں آئے ساتھ؟'' وہ پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''طبیعت ٹھیک ہے اب تمہاری؟ بڑا سوئیں کون سے ڈاکٹر کو دکھا کر آئی تھیں۔''

یاسمین نے ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر نظر کا زاویہ بدل دیا۔

''کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟'' یاسمین بے قرار ہو رہی تھی اصل بات جاننے کے لیے۔

''کیا بات ہونی ہے۔'' وہ زور سے بولی۔ ''کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا پریشانی ہے آپ... میں اب اپنے ماں باپ کے گھر کسی بات کے بغیر نہیں آ سکتی۔'' اس نے بے مروت لہجے میں چیخ کر...

یاسمین کھڑی ہو گئی۔

''بھئی، جب جی چاہے آؤ جاؤ ہمیں کیا میں تو طبیعت کا پوچھ رہی تھی تم نہ جانے کیوں بھڑ... اٹھیں۔ کسی کا وبال کسی پر۔ ہونہہ۔'' کہتے ہوئے باہر کی طرف چل پڑی۔

''ناشتہ لا دوں؟'' یاسمین پھر کچھ ضبط کر کے مروت سے جاتے جاتے بولی۔

''جی نہیں شکریہ۔ مجھے بھوک لگے گی تو میں خود اٹھ کر لے لوں گی۔'' وہ بے رخی سے بو...

یاسمین پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''ہم لوگ آٹھ بہن بھائی تھے چھ بہنیں اور دو بھائی۔ بھائی دونوں سب بہنوں سے چھ... تھے اور لڑکیوں کی آگے پیچھے لائن لگی ہوئی تھی ابا واسا میں کلرک تھے۔ ڈیڑھ دو ہزار کی تنخواہ اور دس ا... کنبہ۔ آپ خود سوچیں، وہاں زندگی کی کیا صورت ہو گی، میں بہنوں میں چوتھے نمبر پر تھی۔ مجھ سے...

تین تھیں جہاں پیٹ کا جہنم بھرو تو تن کا کپڑا نصیب نہیں ہوتا اور اگر تن ڈھانپو تو خالی آنتیں دہائی دینے لگیں۔ وہاں شادی بیاہ کے سلسلے کسی عیاشی سے کم نہیں ہوں گے۔ دو کمروں کا گھر چیخ چیخ کر اپنی فاقہ مستی کا اعلان کرتا تھا۔ بے رنگ در و دیوار نے آہستہ آہستہ مکینوں کا رنگ روپ بھی چرانا شروع کر دیا۔ تینوں بڑی بہنوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کر نہ انہیں آگے پڑھنے کا شوق تھا نہ ابا میں پڑھانے کی سکت پھر مشین کا چرخہ جو بڑی آپا اور چھوٹی آپا نے سنبھالا تو سارے گھر کے مکینوں کی سانسیں جوڑتے جوڑتے ان کے اپنے جوڑ رہ گئے۔ ایسے میں کوئی اچھا رشتہ کہاں سے آنا تھا۔

میں نے کسی طرح میٹرک کر لیا۔ آگے پڑھنے کا مجھے شوق نہ تھا بس اچھا پہننے اوڑھنے کا شوق تھا۔ ٹی وی کا، فلموں کا اور گانوں کا ہماری کٹیا کے علاوہ اس گلی کے سب گھروں میں یہ سہولتیں موجود تھیں۔ جو مجھے گھر میں ٹکنے نہیں دیتی تھیں میں اپنی بہنوں کی طرح صابر اور شاکر نہیں تھی کہ ارمانوں کا گلا گھونٹ کر مشین کے پہیے کی گھوں گھوں میں عافیت ڈھونڈ لیتی۔ انہوں نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اور مجھے حالات سے بغاوت کے دورے پڑتے تھے ابا کی کمر صرف ہماری سانسوں کی ڈور باندھنے میں ہی جھک گئی تھی، وہ اور معاملوں کے بارے میں بھلا کیا سوچتے اور اماں شوہر کی ستی ساوتری بیوی ہمیں قناعت و صبر کی سوکھی روٹی، سمجھوتے کی کڑوی کسیلی چائے میں گھول گھول کر دیتی رہیں جس سے میری بہنوں کے اندر خوشی کی چاشنی کا احساس ہی مر گیا اور میرے اندر جیسے زہر بھر گیا۔

سب کی مخالفت کے باوجود میں نوکری کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اس چھوٹے سے گھٹن زدہ ڈربے سے باہر کی دنیا کتنی بڑی کتنی حسین تھی اور اماں ہمیں یونہی ڈرا ڈرا کر مارتی رہتی تھیں کہ یہ دنیا بڑی خوفناک ہے۔ کسی بلا سے بھی ڈراؤنی جو ایک بار کسی کو اپنے پنجوں میں جکڑ لے تو وہ ایک ایک سانس اپنے ہاتھوں سے نکال کر اس بلا کے سامنے پیش کرتا ہے پھر بھی تاوان ادا نہیں ہوتا مگر مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا نوکری کی تلاش میں مختلف دفاتر کے چکر لگا لگا کر میرا ڈر خوف کافی حد تک کم ہو گیا اور نوکری نہیں بھی مل رہی تھی تو کیا باہر نکلنے کا ایک بہانہ تو ہاتھ آ گیا تھا۔ ابا میری منہ زوری کے آگے ہار گئے تھے اور بہنوں نے شاید مجھے کولمبس کا درجہ دے دیا تھا میری بات سب کے لیے حرف آخر ہونے لگی۔

بہر حال تقریباً آٹھ نو مہینوں کے دھکوں کے بعد مجھے نوکری تو نہ ملی ایک دوست مل گئی جو کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتی تھی۔ بس اسٹاپ پر آتے جاتے ملاقات ہونے لگی جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ فیاض اس کا کزن تھا جو امریکہ میں ہوتا تھا اور بقول سعدیہ کے اس کا وہاں بہت بڑا اسٹور تھا اور آج کل وہ پاکستان کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں آیا ہوا تھا شادی کے لیے، میرے کان کھڑے ہو گئے وہ اچھی لڑکی میں کیوں نہیں ہو سکتی تھی اور میری موٹی عقل میں یہ بات نہ آئی کہ وہ اچھی لڑکی، سعدیہ کیوں

نہیں ہو سکتی جو کہ فیاض کی کزن بھی ہے۔ بہر حال دنیا میں مجھ سے بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"فیاض سے میری ملاقات سعدیہ کے گھر پر ہی ہوئی اس نے مجھے پہلی نظر ہی میں پسند کر لیا اور سعدیہ ہی کے توسط سے دو روز بعد اس کا پرپوزل ہمارے گھر آیا۔ ہماری کٹیا میں جیسے بھونچال آ گیا۔ کہاں ٹاٹ کہاں مخمل، سعدیہ کو زیادہ محنت نہ کرنا پڑی اور میرے ماں باپ نے بھی زیادہ حیل و حجت کے بغیر ایک ہفتے بعد ہاں کر دی۔ جہاں چھ چھ چٹانیں سینے پر دھری ہوں اور ایک ایک سانس آتے آتے من من کا ہو جاتا ہو، وہاں چھان بین کون کرتا ہے پہلے نکاح ہوا اور رخصتی چھ سات ماہ بعد تھی۔

اور ان چھ سات ماہ کے عرصے میں جو جو خواب میری آنکھوں نے بنے اگر میں ان کی تفصیل بتانے بیٹھ جاؤں تو شاید آپ لوگ مجھے پاگل سمجھیں، ان ہی سپنوں کا جھولا جھولتے جھولتے یہاں آ گئی اور اپنے پیچھے گھر والوں کو اسی جھولے میں جھولتے چھوڑ آئی۔

پہلا جھٹکا مجھے ہماری کٹیا سے بھی چھوٹے اس فلیٹ کو دیکھ کر لگا۔ یہاں کی دیواریں تو ہمارے گھر سے بھی زیادی سیم زدہ تھیں اور چھت میرے قد جتنی مگر یہ چیزیں قابل برداشت ہوتیں اگر فیاض کی یہ اصلیت نہ ہوتی وہ سارا دن نشے میں دھت پڑا رہتا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم اسٹور پر کیوں نہیں جاتے تو کہنے لگا کون سا اسٹور اور ساتھ میں اس نے جو مغلظات بکیں تو میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ابا کے گریجویٹی فنڈ سے جو رقم ملی تھی۔ آدھی سے زیادہ فیاض نے بطور قرض لی تھی کہ اسٹور میں سرمائے کی ضرورت ہے۔ جلد ہی لوٹا دے گا کچھ دن اسی رقم کے سہارے کٹے اور پھر فاقے وہی فاقے جن سے بھاگ کر میں ادھر آئی تھی۔

مگر اس کی اصل شکل میں نے کل شام دیکھی۔ مجھ سے اس کی باقاعدہ چوتھی شادی ہے اور بے قاعدہ خدا جانے کتنویں، اور شادی چاہے باقاعدہ ہو یا بے قاعدہ اس کا مصرف اس خبیث کے نزدیک ایک ہی ہے اور کل اس نے مجھے اس پر راضی کرنا چاہا کیونکہ اس کی آمدن کا یہاں یہی ذریعہ ہے۔ پاکستان کے ایسے ایک پھیرے سے اس کے دو تین سال اچھے گزر جاتے ہیں، میں لاکھ خواہشوں کی غلام سہی لیکن اگر یہی کچھ کرنا تھا تو مجھے یہ بیوپار کرنے کے لیے ہزاروں میل دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو اب وہاں بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی معقول آمدن کے ساتھ۔ پھر مجھے اس کا سہارا لینے کیا ضرورت تھی۔

اور اب میں اس کے ساتھ ایک پل نہیں رہ سکتی۔ میں اس سے طلاق لینا چاہتی ہوں، آپ لوگ میری مدد کریں۔ میں آپ لوگوں کو آتے جاتے دیکھا کرتی تھی۔ اسی لیے رات سیڑھیاں پھلانگ

کر آپ کے فلیٹ کے سامنے آ گئی کہ ہم وطن ہونے کا آپ لوگ کچھ تو لحاظ کریں گے۔"

آنسو تو اس کے رات سے ایک بار بھی نہیں رکے تھے اور ساری کہانی سنا کر وہ گھٹنوں میں سر دے کر پھر رونے لگی تو ایاز اور مغیث جو غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے سوچ میں پڑ گئے۔

پھر کچھ دیر کی صلاح مشورے کے بعد وہ اسے لے کر بیرسٹر افتخار قریشی کے پاس آ گئے، بیرسٹر صاحب پاکستانی تھے اور ایک عرصے سے یہاں پریکٹس کر رہے تھے رابیل کی کہانی سن کر انہوں نے مقدمے کی پیروی کرنے کی ہامی بھر لی اور کیس کے اخراجات مغیث اور ایاز نے اپنے ذمے لے لیے۔ پھر قریشی صاحب کے مشورے اور سفارش پر وہ اسے پاکستان کمیونٹی سنٹر میں مسز ظہیر کے زیر انتظام چلنے والے ٹرسٹ میں لے گئے، جہاں ایسے بے سہارا لوگوں کی اخلاقی اور قانونی مدد کی جاتی تھی۔ رابیل کو وہاں چھوڑ کر وہ دونوں جب واپس آئے تو رات ہو چکی تھی۔ بار سے دونوں نے چھٹی کی تھی آتے ہی دونوں یوں پڑ کر سوئے جیسے صدیوں بعد سوئے ہوں۔

☆☆☆

"عظمیٰ بھابھی! آپ کے اسکول میں کوئی ویکینسی ہے۔"

پورے ایک ہفتے بعد اس نے از خود یہ جملہ عظمیٰ سے بولا تھا۔ پورا ہفتہ وہ اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑی رہی۔ رابعہ اسے بارہا کرید چکی تھیں کہ وہ بچوں کو اس طرح چھوڑ کر کیوں آئی ہے اور وہ ہر بار یا تو خاموش ہو جاتی یا پھر کوئی تلخ سا جواب دے کر منہ موڑ لیتی۔ یاسمین نے پہلے دن کی تلخ کلامی کے بعد اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ دونوں بھائی بھی اس کا رخ دیکھتے ہوئے خاموش تھے اور عظمیٰ ویسے ہی بڑی مصروف رہتی تھی۔ آتے جاتے بس حال احوال پوچھ لیتی۔ صبح کو اسکول پھر واپسی پر گھر کے کام اور شام میں گھر کے پانچوں بچوں کو پڑھانا۔ اس وقت بھی وہ بچوں کو پڑھا رہی تھی جب پنکی نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔

"نہیں، میرا تو خیال ہے کہ کوئی ویکینسی نہیں۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" عظمیٰ نے سامعہ کا بیگ سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"ظاہر ہے مجھے جاب کرنی ہے، اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"میں پوچھوں گی سر بھٹی سے، شاید کوئی ٹیچر چاہیے ہو ناہیں۔" عظمیٰ نے کہا۔

پھر دونوں کے درمیان مزید کوئی بات نہ ہوئی۔ عظمیٰ بچوں کو پڑھاتی رہی اور وہ خالی بیٹھی نہ معلوم کیا سوچتی رہی۔

"پھپھو! یہ دیکھیں۔ میں نے ٹھیک لکھا ہے؟" ننھا وانی اپنی کیلی گرافی کی کاپی اس کے آگے

کرتے ہوئے بولا تو اس نے ایک نظر کاپی پر ڈال کر ہلکے سے اس کا گال تھپتھپایا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' تو وہ خوش ہو گیا۔

''عباد کو بھی میں نے کیلی گرافی کی کاپیاں لا کر دی تھیں۔ پتا نہیں وہ لکھتا بھی ہوگا کہ نہیں کتنے دن ہو گئے ہیں آج اسے دیکھے ہوئے۔ پتا نہیں کچھ ٹھیک سے کھاتا بھی ہوگا کہ نہیں۔ کتنا تیز بخار تھا اسے اس رات، پتا نہیں اب کیسا ہوگا۔ میں اسے کیوں چھوڑ آئی۔'' اس کی آنکھوں میں پانی اکٹھا ہونے لگا۔ ''دعا اس کا خیال تو رکھتی ہوگی مگر ہے تو بچی ہی نا۔ پتا نہیں دونوں مجھے کتنا مس کرتے ہوں گے۔''

دو قطرے اس کے دوپٹے میں گر کر جذب ہو گئے ''ایسا ہوتا تو کوئی تو فون کرتا۔ دعا کو کم از کم ادھر کا نمبر تو یاد ہی ہے۔ میرے خدا میں کیا کروں؟'' شدت جذبات سے اس کا دل پھٹنے لگا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ عظمیٰ نے اسے ایک نظر جاتے دیکھا اسی وقت رابعہ اندر داخل ہوئیں۔

''کچھ کہہ رہی تھی تم سے پنکی؟'' وہ عظمیٰ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''ہاں جاب کے لیے کہہ رہی تھی اسکول میں۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ نہ کچھ بتاتی ہے نہ ہمیں پتا کرنے دیتی ہے۔ خدا جانے کیا بات ہوئی ہے کیا نہیں۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔ آخر کوئی چھوٹی بات ہے سات آٹھ سال کی گرہستی کو ایک دم چھوڑ کر آ بیٹھنا ماں باپ کے گھر۔ چلو بچوں کو ساتھ لے آتی پھر اور بات تھی۔ میرا دل تو ان معصوموں میں اٹکا ہوا ہے۔ خدا جانے کیا کرتے ہوں گے اور یہ سنگدل یہاں گم صم بنی بیٹھی ہے۔ تم ہی اس سے کچھ پوچھو، میری تو ہر بات کا الٹا جواب دیتی ہے تمہارے ابو بھی سخت پریشان ہیں۔'' رابعہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میں پوچھوں گی اس سے۔ ویسے ابھی وہ غصے اور رنج سے بھری ہوئی ہے۔ اللہ جانے کیا بات ہے۔ ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں۔ ہاں بچوں والی آپ کی بات ٹھیک ہے ان کو تو ایسے چھوڑ کر نہ آتی۔ ابو اس سے بات کریں کہ عظیم بھائی یا فہیم جا کر انہیں لے آئیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔'' عظمیٰ نے ہمدردی سے کہا۔

''یاسمین الگ منہ پھلائے پھر رہی ہے کہ مجھ سے پنکی نے بڑے تلخ لہجے میں بات کی تھی۔ وہ سب سے ایسے ہی بول رہی ہے۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ خود جا کر پتا کر آؤں کیا بات ہے۔ بس اس رات سے اگلے دن حسین کا فون آیا تھا اس کی خیریت معلوم کرنے کو اور بس میں کچھ پوچھ ہی نہ سکی۔ اس کے بعد سے تو ادھر بھی مکمل خاموشی ہے۔'' وہ پریشانی سے بولیں۔

''بہت سمجھ دار ہے پنکی۔ پتا نہیں کوئی زیادہ ہی بڑی بات ہوگی جو یوں اٹھ کر آ گئی۔'' عظمیٰ نے کہا۔

''ہوں۔ کچھ بتائے بھی تو سہی، عجیب عجیب سے خیالات ڈرائے دے رہے ہیں۔'' رابعہ بڑبڑائی۔

پھر دو تین روز بعد ہی عظمیٰ نے اسے بتایا کہ ان کے اسکول میں ایک ٹیچر کی جگہ خالی ہے وہ اپلائی کر دے۔ اس نے درخواست لکھ کر عظمیٰ کے حوالے کی اور رات کو اقبال صاحب سے اجازت لینے ان کے کمرے میں گئی تو وہ بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے کسی سوچ میں گم تھے اسے دیکھ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''آؤ، آؤ پنکی بیٹا! آؤ بیٹھو۔'' وہ ان کے پاس ہی بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

''تم سوئیں نہیں ابھی۔''

''ابو! میں نوکری کرنا چاہ رہی ہوں عظمیٰ بھابھی کے اسکول میں سیٹ ہے۔ میں نے درخواست بھیج دی ہے۔'' وہ ان کے پہلے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''یہ تم مجھے اطلاع دے رہی ہو یا اجازت مانگ رہی ہو؟'' انہوں نے کچھ چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' وہ پاؤں کے انگوٹھے سے کارپٹ کریدتے ہوئے نظریں جھکائے بولی۔

''تو پھر کر لو۔ میری ہاں یا نہ سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔'' وہ تلخی سے بولے۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پنکی! بیٹھو ادھر۔'' انہوں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا ہے بیٹا! مجھے بتاؤ۔'' انہوں نے ذرا نرمی سے کہا۔

''کچھ نہیں ہوا۔ میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ آپ بار بار مجھ سے نہ پوچھیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''کیوں نہ پوچھیں۔'' ان کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ ''تمہیں پتا ہے، تمہاری وجہ سے سارا گھر پریشان ہے۔ تمہاری اس چپ سے کوئی کیا کچھ اخذ کر سکتا ہے۔ تمہیں اس کی پروا ہو یا نہ ہو ہمیں ضرور ہے اور اب تم مجھے پوری بات بتاؤ۔'' وہ ذرا پیار سے بولے۔

''ابو! کوئی کیا اخذ کرتا ہے۔ مجھے واقعی اس کی کوئی پرواہ نہیں۔'' وہ زور دے کر بولی ''اور کیا

ہوا ہے۔ یہ تو مجھے بھی پتا نہیں۔ آپ اگر مجھ سے پوچھیں گے تو خدا کی قسم، میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں اور آپ اسے محض دھمکی نہ سمجھیے گا۔'' اس کی آواز گلے میں بیٹھ سی گئی۔ اس کی بات پر اقبال صاحب چ... سے ہو کر رہ گئے۔

''اچھا مت بتاؤ۔ مگر بچوں کا کیا قصور ہے، انہیں تو یہاں لے آؤ۔'' وہ کچھ دیر بعد بو...

''تمہارا دل اس جدائی کو جھیل سکتا ہے مگر وہ پھول سے بچے یہ سختی نہیں سہہ سکیں گے۔'' ان کی بات پر ا... کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

''انہوں نے بچوں کو میرے ساتھ آنے نہیں دیا ورنہ میں انہیں کبھی چھوڑ کر نہ آتی۔'' روتے ہوئے بولی ''آپ کو کیا پتا میرا ان کے بغیر کیا حال ہے اگر آپ انہیں لا سکتے ہیں تو لے آ... ورنہ میں ایسے بھی جی لوں گی۔''

کہتے ہوئے تیزی سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی آنسوؤں کے سیلاب نے سار... بند توڑ دیے تھے۔ اقبال صاحب کے دل پر جیسے کسی نے آری چلا دی۔

اگلے ہفتے سے وہ عظمیٰ کے ساتھ باقاعدہ اسکول جانے لگی۔

اس کی چپ میں اس حد تک فرق پڑا تھا کہ بچوں کو پڑھانے سے اس کا دھیان بٹ گیا جس کی وجہ سے اس نے گھر میں بھی تھوڑی بہت بات چیت شروع کر دی تھی مگر جیسے اس کے اور گھر والو... کے درمیان ایک آڑسی آ گئی تھی نہ تو اس کا رویہ بچوں کے ساتھ پہلا سا بے تکلفانہ تھا نہ بھابیوں ... ساتھ دوستانہ اور ماں سے تو وہ ویسے ہی کھنچی کھنچی سی رہتی۔ جاب کرنے سے وہ تو شاید مطمئن ہو گئی تھی ... رابعہ کو ایک بے چینی نے گھیر لیا تھا جب معاملہ گرم تھا اگر وہ خود جا کر اگلے روز ساری بات معلوم کر لیتیں شاید بات بن جاتی مگر اب اتنے دنوں بعد جانا انہیں عجیب لگ رہا تھا اور کچھ انا کا مسئلہ آ گیا تھا بیچ میں اور وہ تو ابھی بھی کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھی۔ ماں کے ہر سوال کے جواب میں کہتی۔

''کچھ نہیں ہوا۔ بس میں وہاں نہیں رہ سکتی اور کیوں رہوں بھلا؟'' کبھی جھلا کر اور کبھی رسانیت سے وہ ایک ہی بات کہے جاتی۔

اس روز عظمیٰ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ اسکول نہ جا سکی واپسی پر اسکول وین راستے میں خراب ہو گی۔ ڈرائیور انجن میں خرابی تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ ذرا آگے تو دعا کا اسکول ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔

''ابھی چھٹی ہوئی ہو گی۔'' وہ وین سے اتر گئی۔

''اکبر! دیکھو۔ مجھے ذرا ادھر اسکول میں کام ہے۔ تم دونوں بچوں کو گھر اتار دینا اور ان سے کہ...

دینا۔ میں تھوڑی دیر میں آ ؤں گی۔'' وہ ڈرائیور سے کہہ کر پیدل ہی دعا کے اسکول کی طرف چل پڑی۔

واقعی اسی وقت چھٹی ہوئی تھی، اسکول کے باہر بے پناہ رش تھا، وین گاڑیاں اور بچوں کا شور۔

''کہیں وہ چلی نہ گئی ہو۔ اتنے رش میں اسے کیسے ڈھونڈوں؟''

دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے سن گلاسز لگائے اور گیٹ کے پاس ادھر ادھر بچوں کو دیکھنے لگی چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ کھڑی رہی۔ بچے گاڑیوں میں بھر بھر کر گھروں کو روانہ ہونے لگے وہ مایوس ہو کر واپس جانے ہی لگی تھی کہ دائیں طرف سے آتی آواز نے اس کے قدم روک لیے اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو دعا کھڑی تھی۔

''ماما! ماما!'' وہ رستے میں آئے دو تین بچوں کو ہٹاتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''دعا! دعا بیٹا! کیسی ہو تم؟'' اس نے جھپٹ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''ماما! ماما! آپ کہاں چلی گئی ہیں؟ دادو کہتی ہیں کہ اب آپ کبھی نہیں آئیں گی۔'' وہ رونے لگی۔

''نہیں نہیں بیٹا! میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔'' اس نے زور زور سے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

''بھائی کیسا ہے۔ عباد ٹھیک ہے؟ اس کا بخار اتر گیا تھا؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''اتر گیا تھا بخار۔ مگر ماما! وہ بہت روتا ہے۔ ہر وقت آپ کو پکارتا رہتا ہے۔ پھوپھو سے بھی چپ نہیں ہوتا، ہر روز ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔ دادو کو بہت غصہ آتا ہے اس کے رونے پر۔ میں اسے بہت پیار کرتی ہوں مگر وہ پھر بھی چپ نہیں کرتا۔ بس روئے چلا جاتا ہے۔'' دعا اسے جلدی جلدی تفصیل بتانے لگی۔ اس کا دل تڑپنے لگا۔

''اچھا بیٹا! تم اس کا بہت خیال رکھنا۔ میں جلد ہی تم دونوں کو لینے آ ؤں گی۔ تمہارا وین والا تمہارا انتظار کر رہا ہے، اب تم جاؤ۔'' اس نے امڈ آنے والے آنسوؤں کو ہاتھ سے رگڑتے ہوئے دعا کو اپنے سے علیحدہ کیا۔

''آپ کب آئیں گی۔ کیوں چلی گئی ہیں ہمیں چھوڑ کر۔ ابھی چلیں میرے ساتھ۔'' بچی بے قرار ہو گئی۔

''کہا نا بیٹا! جلد آ ؤں گی۔ اب تم جاؤ اور یہ تمہارا یونیفارم اتنا گندا کیوں ہے روز نہیں بدلتیں؟'' اس کی نظر شرٹ کے گندے کالر پر پڑی۔

''دو دن بعد بدلتی ہوں اور کپڑے دھونے والی ملازمہ کوئی نہیں آتی۔ پھوپھو دو دن بعد دھلا

ہوا یونیفارم دیتی ہیں، میں اسکول میں اتنا صاف رکھتی ہوں پھر بھی گندا ہو جاتا ہے تو پھوپھو بہت ڈانٹتی ہیں۔ ماما گھر چلیں پلیز۔'' وہ پھر اس کا دامن کھینچ کر بولی۔

''ہاں بیٹا! چلوں گی۔ اب تم جاؤ۔ بھائی کا خیال رکھنا۔ اچھا۔'' اس نے جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اس کی انگلی پکڑ کر وین کی طرف چل پڑی۔

''گھر میں کسی کو نہ بتانا کہ میں آپ سے ملنے آئی تھی۔'' وین میں بٹھاتے ہوئے اس نے رونی شکل بنائی دعا کو تاکید کی تو اس نے بے دلی سے سر ہلا دیا۔ وین کے جانے تک وہ اسے نظروں میں جذب کرتی رہی۔

''یہ کیا ہو گیا۔ یا میرے خدا! میں کیا کروں؟'' اس نے دھوپ سے چمکتے ہوئے دودھیا آسمان کی طرف سر اٹھا کر بے بسی سے دیکھا۔

گھر آ کر اس سے کھانا بھی نہ کھایا گیا ایسے ہی کپڑے بدل کر کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

''دعا کتنی کمزور ہو گئی ہے۔'' بیڈ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے سوچا ''مجھ سے کہاں غلطی ہوئی۔ کہاں بھول ہوئی جس کی اتنی بڑی سزا مجھے مل رہی ہے۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

''اس روز جو اس نے مجھے وہ سامنے کی بات کر کے شرمندہ کیا تو میں نے دل میں فیصلہ کر لیا ''خیریت'' سے آگے بات شروع کرنے کا۔ بس مجھے جاب ملنے کا انتظار تھا اور دیکھو قدرت خدا کی دوسرے ہفتے ہی مجھے مقامی بینک میں جہاں میں نے مہینہ بھر پہلے انٹرویو دیا تھا سے اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور ایک مہینہ میں نے بڑی بے چینی سے گزارا اور اگلے ماہ امی کو سمیطہ کے گھر رشتہ لینے بھیج دیا۔ جواب حسب توقع تھا کہ وہ ابھی پڑھ رہی ہے مگر میں نے بھی ہمت نہ ہاری اور چار پانچ دنوں بعد امی کی خفگی کی پروا کیے بغیر پھر سے انہیں بھیج دیا کہ وہ اپنی تعلیم شادی کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہے۔ انہوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔

امی بڑی جز بز ہو رہی تھیں۔ روایتی ماؤں کی طرح وہ بھی اپنی کوئی بھانجی یا بھتیجی لانا چاہتی تھیں۔ اس لیے وہ بہت خوش نہیں تھیں اور پھر ایک مہینے کے جان لیوا انتظار کے بعد انہوں نے ہاں کر دی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ گھر میں شادی تیاریاں شروع ہو گئیں اگرچہ ان دنوں گھر کی مالی حالت اتنی مستحکم نہ تھی۔ میری نوکری کو ابھی مہینہ بھر ہوا تھا اور۔''

مغیث اپنے پسندیدہ موضوع پر بلاتکان بول رہا تھا اور سامنے بازو سر کے نیچے رکھے چت لیٹا ایاز شاید کانوں میں روئی ٹھونسے بے تاثر چہرہ لیے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں کے والدین کیسے ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں وہ بھی بیٹیوں کے معاملے میں۔'' ایاز کی بے تکی پر مغیث نے اسے گھور کر دیکھا۔

''تمہارا مطلب سمیطہ کے ساتھ میرے رشتے سے متعلق ہے؟'' اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''نہیں۔ میں رابیل کی بات کر رہا ہوں۔ اتنے زیادہ کیسز ہوتے ہیں، یہ فراڈ اور دھوکا دہی کے پھر بھی یہ لوگ امریکہ اور لندن کا نام سنتے ہی بیٹی کے نادیدہ اچھے مستقبل کے لیے اسے داؤ پر لگا دیتے ہیں۔'' وہ پر سوچ انداز میں بولا۔

''ہاں یہ تو ہے اور تم اس کے حالات تو دیکھو۔ آخر انہوں نے چھ بیٹیوں کو اسی طرح ٹھکانے لگانا ہے نا۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔ انسان اپنے ہی وجود کے حصوں کے ساتھ اس درجہ سفاکانہ سلوک کرے بنا سوچے سمجھے انہیں دھکا دیتا جائے۔'' مغیث نے گہرے انداز میں کہا۔

''خیر، اب اسے پاکستان واپس جانا چاہیے اپنا ملک جیسا بھی سہی۔ وہاں کم از کم اپنوں کا ساتھ تو ہوتا ہے۔'' ایاز نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو اس فیاض چوہے پر حیرت ہو رہی ہے پہلے ہی نوٹس پر اس نے طلاق نامہ بھجوا دیا۔'' مغیث بولا۔

''دھوکے باز ہمیشہ بزدل ہوتے ہیں اگر رابیل اس رات دلیری نہ دکھاتی تو شاید وہ اسے کسی نہ کسی طرح ٹریپ کر ہی لیتا۔ کیس چلنے سے اس کے پچھلے کرتوت کھل جانے تھے۔ اسی لیے اس نے پیچھا چھڑا لینے ہی میں عافیت جانی۔''

''اگرچہ اس رات رابیل نے بڑی ہمت دکھائی مگر پھر جو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے مسز ظہیر کے آفس جا کر۔ انسان کتنے ہی مضبوط اعصاب کا کیوں نہ ہو ایسے مشکل حالات کا تن تنہا مقابلہ کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ میرا خیال ہے کل تک وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو جائے گی۔'' مغیث نے قیاس کیا۔

''ہاں ڈاکٹرز کہہ تو رہے تھے کہ اب وہ ٹھیک ہے۔'' ایاز نے سستی سے کہا۔

''ویسے وہ کہہ رہی تھی کہ وہ واپس نہیں جائے گی۔'' مغیث کی بات پر ایاز نے اسے کچھ حیرت سے دیکھا۔

''یہ کب کہا اس نے؟''

''کل صبح جب میں آفس جانے سے پہلے اس کی خیریت دریافت کرنے ہاسپٹل گیا تھا۔''

مغیث نظریں چرا کر بولا۔

"تم تو کل کہہ رہے تھے کہ تم ہاسپٹل گئے ہی نہیں۔" ایاز نے جتا کر کہا۔

"ذرا سی دیر کے لیے گیا تھا۔ کھڑے کھڑے حال دریافت کیا اور بس۔" مغیث نے جلدی سے کہا۔

"اور بس! چلو ٹھیک ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ تم سے اس نے بات کی ہے تو تم ہی اسے سمجھانا۔ یہاں کا ماحول اس کی طبیعت سے میچ نہیں کرتا پھر اکیلی لڑکی کا رہنا کسی طور بھی ٹھیک نہیں۔" ایاز نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں کہوں گا۔"

"تمہارے گھر سے خط نہیں آیا کافی دنوں سے؟" ایاز نے پوچھا۔

"ہاں کافی دن ہو گئے ہیں اور میں بھی نہیں لکھ سکا۔ یہ رابیل کے چکر میں وقت ہی نہیں مل سکا۔"

مغیث کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے اب نکلنا چاہیے۔ ذرا سی دیر ہو جائے تو پیٹر صاحب کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔" ایاز کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"میں تو تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے ہر وقت کولہو کے بیل کی طرح جتے رہو۔ چند گھنٹے بمشکل آرام سے نصیب ہوتے ہیں کتنے سالوں سے مجھے لگتا ہے میری نیند پوری نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کب اس مشقت سے جان چھوٹے گی۔" مغیث نے گہرا سانس لیا۔

"تم کچھ دنوں کی چھٹی لیکر گھر کا چکر لگا آؤ۔ پانچ سالوں سے تم مسلسل کام کر رہے ہو۔" ایاز نے ہمدردی سے کہا۔

"ہاں ہر سال سوچتا ہوں، اس بار جاؤں گا پھر کوئی نہ کوئی کام نکل آتا ہے۔ جب میں پاکستان میں تھا تو میری تھوڑی سی تنخواہ میں گزارہ ہو جاتا تھا اور اب یہاں دو دو نوکریاں کرتا ہوں، اتنے ڈالر بھیجتا ہوں، گھر والوں کی ضرورتیں ہی پوری نہیں ہوتیں اور اب جو یہ پلاٹ کی رٹ لگا دی ہے انہوں نے اچھا بھلا چھ سات مرلے کا گھر ہے ہمارا اور امی کہتی ہیں چھوٹا ہے۔ کل کو دوسرے بھائیوں کی شادیاں ہوں گی تو یہ بہت چھوٹا پڑ جائے گا۔ اب دو کنال پر چھت ڈالنی بھلا کوئی آسان کام ہے مجھے تو لگتا ہے۔ میں یہیں پڑے پڑے بوڑھا ہو جاؤں گا اور یہ ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔" مغیث تلخی سے بولا۔

"اس کی وجہ بھی تمہارا رویہ ہے، آخر کیا ضرورت ہے اتنے بڑے پلاٹ کی۔ کل کو اگر بھائیوں کی شادیاں ہوں گی تو وہ خود انتظام کر لیں گے تم کیوں اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال یہاں گنوا رہے ہو۔ مغیث! یہ زندگی بہت مختصر ہے، اسے یوں کاغذ کے ان بے جان ٹکڑوں کے پیچھے مت گنواؤ۔

خواہش نے انسان کو جنت بدر کیا تھا مگر اس نے سبق نہیں سیکھا۔ یہ بذات خود کچھ بھی نہیں۔ انسان جتنا اس کو اپنے اوپر طاری کرتا ہے یہ اسے مغلوب کرتی چلی جاتی ہے اور یہ خواہشات تو محض فریب نظر ہیں پوری ہو بھی جائیں تو بھی چند لمحوں کی خوشی کے سوا کچھ نہیں دیتیں۔"

"میں کب ایسا چاہتا ہوں اگر وطن میں ہی مجھے کوئی اچھی نوکری مل جاتی بلکہ ملی ہوئی تھی تو میں کیوں اس طرح پردیس میں دھکے کھاتا، سمیطہ کس قدر یاد آتی ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں اور بچے۔ بیٹے کو تو میں نے چھو کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ کیسے روتا ہوگا۔ کیسے ہنستا ہوگا۔ اس نے کیسے قدم قدم چلنا سیکھا ہوگا اور توتلی زبان میں اس نے سب سے پہلا لفظ کیا بولا ہوگا۔ خط، تصویریں، فون۔ کہاں تک میری تشنگی کا سامان کر سکتے ہیں۔ ایاز میرے دوست! ایک ایک پل ان کی جدائی کا مجھے تلوار کی طرح کاٹ کاٹ کر گزرتا ہے۔

خود اذیتی کا یہ تصور کس قدر تکلیف دہ ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ان ہی کا خیال ستاتا ہے اور کوشش کے باوجود میں اس جدائی کو پاٹ نہیں سکتا۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ "بہن کی شادی، بھائیوں کی تعلیم کے اخراجات، نیا گھر، گاڑی یہ کیا ہے یہ سب وجود رکھتے ہیں اور میری بے بسی میرا احساس کسی کو نظر نہیں آتا۔ ان پانچ برسوں میں ایک بار بھی میرے گھر والوں نے مجھے نہیں لکھا کہ تم واپس آ جاؤ ہم روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیں گے۔ اگر وہ منحوس حادثہ نہ ہوتا تو میں کبھی اپنا گھر بار چھوڑ کر نہ آتا۔ اس وقت تو سب کی خواہشیں اتنی منہ زور نہ تھیں اب میں کیا کروں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ جب سب کی خواہشیں پوری کر دو گے سوچو پھر تمہاری اپنی مری ہوئی آرزوئیں تم سے سوال نہیں کریں گی اور کیا اس قربانی پر سب تمہیں گولڈ میڈل پہنائیں گے، نہیں میرے بھائی یہ سب رشتے محض ضرورتوں کے ہیں اپنی دنیاؤں میں مگن ہو کر انہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ تم نے ان کے لیے کیا کیا تھا۔

ابھی وقت ہے، سوچو یہ ایسی مجبوریاں نہیں کہ تم بندھ جاؤ۔ چودہ کروڑ کی آبادی جس طرح وہاں زندگی گزار رہی ہے تم بھی گزار سکتے ہو یوں ترس ترس کر جیو گے تو تمہارے ہاتھ سوائے تشنہ مسرتوں کے اور کچھ نہیں آئے گا۔" ایاز نے اسے راہ دکھائی۔

''تم کیوں نہیں جاتے واپس، تمہارا ابھی تو گھر ہے ناوہاں؟''مغیث نے کہا۔

''میری بات اور ہے۔اس کو رہنے دو تم۔''ایاز کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔

''کیوں تمہاری بات اور کیوں ہے، تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے کہ مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔''مغیث نے شکوہ کیا۔

''کچھ ایسا نہیں ہے میری کہانی میں جو سنانے کے قابل ہو۔میرا خیال ہے چلیں دیر ہو رہی ہے، وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تو مغیث بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆

انگلش میں ماسٹرز کرنا اس کا خواب تھا لیکن اگر دیکھا جائے تو مغیث احمد جیسے شخص کی ہمراہی کا خواب ایم اے انگلش سے بھی بڑا خواب تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خواب دوسرے خواب کا رستہ کاٹ کر آگے آجاتا ہے بلکہ اس طرح چھا جاتا ہے کہ پہلے کا ملال بھی جاتا رہتا ہے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اگرچہ آخری دنوں تک اس کا یہی خیال تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھے گی لیکن یہ بھی محض اس کا خیال ثابت ہوا کیونکہ شادی کے بعد اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی بلکہ یا وہ خود ایسا نہ چاہتی تھی۔اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مغیث اس کے لیے اپنے دل میں پیار کا اک جہان چھپائے ہوئے ہے اور اس احساس نے ہی اسے کتنے دن تک ساری دنیا سے بے خبر رکھا کہ وہ اس پیار بھرے جہان کی بلاشرکت غیرے مالک ہے۔چاہے جانے کا احساس کسی بھی نشے سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے، پیار کے دو بول، ہفتوں کسی کے دل و دماغ کو مدہوش رکھ سکتے ہیں اور یہاں تو محبت بھرا پورا دیوان تھا جو دن رات کسی خوشگوار نغمے کی طرح وہ اپنی سماعتوں میں اتارتی رہتی تھی۔

اس گھر میں آکر اسے ایک بار بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ کسی اجنبی فیملی میں آئی ہے۔مغیث کی محبت نے اجنبیت اور غیریت کے سب احساسات منہدم کر دیے تھے۔ان کی فیملی میں آؤٹ آف فیملی شادیوں کے رواج نہیں تھا۔اس کی دونوں بھابیاں بھی اس کے ماموں اور چچا کی بیٹیاں تھیں، اس لیے اس کے خاندان سے باہر رشتہ کیے جانے پر سب لوگوں نے احتجاج کیا تھا اور تو اور اس کے دونوں بھائی نہیں مان رہے تھے وہ خود گھبرا رہی تھی اور چاہتی تھی کہ ابو انکار کر دیں مگر وہی بات کہ رشتے تو آسمان پر ہی طے ہوتے ہیں اور نیچے والے تو صرف انہیں ملانے کی زحمت کرتے ہیں اس کا رشتہ بھی مغیث سے آسمانوں پر ہی طے ہوا تھا جب ہی تو ابو نے کچھ ہی دنوں میں نہ صرف ہاں کر دی بلکہ اس کی پڑھائی کی رٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے شادی کی تاریخ بھی دے ڈالی اور شادی تک کا وقت اس نے روتے دھوتے گزارا رابعہ کو بھی یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ اکلوتی بیٹی کو اٹھا کر غیروں میں دے دیں خود ان

کے دونوں بھائی سمیطہ کے رشتے کے طلب گار تھے۔ان کو نظر انداز کرتے ہوئے مغیث کے لیے اقبال صاحب کی ہاں انہیں بہت چبھی تھی۔لیکن یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔

اور اس کے سارے رونے دھونے شادی کے بعد ختم ہو گئے اور ان کی جگہ قہقہوں اور مسکراہٹوں نے لے لی۔سب لوگ اچھے تھے۔مغیث سب بہن بھائیوں میں بڑا تھا پھر حنا تھی۔اس کے بعد راحیل اور حسیب اور آخر میں مونا۔ان کے والد کا تقریباً سال بھر پہلے اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ خدیجہ بانو کا رویہ اگرچہ بہت اچھا نہیں تھا سب لوگوں کی طرح لیکن برا بھی نہیں تھا۔شروع شروع میں وہ اس سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی تھیں مگر بعد میں نارمل ہوتی گئیں۔مونا نے اسے بتایا کہ ای ایک تو بھائی کی شادی ابھی کرنا نہیں چاہ رہی تھیں۔دوسرے وہ اپنے کوئی بھتیجی لانا چاہ رہی تھیں لیکن یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی جس کو وہ بہت محسوس کرتی۔

گھر کے مالی حالات اگرچہ بہت اچھے نہیں تھے کیونکہ ساری ذمہ داری تقریباً مغیث پر تھی۔ راحیل کا انجینئرنگ کا تیسرا سال تھا اور حسیب نے ابھی سیکنڈ ایر کے پیپر زدیئے تھے یا پھر خدیجہ بانو کے نام ان کے والد کی طرف سے ایک دکان تھی جس کا معقول کرایہ آتا تھا بہر حال اچھا خاصا گزارہ ہو جاتا تھا حنا بی اے کر چکی تھی اور خدیجہ اس کے لیے کسی اچھے رشتے کے لیے انتظار میں تھیں۔

ابھی اس کی شادی کو سال ہی ہوا تھا کہ دعا آ گئی۔خدیجہ پہلے پوتے کی منتظر تھیں پوتی کو دیکھ کر ان کا موڈ آف ہو گیا جبکہ باقی سب کے ہاتھ جیسے کھلونا آ گیا۔راحیل اور حسیب کالج سے آتے ہی اسے جھپٹ لیتے۔سارا دن وہ حنا اور مونا کے پاس رہتی۔سمیطہ کو تو اس کے لیے بہت پریشان ہونا ہی نہیں پڑا تھا۔وہ سارا دن پھوپھیوں اور چچاؤں کے پاس رہتی اور سمیطہ کچن میں مصروف رہتی۔

کبھی کبھی اسے خود بھی حیرت ہوتی کہ شادی سے پہلے تو اسے محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً انڈا ابالنا نہیں آتا تھا اور اس بات پر اس نے خدیجہ بانو کے سال بھر طعنے سنے تھے۔وہ جب بھی میکے جاتی بھابیوں سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر آتی صرف پانچ چھ ماہ میں ہی اس نے سب کچھ پکانا سیکھ لیا تھا اور تب ہی بالکل غیر محسوس طریقے سے حنا اور ای نے کچن مکمل طور پر اس کے سپرد کر دیا۔وہ سارا دن پیاز، لہسن ہلدی اور مرچوں میں الجھی رہتی۔دعا کے آنے کے بعد تو اسے ذرا سا آرام کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔دوپہر کو وہ سونے کے لیے لیٹتی تو حنا دعا کو اسے دے جاتی اور ماں کی شکل دیکھتے ہی ہوشیار ہو جاتی۔نینداس کی آنکھوں سے غائب ہو جاتی اور اس کی کھل کھل کرتی ہنسی اس کی ساری تھکن چھین لیتی۔

اور پھر ان دنوں مغیث بھی کس قدر مصروف ہو گیا تھا۔اس نے کہیں پارٹ ٹائم جاب کر لی تھی صبح کیا کا رات دس گیارہ بجے لوٹتا اور وہ انتظار کرتے کرتے نڈھال ہو جاتی۔سارا دن گھر کے کام ختم

نہ ہوتے شام میں راحیل اور حسیب کا کوئی نہ کوئی دوست آ جاتا۔

"بھابھی! چائے، بھابھی اسکوائش، بھابھی کھانا، بھابھی کچھ اسنیکس بھی ساتھ۔" ساری شام اس کی ان ہی آوازوں پر لبیک کہتے ہوئے گزر جاتی۔ حنا موڈی تھی۔ موڈ ہوتا تو سارا دن لگی رہتی اس کے ساتھ، نہ ہوتا تو کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی اور مونا کو پڑھائی سے فرصت نہ تھی۔ ماں باپ کا گھر ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی اسے مہینہ مہینہ بھر جانے کی فرصت نہ ملتی۔ امی کے گلے بھرے فون اور بھائیوں کے شکوے وہ مصروفیت کا کہہ کر نظر انداز کر دیتی۔ اسے یاد آتا کہ وہ گھر بھر کی کس قدر لاڈلی تھی بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک اس کے اتنے لاڈ اٹھائے گئے تھے کہ غم یا دکھ جیسی کسی شے سے واقف ہی نہ تھی۔ بھائیوں کی لاڈلی، ابو کی پیاری اور امی کی تو جان تھی اس میں پھر بھابھیاں آ گئیں اور وہ دونوں بھی اس قدر اچھی تھیں کہ لڑائی جھگڑا تو درکنا کبھی تو تکار کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ اس کا کام تو بس ان سے نت نئی فرمائشیں کر کے ڈشز بنوانا اور ہر مہینے دو تین اچھے ڈریسز بنانا تھا اور بس۔

اور شادی کے بعد اس کی زندگی کتنی تبدیل ہو گئی تھی، وہ جو ہل کر پانی نہ پیتی تھی۔ اب سارے گھر کے آگے ٹرے میں کھانا سجا کر پیش کرتی۔ چائے بنا بنا کر تواضع کرتی۔ پتا نہیں محبتیں بلا معاوضہ کیوں نہیں ملتیں؟

(ہر محبت کا کچھ نہ کچھ معاوضہ، کچھ تقاضا ہوتا ہے۔ بے لوث محبتیں شاید صرف والدین کرتے ہیں لیکن نہیں ان کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور اگر ان تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے تو یہ محبتیں بھی ننگی ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ منہ پھاڑ کر تاوان مانگنے لگتی ہیں۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب محبت کی مکڑی نے اس کے گرد مصروفیت کا مضبوط جال بن دیا۔ مغیث احمد کی محبت تو سب محبتوں پر حاوی تھی اور وہ اس کی محبتوں کی مقروض ہو چکی تھی۔ بس پور پور بھیگتی گئی اور شکریے کے طور پر اس سے منسلک ہر رشتے، ہر محبت کو ہر صورت نبھانے کے سعی کرتی چلی گئی) حنا کی فرمائش سب سے اہم ہوتی چاہے وہ رات کے آٹھ بجے چکن بریانی کی فرمائش کرتی اور مونا جتنی مغیث کی پیاری تھی۔ اسے خود بخود ہو گئی تھی۔ اسے خوب صورت ملبوسات کا جنون تھا اور اپنے جہیز کے انتہائی قیمتی اور خوب صورت کپڑے اس نے آرام سے مونا کے حوالے کر دیے اور جب وہ انہیں ٹھیک کروا کر پہنتی اور خوش ہوتی تو اس کی خوشی کا احساس ہی سمیطہ کو نہال کر دیتا اور خدیجہ بانو کی بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی لیے تو وہ ان کے کہنے پر فجر کے وقت اٹھ جاتی۔ اپنے گھر میں اس کی صبح نو بجے سے پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی اور حسیب تو ویسے ہی بہت اچھا تھا۔ مغیث کی طرح گم اور چپکے چپکے سب کا خیال رکھنے والا اس نے کبھی سے بے جا بات نہیں کی تھی اور وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خود ہی خیال رکھنے لگی تھی۔

اور راحیل، راحیل کی بات اور تھی۔ سارے گھر میں رونق اسی سے تھی۔ وہ گھر میں ہوتا تو گھر کی دیواریں بھی جیسے شور مچانے لگتیں۔ مغیث کے بعد وہ بہت جلد جس سے بے تکلف ہوئی تھی وہ راحیل تھا۔ اس کے ہر کھانے کی خواہ وہ کتنا ہی بدذائقہ کیوں نہ ہوتا، وہ برملا تعریف کرتا۔

"بھابھی! آپ بلیک کلر پہنا کریں، یہ کلر آپ پر سوٹ کرتا ہے۔"

وہ کہتا اسے خود بھی پتا تھا کہ بلیک کلر اس کی گوری رنگت پر کتنا کھلتا ہے۔ یہ بات شادی کے شروع کے دنوں میں دو ایک بار مغیث نے بھی اس سے کہی تھی۔ اس نے اگلی شاپنگ میں ہی دو نئے بلیک کلر کے سوٹ خرید لیے تھے مگر اب تو مغیث کو فرصت ہی نہ ہوتی تھی، وہ جو بھی کلر پہن لیتی۔ رات تک اس کی تھکن زدہ نظروں میں اس کا رنگ ایک جیسا ہی ہو جاتا تھا۔ کتنی بار وہ شام کو اہتمام سے تیار ہوتی کہ اگر آج وہ جلدی آ جائے تو وہ کہیں باہر جائیں یا ای کی طرف ہو آئیں اور رات دس گیارہ بجے تک جب وہ خود بھی اپنی ڈریسنگ سے اکتا جاتی تو وہ تھکے ہوئے لہجے میں آ کر صرف کھانے کی فرمائش کرتا تو اس کا جی جل کر رہ جاتا۔ اس نے خود پر توجہ دینا ہی چھوڑ دی۔

(اور کتنی بار کی پڑھی یہ بات اس کو یاد آ جاتی کہ عورت بھی عجیب چیز ہے۔ مل جائے تو نظر نہیں آتی نہ ملے تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔)

مغیث کا بھی شاید یہی حال تھا جب تک وہ اسے ملی نہ تھی، دن رات سوتے جاگتے اسے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا اور اب وہ اس کی دسترس میں تھی تو نظر ہی نہیں آتی تھی جیسے وہ بھی اس کی روٹین کا حصہ بن گئی تھی۔ میاں بیوی کا رشتہ اگر روٹین کا حصہ بن جائے تو زندگی سے ہر طرح کی کشش ختم ہو جاتی ہے اور روٹین کے کاموں سے اعصاب تھکنے لگتے ہیں۔ اسے بھی یہی لگتا کہ دو ڈھائی سالوں میں ہی جیسے وہ تھکنے لگی تھی۔)

"بھابھی! اس بار عید پر آپ بلیک کلر کا سوٹ بنوایئے گا یا پھر ڈارک میرون یا براؤن، یہ کیا آپ نے ڈل ڈل سے کلر پہننے شروع کر دیے ہیں ماسیوں جیسے۔"

وہ روٹیاں پکا رہی تھی جب راحیل نے سالن کے ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے اس سے ال گرے کلر کے سادہ سوٹ میں دیکھ کر کہا تھا تو وہ جیسے چونک اٹھی اس کا حلیہ بھی تو ان دنوں ایسا ہو رہا تھا۔

"چھوڑو مجھے۔ عید تو بچوں کی ہوتی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اس بار دعا کا ریڈ کلر کا فراک سلواؤں۔ صبح کو وہ پہن لے گی اور بعد میں ریڈی میڈ فراک۔" اس نے پھلکا توے سے اتارتے ہوئے کہا۔

"وہ تو پہنے گی ہی مگر آپ بھی تو اپنا خیال رکھا کریں، ہر وقت فضول کاموں میں لگی رہتی ہیں۔" وہ موضوع جسے وہ اپنے تئیں بھلا چکی تھی وہ اسے یاد کرا رہا تھا۔

"اگر یہ فضول کام ہیں تو ان کے نہ ہونے پر سب سے زیادہ تمہارا حشر ہو کیونکہ تم ہی سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ مونا! سب کو آواز دو۔ کھانا لگ گیا ہے۔" اس نے دروازہ سے داخل ہوتی مونا سے کہا۔

"چلیں فضول نہ سہی لیکن یہ بھی نہیں کہ ان کی وجہ سے انسان خود کو بھلا بیٹھے۔ ابھی آپ کی شادی کو تین سال بھی نہیں ہوئے اور یوں لگتا ہے جیسے دس سال ہو گئے ہیں اور وہ بھائی صاحب یوں سنجیدہ رنجیدہ سے پھرتے ہیں جیسے بیٹی بیاہنے جا رہے ہوں۔ حنا کی شادی میں بھی آپ نے وہی کپڑے پہنے تھے اپنی شادی والے بکسوں سے نکال نکال کر۔"

"وہ کون سے پرانے ہو گئے تھے سال ڈیڑھ سال میں جوان کو بیکار کر دیتی پھر بھی اس نے نئے سوٹ کو بنا ہی لیے تھے، اتنی ذمہ داریاں ہوں جب سر پر تو اپنے چونچلے اٹھاتا انسان اچھا نہیں لگتا۔" خدیجہ بانو اندر آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے تنقیدی انداز میں بولیں۔

"لیکن امی! یہ بھی تو کوئی طریقہ نہیں کہ ہر وقت انسان گھسیارا بنا رہے۔" سمیطہ کے گھورنے کے باوجود راحیل اپنی ہانکے جا رہا تھا۔

"تم اپنی بیوی کو ہر وقت آئینے کے سامنے بٹھائے رکھنا۔ میاں یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ ذرا نوکری سے لگ جاؤ نا اور شادی کر لو تو پھر پتا چلے گا کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے اور اس پر کون سی پابندی ہے جو یہ اس طرح کا حلیہ بنائے پھرتی ہے تا کہ لوگ اس پر ترس کھائیں۔ ارے بچے تم نہیں جانتے عورت ذات کو، بڑے چلتر آتے ہیں اسے خود کو مظلوم ظاہر کرنے کے۔"

وہ چولہے کے آگے سن کھڑی رہ گئی۔ تنقید کرتے وقت وہ یہ بھول گئیں کہ وہ کس صنف کو نشانہ بنا رہی ہیں اور اس کی زد میں ان کی اپنی ذات بھی آ رہی ہے۔ لیکن اس بات کا احساس تو اس وقت شاید اسے بھی نہ ہو سکا۔ آنکھوں میں ایک دم سے جلن ہونے لگی اور وہ دعا کو دیکھنے کے بہانے باہر نکل گئی تھی۔

انسان سب کو خوش کرنے کے چکر میں کسی کو بھی خوش نہیں کر سکتا اور وہ بھی اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ کوئی بھی اس کی محبت سے، خدمت سے، بہت راضی نہیں تھا۔ وہ ان سب کا حصہ بننے کے باوجود سب سے علیحدہ تھی، کسی پیوند کی طرح جو کپڑے کے عیب تو ڈھکتا ہے مگر خود کسی عیب کی طرح نظر آتا ہے کپڑے کا حصہ بھی اور اس سے علیحدہ بھی اور اس کپڑے کے texture

(ساخت) کا حصہ بننے کے لیے ابھی کتنا وقت، کتنی خدمت درکار ہوگی، یہ تو اسے پتا نہیں تھا لیکن یہ بہر حال اسے پتا چل گیا تھا کہ سب کو راضی کرنے کے چکر میں وہ خود سے مکمل طور پر غافل ہو چکی ہے جب ہی تو وہ رات کو چاہے جاگ رہی ہوتی یا سو رہی ہوتی مغیث کے لیے اس کی حیثیت برابر ہوتی تھی۔

کبھی کبھی دوسروں کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے خود کو اہمیت دینی پڑتی ہے۔ اس نے بھی ذرا غور کیا تو اسے پتا چلا کہ کسی اور کا تو کچھ نہیں بگڑ رہا بلکہ سب کی بستر پر بیٹھے سب کی ضرورتیں ہاتھ پیر ہلائے بغیر پوری ہو جاتی ہیں۔ اس کا البتہ نقشہ بگڑ رہا ہے۔ آخر کیوں؟

جب مغیث سب کی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔ سب کی فرمائشیں پوری کرتا ہے وقت نہ ہونے کے باوجود مونا کو اس کی کسی دوست کے گھر پک اینڈ ڈراپ کر سکتا ہے۔ اپنی نوکری کی ٹائٹ ٹائمنگ میں سے لازی وقت نکال کر خدیجہ بانو کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے جا سکتا ہے۔ راحیل کے مختلف انٹرویوز کے لیے اس کی تیاری کروا سکتا ہے۔ حسیب کی میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پارٹ ٹائم جاب کر سکتا ہے تو سمیطہ کے لیے اس کے پاس اتنا بھی وقت نہیں ہوتا کہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد اس کے ساتھ اس کے والدین کے گھر چلا جائے۔ یہ ڈیوٹی بھی سال بھر سے راحیل نے سنبھال رکھی تھی اسے خود سے فرمائش کرنا نہیں آتی تھی، تو کیا اسے نظر نہیں آتا تھا کہ وہ تین چار سالوں سے موسموں کے لحاظ سے بدل بدل کر وہی پرانے کپڑے پہن رہی ہے یا اس نے آخری بار اس کے لیے شاپنگ کب کی تھی۔ کیا بیوی بننے کے بعد اس کے اندر سے اچھا لگنے اور رہنے کی سب خواہشیں مر گئی تھیں۔

جب وہ بہنوں کے لیے، ماں کے لیے، بھائیوں کے لیے چیزیں خریدتا تھا تو بیوی کے لیے اس کی جیب تنگ کیوں پڑنے لگتی تھی اور جیب بھی وہیں تنگ پڑنے لگتی ہے جہاں دل تنگ پڑ جائے۔

اس کی بھابھیاں شادی کے اتنے سالوں بعد بھی سر شام بن ٹھن کر تیار ہوتی تھیں اور اپنے شوہروں کے ساتھ کہیں نہ کہیں ضرور جاتی تھیں۔ چاہے ہفتے میں ایک آدھ بار ہی سہی اور مہینے میں ایک دو نئے سوٹ بھی ضرور بنواتی تھیں اور سال میں نئے ڈیزائن کے ایئررنگز وغیرہ بھی ضرور بنواتیں اور اس کے پاس تو وہی شادی والا زیور تھا جسے وہ تقریباً ہر جگہ کئی کئی بار پہن چکی تھی۔ اسے خود تو اس بات کا احساس نہ ہوتا تھا لیکن بھابھیاں یا کوئی کزن ٹوکتی تو اسے خیال آتا کہ ایک آدھ چیز نئی بنوانی چاہیے مگر جب مغیث کے معاشی حالات کا اسے خیال آتا، وہ فوراً ایک ذمہ دار اور جاں نثار قسم کی بیوی بن جاتی۔

لیکن کیا ذمہ داری اور جاں نثاری صرف اس کا فرض تھا؟ کیا مغیث کی اس سے متعلقہ سب ذمہ داریاں ختم ہو گئی تھیں؟

اور جب اس نے مغیث کو عباد کے آنے کی خوشخبری سنائی تھی تو اس نے کتنے عجیب لہجے
کہا تھا جب تک حسیب اور راحیل کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی۔ وہ مزید ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتا، تو
وقت اس کا دل چاہا تھا کہ اس سے خوب لڑے، اسے آئینہ دکھائے اور اس سے پوچھے کہ وہ پہلے کون
ذمہ داریاں نبھا رہا ہے سمیطہ اور دعا کے کپڑے ہر موسم کے بدلنے پر امی کی طرف سے آ جاتے تھے
خود جاتی تو بھابیاں اسے کبھی خالی ہاتھ نہ آنے دیتیں، جوتے کپڑے اور دعا کے کھلونے لیکن ان سب
کے باوجود اس کا دل چاہتا کہ سال میں ایک سوٹ ہی سہی اس کے لیے مغیث لے کر آئے تو اس
سارے گلے آپوں آپ مٹ جائیں گے۔

لیکن اسے تو راحیل، حسیب اور مونا کی ذمہ داریاں نبھانا تھیں، جن کے خیال نے اسے
کی سب ذمہ داریوں سے سبکدوش کر رکھا تھا۔ اس دن سے اس نے بھولے سے بھی کبھی اس سے
فرمائش نہیں کی تھی۔

(شوہر اور بیوی کا رشتہ چاہے جتنی محبتوں کے خمیر سے کیوں نہ گوندھا جائے۔ اس میں اگر انا
ہو جائے تو پھر کتنی ہی کوشش کر لو۔ روئی کی شکل میں کہیں نہ کہیں کمی ضرور رہ جائے گی)

اور یہی ان دونوں کے درمیان ہوا، ان کے درمیان غیر محسوس طریقے سے انا آ گئی۔ را
کے اس دن کے تبصرے کے بعد اس نے اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا اور ہر ایک کی آواز پر لبیک
ہوئے دوڑنا کم کر دیا۔ جب انسان کو اپنی اہمیت کا تھوڑا سا احساس ہو جائے تو دوسروں کو نظر انداز
زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ اور اس کی اس تبدیلی کا احساس بھی سب سے پہلے راحیل کو ہوا۔

"شکر ہے، ہماری بھابی کو بھی کچھ خیال آیا اپنی ڈریسنگ کا ورنہ تو جب دیکھو سر جھاڑ منہ
کے مقولے پر عمل کرتی نظر آتی تھیں۔ ایسے کلر پہنا کریں کہ کسی کو نظر آ سکیں۔"

اس نے چائے پیتے مغیث کو دیکھ کر ذومعنی انداز میں کہا تو مغیث نے واقعی اسے ذرا
سے دیکھا۔ وہ جھینپ گئی۔

"ارے بھئی ہم کون سا ان پر پابندی لگاتے ہیں۔ ان کی جیسی مرضی ہوتی ہے، ویسا
بنائے رکھتی ہیں۔"

خدیجہ بانو نے کچھ بے نیازی دکھاتے ہوئے کہا اور کتنے دنوں بعد مغیث نے اس سے
چلنے کی فرمائش کی تو اسے یقین ہو گیا کہ دوسروں سے خود کو منوانے کے لیے پہلے خود کو منوانا پڑتا ہے۔

وہ کتنے دن خود کو بھولی رہی تو سب اس کو بھولے رہے، اس نے خود کو مانا تو جیسے سب
آنے لگی۔ یہ اچھا لطیفہ تھا۔

پھر ستائش کس کو اچھی نہیں لگتی اور عورت تو تعریف کے دو بولوں کی بھوکی ہوتی ہے۔ اس کی
شان میں دو بول بول دو، کتنے دن اس کے خمار میں ڈوبی رہے گی۔

لیکن اچانک وہ واقعہ ہو گیا جو ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔

"پنکی بیٹا! کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری جو اسکول سے آتے ہی ایسے لیٹ ہو
گئی۔" رابعہ نے بیڈ پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئی

"کھانا بھی نہیں کھایا تم نے۔" مامتا فکر مند تھی اور وہ خود اپنی مامتا کو خیالوں کی تھپکیوں سے سلا رہی تھی۔

"جی ٹھیک ہوں۔ بس ویسے ہی لیٹ گئی تھی۔" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

"اسکول سے بھی دیر سے آئی ہو، کوئی کام تھا وہاں؟" ان کا لہجہ ہنوز فکرمند تھا۔

"جی!" پتا نہیں کب ان کے بیچ یہ اجنبیت آ گئی تھی۔

"اچھا چلو۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لو۔ تمہارے ابو بھی تمہارا پوچھ رہے ہیں۔" وہ
بولیں تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

میں کھانا یہیں لا دوں؟" وہ اسے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر بولیں۔

"نہیں امی! میں آ رہی ہوں۔" وہ تو خود شرمسار تھی کہ سارا گھر اس کی وجہ سے پریشان تھا۔

☆☆☆

تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟" مغیث کافی دیر سے آ چکا تھا، ایاز کو کل سے بخار تھا اس لیے
وہ فلیٹ پر ہی تھا۔ مغیث واش روم سے منہ ہاتھ دھو کر نکلا تو ایاز جاگ چکا تھا۔ مغیث نے اس کا حال
پوچھا۔

"ٹھیک ہوں اب، پہلے سے بہتر۔" وہ لال سرخ آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا اور تکیہ سر سے
اونچا کر کے ذرا سا اٹھ گیا۔

"تم نے کچھ کھایا تھا؟" مغیث اس کے پاس آ بیٹھا اور ہاتھ لگا کر اس کی پیشانی کو چھوتے
ہوئے بولا۔

"ہاں، دودھ لیا تھا، ساتھ میں دوا بھی۔" "تم آج جلدی آ گئے۔"

"ہاں مسٹر پیٹر تمہارا پوچھ رہے تھے، میں نے بتایا تو از راہ ہمدردی مجھے ایک گھنٹہ پہلے چھٹی
دے دی ورنہ بار میں تو بڑا رش تھا۔ ویسے یار! یہ گورے بھی عجیب مخلوق ہیں۔ سارا دن ڈالروں کے پیچھے
پاگل کتوں کی طرح بیگار میں جتے رہتے ہیں اور شام کو سارے ڈالر لال پانی میں بہا دیتے ہیں۔ ویسے
آر کسٹرا تمہارے بغیر اداس تھا۔" وہ اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہونہہ، کوئی کسی کے بغیر اداس نہیں ہوتا۔ یہ تو پھر میوزیکل انسٹرومنٹس ہیں، یہاں تو انسان پل میں صدیوں کے ساتھ کو فراموش کر دیتا ہے۔“ وہ ہنکارا بھر کر بولا تو مغیث اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم انسانی رشتوں سے، انسانی محبتوں سے اتنے خائف کیوں ہو۔“

”کیونکہ میں ان کی حقیقت کو جانتا ہوں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”حقیقت تو ہر حال میں تلخ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ان ہی حقیقتوں کو جانتے بوجھتے جھٹلانا پڑتا ہے، ان ہی کے بیچ سے تو خواب نکلتے ہیں۔“

”جو محض سراب ہوتے ہیں۔“ اس کا لہجہ کڑوا تھا۔

”سراب ہوتے ہیں مگر آس تو ہوتے ہیں۔ صحرا کا سفر کتنا ہی دشوار گزار اور پیاسا کیوں ہو۔ سراب ہی مسافر کو زندہ رکھتا ہے اور خواب ہی جینے کی امید بندھاتے ہیں۔ یہ آس اور امید اگر نہ ہو تو کوئی اگلے دن بیدار ہونے کی تمنا نہ کرے۔“ مغیث نے کمبل ٹانگوں پر لیا۔

”فائدہ؟ جب تلاش لاحاصل کا نتیجہ سراب ہو اور یہ علم بھی ہو تو خود کو دھوکا دینے سے تھکا دینے سے فائدہ؟“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

”میرے بھائی! فائدہ نقصان کیسا؟ یہ زندگی کوئی کاروباری معاملہ تو نہیں اور رشتوں میں اتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ کسی ایک دھوکے کو کسوٹی بنا کر ہم ہر رشتے، ہر محبت کو مسترد نہیں کر سکتے جینے کے لیے ہمیں کسی نہ کسی پر بھروسا کر کے اس کا ہاتھ تھامنا ہی پڑتا ہے۔“ مغیث مربیانہ انداز میں بولا۔

”چاہے یہ ساتھ دو گھڑی کا ہو۔“ وہ طنز سے ہنسا۔

”دو گھڑی کا ہو تو بھی مضائقہ نہیں۔ زندگی ہے کتنی، چار گھڑی اور اس سے بڑا لکی کوئی نہیں جسے دو گھڑی کا ساتھ مل گیا۔ تم پر آج قنوطیت طاری ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ”دیکھو ایاز! میں نے زندگی کا معاملہ تم سے شیئر کیا ہے اور تم نے اتنے عرصے کی رفاقت میں ایک بار بھی مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتا سکو۔ پھر بھی تم مجھے دوست کہتے ہو۔“ کتنی بار کا دہرایا ہوا گلہ اس کی زبان پر آ گیا۔

”معلوم نہیں تمہیں میرے بارے میں کیا تجسس ہے، حالانکہ نہ بتانے کی کوئی خاص وجہ نہیں ماضی کے واقعات وہ دہراتا پھرے جسے حال سے کچھ امید ہو یا وہ مستقبل کے لیے کوئی بڑے بڑے خواب دیکھتا ہو، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں بس زندگی کو ایسے ہی گزارنا چاہتا ہوں جیسے یہ گزر رہی ہے۔“ وہ ٹالنے والے انداز میں بولا تو مغیث نے اسے کچھ خفگی سے دیکھا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔

”اچھا چلو، ناراض نہ ہو۔ میں بتاتا ہوں۔“ ایاز نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا تو وہ فوراً متوجہ ہو گیا۔

”یہ تو تمہیں پتا ہی ہے کہ میرا تعلق بلوچستان سے ہے۔ وہاں ”کچھ“ سے آگے ایک گاؤں ہے ”کورس“ میرا گھر وہیں تھا۔ ہم تین بہن بھائی تھے بھائی مجھ سے بڑا تھا اور بہن مجھ سے کافی چھوٹی تھی۔ ہمارا چھوٹا سا سیبوں کا باغ تھا، بھائی اور باپ دونوں وہاں پر کام کرتے تھے۔ بہن تارا مجھے بہت پیاری تھی بلکہ ہم دونوں میں بے مثال پیار و محبت تھی۔ بھائی نے تعلیم بالکل حاصل نہیں کی، مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ پہلے مسجد مکتب اور پھر ”اڑک“ میں اسکول تھا وہاں اور بعد میں کوئٹہ تعلیم کے حصول کے لیے گیا۔ تارا کو بھی پڑھنے کا شوق تھا لیکن وہاں ایسی کوئی سہولت نہ تھی۔ میں نے اسے اردو لکھنا اور پڑھنا سکھا دیا تھا۔

ہمارا گھر بلوچوں کی ساری نمائندہ خصوصیات کا حامل تھا۔ مہمان نوازی سے لے کر غصہ اور غیرت کی نمود تک یہ سب میرے باپ اور بھائی میں موجود تھے۔ میری ذہنیت تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے یا گھر سے دور رہنے کی وجہ سے ان سے مختلف ہو گئی تھی۔ میں جب بھی گھر جاتا، تارا کے لیے چھوٹی چھوٹی ڈھیر ساری چیزیں لے کر جاتا پہلے گڑیاں چھوٹے چھوٹے کھلونے اور پھر چوڑیاں، رنگین پراندے شیشے والی جوتیاں اور خوب صورت شالیں۔ وہ دن گن گن کر میرے آنے کا انتظار کرتی تھی۔ مغیث میرے دوست! میں تمہیں کیا بتاؤں، وہ مجھے کتنی پیاری تھی۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔

”اس کی موہنی صورت آج بھی میری آنکھوں کی پتلیوں پر جمی ہوئی ہے جو نہ آنسو بہانے سے زائل ہوتی ہے اور نہ سونے سے مٹتی ہے۔ یہ محبتیں ہمیں جیتے جی ہی مار دیتی ہیں۔“ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گہرا سانس لی۔

”ماں کو دق ہو گئی۔ پتا نہیں کیسے حالانکہ ماں ایک صحت مند عورت تھی۔ خوب مضبوط اور توانا جسم کی مالک پہاڑوں کے لوگ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے آگے نہیں ہارتے۔ بس اس کا بخار بگڑ گیا پھر نمونیہ ہو گیا جس سے اس کے پھیپھڑے متاثر ہو گئے۔ خاندانی دیسی نسخوں سے اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ میں نے سب سے کہا کہ ماں کو کوئٹہ لے چلتے ہیں نہ بھائی نے میری بات مانی نہ ابا نے۔

سیکنڈ ایر کی چھٹیوں میں میں گھر گیا، ماں کی طرف سے بڑی فکر تھی لیکن وہاں دوسرا ہنگامہ منتظر تھا۔ گاؤں کے اسکول میں کوئی ٹیچر آیا تھا۔ اس کا خط غلطی سے ہمارا گھر آ گیا۔ تارا نے خط پر لکھا ایڈریس پڑھا اور خط ماسٹر کو دینے چل پڑی اور انجانے میں موت کی پگڈنڈی پر پہلا قدم رکھ بیٹھی۔

انسان پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک صرف ایک چیز کے لیے تڑپتا ہے، رزق تو ا
ہی جانا ہوتا ہے۔ تڑپتا تو وہ محبت کے لیے ہے، توجہ کے لیے۔ جوں جوں وہ عمر کی منزلیں طے کرتا
طلب بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بچہ ہوتا ہے تو ماں باپ کی محبت پھر بہن بھائی کی محبت پھر گلی محلے کے دو
اور ہمجولیوں کی اور پھر پتا ہی نہیں چلتا کب ان سب محبتوں کے ہوتے ہوئے اس کا دامن خالی ہو جا
جسے پھر صرف ایک ہی محبت بھر سکتی ہے اور وہ ہے محبوب کی محبت، میری وہ معصوم بہن بھی ان دشوا
گھاٹیوں پر نہ صرف چڑھنے لگی بلکہ اتنی دور نکل گئی کہ میری محبت بھری صدا بھی اسے واپس نہ بلا سکی
ادھر ماں کی حالت انتہائی خراب تھی۔ ادھر تارا بہزاد کے ساتھ خدا جانے کہاں چلی گئی
ماں خون اگل رہی تھی اور ابا اور بھائی کے سروں پر خون سوار تھا۔ میری منت سماجت بھی انہیں ن
سکی۔ وہ ان دونوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور تیسرے دن جب ماں کی گڑھوں میں
آنکھوں میں زندگی کی ذرا سی رمق باقی تھی، وہ ان دونوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتے ہو
آئے۔

''مغیث! میں تمہیں کیسے بتاؤں میری آنکھوں کے سامنے۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
ضبط سے اس کی آواز پھٹنے لگی اور آنکھوں سے جیسے خون چھلکنے لگا۔ ''میری آنکھوں کے سامنے ما
بستر کے پاس انہوں نے ان دونوں کو پل بھر میں اکٹھے موت کے سفر پر روانہ کر دیا۔ ان کے جسمو
نکلنے والے گرم خون کے فواروں نے میرے باپ اور بھائی کے سینے یکدم ٹھنڈے کر دیے اور وہ س
کر ماں کی طرف بڑھے۔ جس کے سینے میں آخری سانس اٹکی ہوئی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ بھی
ساتھ جا ملی، موت کے سفر میں۔ وہ دونوں چلی گئیں اور میرا زندگی کے ہر رشتے، ہر محبت سے ا
اپنے ساتھ لے گئیں۔
خون کے رشتے کیا ہوتے ہیں؟ تم اپنے جسم سے بوتل خون نکال کر کسی دوسرے کو لگا
سے تمہارا خون کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ یہی ہے بس اس کی اہمیت۔'' وہ بیڈ کی پٹی پر آ کر بیٹھ گیا۔
آنکھوں سے وحشت جھلک رہی تھی ''اگر رشتوں میں احساس کا رشتہ نہیں ہے تو پھر یہ خون کا رشتہ
ہے اور اس سے بڑا جھوٹ بھی اور کوئی نہیں اور میں نے بھی ایسے سارے جھوٹے رشتوں سے نا
ہے۔ کتنا ہی عرصہ دھر ادھر دھکے کھانے کے بعد یہاں آ بسا۔ یہاں وہاں سے اب مجھے کچھ فرق نہ
بس اس کا تمہیں تجسس تھا۔'' وہ چپ ہو گیا تو مغیث کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیسے اس کے غم کو شیئر کر
''لیکن یہ کہانی میری ہے، تمہارا تجربہ زندگی کے رشتوں کے بارے میں اور ہے۔'' وہ
بعد اپنی آواز کو نارمل بناتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے کہتا ہوں کہ تم واپس چلے جاؤ۔''

''کیسے واپس جاؤں، ہاتھ میں بھی تو کچھ ہو۔ جو کچھ اکٹھا کیا تھا پلاٹ خرید لیا ہے، وہاں جا
کر کیا کروں گا۔ نوکری تو ملنے سے رہی۔''
''یہ بھی تمہارا وہم ہے، لوگ ہر بات کو بڑی جلدی بھول جاتے ہیں۔ تم دل سے لگا کر بیٹھ
ہو۔''
''پھر بھی اب اچھی نوکری کہاں ملے گی، سوچ رہا ہوں دو چار سال اور لگا لوں۔ اچھی بھلی
دگی بسر ہو رہی تھی نہ اس روز بینک میں ڈکیتی ہوتی اور اگر ہو بھی گئی تھی تو کم از کم میں ان لوگوں کو نہ
انتا اور اگر پہچان بھی لیا تھا تو منہ بند رکھ لیتا۔ وہ تینوں میرے کلاس فیلو تھے۔ ایک کا نقاب سرک گیا اور
اس کا نام لے بیٹھا۔ بعد میں منیجر نے پولیس میں میرا نام دے دیا، پورے چار ماہ حوالات میں
انے۔ اگر سمیطہ کے والد اور بھائی دوڑ دھوپ نہ کرتے تو شاید میں ابھی تک جیل میں سڑ رہا ہوتا نوکری تو
کی عزت سادات بھی گئی۔ چار ماہ سرکار کا مہمان رہنے کے بعد مجھے کس نے نوکری دینی تھی۔ اقبال انکل
لے چاہا کہ کچھ سرمایہ لگا کر وہ مجھے کوئی کام شروع کروا دیں۔ ایک تو مجھے کاروبار کا تجربہ نہیں تھا دوسرے
مزید ان کے احسانات کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ بس اللہ نے مہربانی کی اور ادھر کا چانس بن گیا
لانکہ ان دنوں میں بالکل نہیں آنا چاہ رہا تھا۔'' اس نے گہرا سانس لیا۔
''سمیطہ کی طبیعت ان دنوں بالکل اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے ان ہی دنوں کی ڈیٹ بتائی تھی مگر
کیا کرتا، ان سب سلسلوں کو جاری رکھنے کے لیے بھی روزگار کا ہونا ضرور تھا۔ وہ ویسے بھی کچھ عرصے
مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی۔ ظاہر ہے اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ شادی کے چند ماہ کے بعد
میں نے اسے کون سی خوشیاں دی تھیں جو وہ خوش خوش پھرتی اور میں آنے سے پہلے اسے کچھ خاص
لی بھی نہ دے سکا۔ بس ان دنوں عجیب سے حالات رہتے تھے سمیطہ کی پریشانی، حنا کی شادی، امی کا
ال موڈ، راحیل کا آخری سال اور اوپر سے میری بے روزگاری۔ بس جیسے ہی ادھر کا ویزا لگا میں نے
دن فالتو نہ لگایا اور ٹکٹ کنفرم کروا لیا۔ بس اب تو سمجھو جیسے پھنس گیا ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔
''کافی دنوں سے تمہارے گھر سے کوئی خط بھی نہیں آیا۔'' ایاز نے اسے پھر یاد دلایا۔
''ہاں کافی دن ہو گئے ہیں۔ میرے خط کا جواب بھی نہیں آیا۔ صبح فون کروں گا۔'' مغیث
ہوئے بولا۔ ''اب تو یہی سہارے ہیں جینے کے، تم بھی اب آرام کرو۔ تمہاری طبیعت پہلے ہی اچھی
ں ہے۔'' اس نے ایاز سے کہا تو وہ بھی لیٹ کر کمبل اوڑھنے لگا۔

☆☆☆

کیسے عجیب سے دن تھے وہ بھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسے بھی ہو سکتا ہے۔

مغیث حوالات میں تھا، بیس لاکھ کی ڈکیتی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بینک کے بہت سے لوگ شک میں دھر لیے گئے تھے مگر مغیث کے کیس میں شک اس لیے یقین میں بدل رہا تھا کہ اس نے ڈاکوؤں کو کے نام سے پکارا تھا لیکن یہی بات اس کے حق میں جاتی تھی کہ اگر وہ ان کا ساتھی تھا تو وہ انہیں کیوں ان نام سے پکارتا۔ بہر حال ابو اور بھائی اپنی سی کر رہے تھے۔

اور وہ جو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ مغیث کے اور اس کے درمیان بہت فاصلے آ گئے ہیں، اچانک افتاد سے اس پر انکشاف ہوا کہ بظاہر لاپروائی کی اس دھول کے نیچے دبی ان کی محبت کا رشتہ مضبوط ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی تھی۔ دن رات ذہن کی سوئی ایک ہی نقطے پر اٹک گئی تھی۔ کوشش کے باوجود اس سے ملنے نہ جا سکی، مغیث نے بھی اسے آنے سے منع کر دیا تھا۔ اور عظیم بھائی نے اس کے لیے بڑا اچھا وکیل کیا تھا۔ اس کے باوجود خدیجہ بانو کے طعنوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سابقہ خدمتوں اور خوش بختیوں پر انہوں نے پانی پھیر دیا تھا۔ پہلے وہ کہتی تھیں کہ سمیطہ کے آنے سے ان کے بیٹے کی ترقی ہوئی ہے۔ اسے پارٹ ٹائم جاب کا معاوضہ بھی زیادہ ملنے لگا ہے۔ کٹر مذہبی عقائد رکھنے کے باوجود اس بات پر بھی ان کا عقیدہ سو فیصدی تھا کہ رزق عورت کے نصیب سے آتا ہے اور اس معاملے میں سمیطہ کا نصیب بہت اچھا ہے لیکن یہ تو گئے دنوں کی بات تھی تازہ صورت حال کے تحت مغیث کے حوالات جانے میں سراسر سمیطہ کے نصیبوں کا دخل تھا۔

ایک تو مغیث کی پریشانی دوسرے اس کی اپنی حالت، اس غم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھی پھر گھر کے کام تو تھے ہی اور اس پر ساس کے طعنے وہ تو جیسے دنوں ہی میں نچڑ کر رہ گئی۔ آنکھیں ہر وقت ساون بھادوں برساتیں مگر یہ کام بھی چھپ چھپا کر ہوتا تھا کیونکہ اس کی ساس اس کی پلک بھی گیلی دیکھ لیتیں تو طوفان اٹھا دیتیں کہ یہ نحوست ہے، اس کے آنسو بدشگونی پھیلا رہے ہیں اور وہ خود بہانے بہانے سے دیر دیر تک اشک بہاتیں۔ اسے نہ رونے کی اجازت تھی نہ ہنسنے کی۔ ذرا سی راحیل یا مونا سے بات کر لیتی وہ بڑبڑانے لگتیں۔

”میرا بچہ جیل میں پڑا سڑ رہا ہے اور اسے ٹھٹھے سوجھ رہے ہیں۔ ہاں بھئی، انہیں کس بات کا غم، اماں باوا کے پیسے کا تکبر ہے۔ پر میری بات بھی سن لو یہ سارے رشتے ناتے شوہر کے دم سے ہیں۔ یہ ایک رشتہ نہ ہو تو سارے رشتے منہ موڑ لیتے ہیں اور پیسے جیسی کمزور شے پر کیا اترانا۔“

وہ پتا نہیں کون کون سے فسانے گھڑ لیتیں اور سمیطہ کڑھ کر رہ جاتی۔

پھر جب رابعہ اس کا حال پوچھنے آئیں تو خدیجہ بانو کی آواز مارے صدمے کے اتنی نیچی تھی کہ رابعہ کو ان کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہونا پڑا تھا۔ ان کا اپنا دل کٹ رہا تھا داماد کے بارے میں سوچ سوچ کر۔ لیکن جب انہوں نے گھٹی گھٹی سے سمیطہ کو دیکھا تو فوراً اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ خدیجہ نے حتی الوسع انہیں روکنے کی کوشش کی اگر یہ بھی چلی گئی تو کیا کریں گی کہ اس کی چلتی پھرتی صورت سے انہیں بیٹے کی کمی اتنی محسوس نہیں ہوتی۔

”نہیں بہن جی! سمیطہ کی حالت بھی تو آپ دیکھیں، آپ کا دکھ بجا لیکن میں سمیطہ کو بھی یہاں اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی۔ اللہ نے چاہا تو مغیث ایک دو ہفتے تک آ جائے گا۔ سمیطہ کے ابو پوری کوشش کر رہے ہیں۔“

رابعہ کی بات پر وہ چپ کر گئیں کہ بہر حال مغیث کے کیس میں ساری دوڑ دھوپ تو وہ لوگ ہی کر رہے تھے۔

پھر واقعی مغیث کو عدالت نے اگلے مہینے باعزت بری کر دیا لیکن نوکری چلی گئی۔ ابو اور بھائیوں نے اسے فیکٹری میں کام دینا چاہا تو اس نے انکار کر دیا اگر وہ ایسا کر لیتا تو سمیطہ کی نظر میں اس کا مقام اور گر جاتا کہ دنیا کی ہر عورت اپنے مرد کو مضبوط اور خوددار دیکھنا چاہتی ہے پھر اس نے اپنے ایک دوست کے توسط سے امریکہ جانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ کچھ پیسہ اس نے خود لگایا اور کچھ اقبال صاحب سے قرض لیا اور پانچ مہینے بعد ہی وہ امریکہ چلا گیا جب سمیطہ کو اس کی بہت ضرورت تھی۔

اس کے جاتے ہی خدیجہ بانو نے پھر سے اپنے ہتھیار تیز کر لیے۔ سمیطہ کے والدین کے احسان نے انہیں پانچ ماہ احسان مند رکھا تھا مگر اب وہ پھر سے سب کچھ فراموش کر چکی تھیں۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھیں لیکن سمیطہ نے تو دینا چھوڑ دی تھی ان کی کڑوی کسیلی کے جواب میں بے تاثر چہرہ لیے پھرتی رہتی۔ مغیث بہت عجلت میں گیا تھا، چار پانچ ماہ جانے کی دوڑ دھوپ میں لگ گئے نہ کوئی تسلی نہ کوئی پیمان، جس کے سہارے وہ یہ لمبی جدائی کاٹتی بس سوچتی اور کڑھتی رہتی۔

صرف ایک راحیل کا دم تھا، گھر میں جو اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتا۔ دعا کی ضرورتوں کا، اس کی سیر و تفریح کا ورنہ تو وہاں زندگی از حد دشوار ہو چلی تھی۔ ماں باپ کے گھر بار بار جانا، ساس کے دکھڑے رونا اسے پسند نہیں تھا اور بھابھیاں کتنی اچھی سہی لیکن روز روز جا کر اسے اپنی قدر کم کرنا اچھا نہیں لگتا تھا اگرچہ رابعہ نے اس سے بہت کہا کہ وہ ادھر آ جائے کم از کم ڈلیوری تک، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس طرح خدیجہ بانو کو ایک اور موضوع مل جاتا۔

پتا نہیں وہ کیوں ایسی ہو گئی تھیں۔ پہلے ایک دو سال تو ان کا رویہ اس کے ساتھ اچھا تھا پھر آہستہ آہستہ انہیں اس کا وجود بھی کھٹکنے لگا تھا اور اب تو یہ حال تھا کہ وہ ڈاکٹر کو دکھا کر آتی تو وہ اس سے حال بھی نہ پوچھتیں۔ اسے کتنی شرم آتی تھی جب راحیل کے ساتھ جانا پڑتا تھا اول تو وہ کوشش کرتی تھی کہ

امی کے ساتھ ہی جائے اسی لیے اس دن ادھر چلی جاتی لیکن اگر کبھی اس نے خدیجہ بانو سے کہا بھی تو صاف انکار کر دیتیں اور آخری روز بھی اسے راحیل کے ساتھ ہی جانا پڑا۔ ان کے سر میں درد تھا اس لیے وہ سونے کے لیے چلی گئیں۔ جب ڈاکٹر نے دوائیں وغیرہ لکھ کر دیں تو اس نے راحیل سے کہا کہ پہلے وہ امی کو فون کر دے۔ فون سنتے ہی رابعہ اور یاسمین فوراً فہیم کے ساتھ آ گئیں تو اسے سکون ہوا۔

اور خدیجہ بانو رات کو تھوڑی دیر کے لیے پوتے کی خوشخبری سن کر آئیں۔ رابعہ انہیں سنانا چاہ رہی تھیں کہ ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اس نازک موقع پر بہو کے ساتھ ہاسپٹل ہی آ جاتیں مگر سمیطہ نے انہیں آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

اور پھر اس کے بعد بے شمار دن اور طویل راتیں جو اس نے اسی بے کلی اور اداسی میں گزاریں۔ مغیث نے دھڑا دھڑ ڈالر بھیجنے شروع کر دیے تھے، راحیل کی نوکری کے لیے کوششیں سست ہو گئی تھیں بلکہ وہ کسی کاروبار کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ خدیجہ بانو کو اچھا بھلا گھر ایک دم سے تنگ لگنے لگا تھا اور انہوں نے پلاٹ کی رٹ لگا دی۔ وہ راحیل کا رشتہ اپنے بھائی کی بیٹی سے کرنا چاہ رہی تھیں اور منیر ماموں کا لاکھوں کا بزنس تھا اور اکلوتی بیٹی کے لیے انہیں داماد بھی لکھ پتی ہی چاہیے تھا اس لیے وہ چاہ رہی تھیں کہ اگر گھر عالیشان ہو گا تو وہ بھائی کو منا ہی لیں گے اس رشتے کے لیے، بعد میں مغیث اور پیسے بھیجے گا تو اس سے وہ راحیل کو کوئی بزنس کرا دیں گی۔ ان کی خواہشات کا حجم دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

منی آرڈر اور ڈرافٹ سب ان کے نام بینک میں جمع ہوتے تھے اور سمیطہ کے اخراجات جو پہلے بھی اس کے والدین کے ذمہ تھے، وہی صورت حال اب بھی تھی بلکہ اب تو دونوں بچوں کا خرچ بھی ان میں شامل ہو گیا تھا۔ صرف کھانا پینا اس کے گھر کے ذمے تھا جو سب کھاتے وہ بھی وہی کھا لیتے تھے اور اسے اتنی شرم آتی جب ہر پھیرے پر امی اس کے اور بچوں کے کپڑے اور جوتوں کا ڈھیر اٹھا لاتیں مگر اس کی ساس کو شرم نہ آتی سب کچھ وصول کرتے ہوئے کبھی راحیل کو خیال آ جاتا تو وہ بچوں کے لیے کوئی کھلونا یا کپڑے لے آتا ورنہ تو وہاں سب اس کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ خطوں میں خیریت اور بچوں کے احوال کے سوا کچھ نہ ہوتا اور فون تو زیادہ تر خدیجہ اور مونا وغیرہ اٹینڈ کرتی تھیں۔ اس نے بھی خود سے خط میں کبھی کوئی تقاضا نہ کیا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ خود سے اسے کبھی خیال نہیں آئے گا۔ اس کی سوچیں باغی ہونے لگتیں۔ اس نے چپ رہ رہ کر ان لوگوں کو اپنی ضرورت کے ہر احساس سے عاری کر دیا تھا۔

اب اگر بولتی تو سب نے انجان بن کر کہنا تھا "اچھا۔ تم نے پہلے کیوں نہیں کہا؟" اس کی ضرورتیں تو اور بھی کم ہو گئی تھیں مگر بچوں کی بڑھتی جا رہی تھیں، اس کے جی میں آتا کہ کہیں نوکری کر

لے۔ ایک بار وہ خدیجہ بانو سے یہ ذکر کر بیٹھی تو انہیں جیسے پتنگے لگ گئے۔

"کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں۔ یوں کہو گھر میں بیٹھنا برا لگتا ہے۔ میاں وہاں کما کما کر ہلکان ہو رہا ہے اور یہ تنگی کے رونے رو رہی ہے۔" پھر انہوں نے دو تین اتنے رکیک جملے کہے کہ اس نے دوبارہ نام نہ لیا۔

اور وہ تو نبھا کیے جا رہی تھی اگر اس رات یہ آخری جھٹکا نہ لگتا تو شاید اس کے صبر کا پیمانہ نہ چھلکتا۔

☆☆☆

"پھر کیا کہتی ہے رابیل پاکستان جانے کے بارے میں، میں سوچ رہا تھا کہ مظفر صاحب کی فیملی پاکستان جا رہی ہے کچھ دنوں کے لیے رابیل کو ان کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔" ایاز نے چپ چاپ بیٹھے مغیث سے کہا۔

"وہ نہیں جانا چاہ رہی ہے۔"

"کیوں؟ یہاں کون ہے اس کا؟" ایاز ابرو اچکا کر بولا۔

"پتا نہیں، وہ کہہ رہی ہے کہ وہ یہاں نوکری کر کے اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرے گی اور" وہ چپ ہو گیا۔

"اور کیا؟" ایاز نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" مغیث نے گہرا سانس لیا۔

"کیا بات ہے۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟" ایاز نے جانچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہوں۔" مغیث نے چونک کر کہا۔ "نہیں۔ کوئی بات نہیں۔"

"تم کچھ چھپا رہے ہو۔"

"نہیں کچھ نہیں۔" اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"تم آج پھر گئے تھے رابیل کی طرف؟" ایاز نے پوچھا۔

"ہاں آفس سے واپسی پر گیا تھا۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر جہاں مسز ظہیر نے اسے سیل گرل لگوایا ہے۔ کام تو مل گیا ہے اسے لیکن وہ بہت پریشان ہے۔" مغیث کا ہمدردانہ لہجہ اسے برا لگا۔

"کیوں؟ اب کیوں پریشان ہے وہ، جب وہ جانا نہیں چاہ رہی تو پھر یہاں رہ کر آرام سے کام کرے۔ پھر پریشانی کیسی؟" ایاز کا لہجہ تیکھا تھا۔

"یہ رستہ اس کا اپنا منتخب کردہ ہے۔ تم اس کی فکر میں ہلکان مت ہو اور تم اس سے بہت زیادہ

ملنے نہ جایا کرو۔ اب اسے خود یہ سب کچھ کرنے دو۔"

"ایسے کسی کو اکیلے چھوڑ دینا بھی تو اچھا نہیں لگتا۔" مغیث کو ایاز کا مشورہ پسند نہیں آیا۔

"کیوں تمہارا اس سے رشتہ ہی کیا ہے جو تم بھاگ بھاگ کر اس سے ملنے جاتے ہو۔ جہاں تک ہم وطن ہونے کے رشتے کا سوال ہے ہم نے اس کی مدد کی، اب وہ جانے اور اس کا کام۔ تم چھٹی لے رہے ہو پاکستان جانے کے لیے۔" ایاز نے بات بدلی۔

"نہیں، ابھی چھٹی نہیں مل رہی، ویسے بھی پلاٹ کا نقشہ منظور کرالیا ہے راحیل نے اور کام شروع کردیا ہے۔ اب تو چند سالوں تک میرا جانا مشکل لگ رہا ہے۔" مغیث کا لہجہ بیزار سا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم، اتنے سال ہوگئے ہیں تمہیں یہاں۔ اب تمہیں پاکستان جانا چاہیے۔ وہاں تمہاری بیوی منتظر ہوگی تمہاری۔"

"کوئی منتظر نہیں ہے میرا۔" مغیث تلخی سے بولا "کتنے ماہ سے اس نے مجھے خط نہیں لکھا۔ میرے پچھلے تین خطوط کا جواب نہیں دیا، کسی خط میں کبھی نہیں لکھا کہ میرا انتظار ہے۔ میں فوراً چلا آؤں یا اس سے میرے بغیر رہا نہیں جاتا یا اسے میرے آنے سے کچھ فرق پڑا ہے۔ میں نے فون کیا تھا کل۔ امی نے بتایا۔ وہ تقریباً دو ماہ سے اپنے میکے بیٹھی ہوئی ہے، بچوں کو یہاں چھوڑ کر۔ پھر میں کیوں جاؤں؟" اس نے سلگتے ہوئے کہا۔

"دو ماہ سے وہ اپنے والدین کے گھر میں ہیں اور تمہیں خبر نہیں۔" ایاز حیرت سے گویا ہوا۔

"میکے جانے کی وجہ پوچھی تم نے اپنی امی سے۔"

"وہ میرے گھر والوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس کا میچ میرے ساتھ بنتا ہی نہیں تھا۔ اسے اپنے والدین کے پیسے کا مان ہے۔ یہ تو میری محبت اسے باندھے ہوئی تھی ورنہ شاید۔"

"اچھا اور یہ خیال علیحدہ ہونے کا انہیں اتنے سالوں بعد آیا جبکہ تمہاری محبت کی زنجیر بھی کتنے سالوں سے مضبوط نہیں رہی۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" وہ شانے اچکا کر بولا۔

"بہت افسوس کی بات ہے مغیث! ایک انسان تمہارے نام کے سہارے زندگی گزار رہا ہے اور تمہیں کچھ احساس نہیں۔ محض قیاس کی بنا پر تم اس کے جذبات کی نفی کر رہے ہو۔ کیا صرف تمہاری محبت اسے باندھ سکتی تھی؟" ایاز کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔

"تو میں کیا کروں، جانے کا سوچتا ہوں تو امی منع کر دیتی ہیں کہ چند سال اور لگا لو بھائی سیٹ ہو جائیں رہنے کا سوچتا ہوں تو۔" وہ ہونٹ کاٹ کر چپ ہو گیا۔

"مغیث! ایف ایس سی میں میں نے ارشمیدس کا قانون پڑھا تھا کہ گہرے سمندر میں سوئی تو ڈوب جاتی ہے مگر جہاز نہیں ڈوبتا۔ اس وقت مجھے یہ قانون سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر اب سمجھ میں آ گیا ہے۔ محبت کا سمندر جتنا وسیع ہوگا۔ زندگی کا جہاز کبھی نہیں ڈوب سکتا، سمندر کا پانی خود اسے سہارا دے کر رواں رکھے گا اور جہاں محبت کا حجم کم ہو جائے گا انسان کا وجود سوئی سے بھی ہلکا ہو جائے گا اور اسے ڈوبنے سے پھر کوئی نہیں روک سکے گا۔ مغیث میرے دوست! ان محبتوں کو محسوس کرو جو تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہیں، تمہیں سہارا دیے ہوئے ہیں اگر ان کو نظر انداز کرو گے تو بہت جلد ڈوب جاؤ گے اور ڈانوا ڈول ہونا کتنا اذیت ناک ہے۔ یہ تم مجھے دیکھ کر سمجھ سکتے ہو۔" ایاز کے لہجے میں سناٹے بول رہے تھے۔

"میں سب جانتا ہوں لیکن میں کیا کروں، گھر کے کیا حالات ہیں، ادھر کی بھی پریشانی ہے۔ سمیطہ کیوں چلی گئی اور وہ بھی بچوں کو چھوڑ کر، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ پریشانی سے سر ہاتھوں میں جکڑ کر بولا۔

"جتنا سوچوں گے۔ اتنا ہی الجھو گے اس لیے کچھ فیصلہ کرلو۔"

"کیا فیصلہ کرلوں۔ میرے پاس اتنا کچھ نہیں ہے کہ پاکستان جا کر کچھ کرسکوں اور بیوی بچوں کو یہاں بھی نہیں بلا سکتا۔ عجیب مشکل ہے۔"

"انہیں نہیں بلا سکتے تو خود چکر لگا آؤ کچھ دن کے لیے، فریش ہو جاؤ گے۔" ایاز نے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ مجھے یہی کرنا چاہیے، کرتا ہوں کچھ۔" وہ سوچتے ہوئے سر ہلا کر بولا تو ایاز نے اطمینان کا سانس لیا۔

☆☆☆

پھر رابعہ اقبال صاحب کے مجبور کرنے پر سمیطہ کے سسرال گئیں تو جو بات انہیں خدیجہ بانو نے بتائی، اس نے ان کے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ وہ تو بچوں کو لینے گئی تھیں۔ خدیجہ بانو کی بات نے انہیں اپنا مدعا بھی بھلا دیا اور وہ عجیب ذلت کا احساس لیے واپس آ گئیں اور آتے ہی جو انہوں نے بستر سنبھالا تو کتنے دن بخار اور اعصابی تھکن نے انہیں چور چور کیے رکھا۔ وہ جیسے خود سے بھی نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں۔

"امی! کیا بتایا آنٹی خدیجہ نے کہ سمیطہ اس طرح کیوں آ گئی؟" یاسمین نے انہیں دوا دیتے ہوئے کتنے دن کا چبھتا ہوا سوال کر ہی دیا تو وہ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئیں۔

"کوئی خاص نہیں۔ وہی گھریلو چپقلش۔" انہوں نے مدھم آواز میں ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"ایسا بھی کیا کہ سمیطہ کو آدھی رات کو نکلنا پڑا اور پھر بچوں کو چھوڑ کر۔" یاسمین کا انداز جتاتے

والا تھا۔ رابعہ چپ رہیں۔

"اب کیا کہتی ہیں، کم از کم آپ بچوں کو تو لے آتیں۔" یاسمین کچھ دیر بعد بولی۔

"کہا تھا میں نے، وہ کہتی ہیں کہ کچھ دن بعد وہ خود بچوں کو لے کر آئیں گی۔" انہوں نے کمزور لہجے میں کہا "پنکی کہاں ہے۔ اسے ذرا میرے پاس بھیجو۔" یاسمین کے سوالات انہیں ڈسٹرب کر رہے تھے۔

"اپنے کمرے میں ہوگی۔ وہ تو بس کمرے کی ہو کر رہ گئی ہے۔ میں بھیجتی ہوں۔" یاسمین اٹھتے ہوئے بولی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"سمیلہ سے بھلا انہوں نے کیا کہنا تھا۔ اس سے تو وہ آتے ہی پوچھ گچھ کر چکی تھیں۔ اس کی وہی خاموشی یا پھر "مجھے نہیں پتا۔" نے انہیں بیمار کر ڈالا تھا۔ وہ خدیجہ بانو کی بات کی تردید یا تصدیق کرنے سے بھی انکاری تھی۔ پتا نہیں کیسی بے حسی اس پر طاری ہوگئی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اقبال صاحب نے اندر آ کر ان کے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

"شکر ہے اللہ کا، بہتر ہوں اب۔" وہ ذرا سا اٹھتے ہوئے بولیں۔

"میرا خیال ہے، آج پھر ڈاکٹر سے چیک اپ کرا لیتے ہیں۔" انہوں نے رابعہ کے زرد چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں اب۔" تو وہ چپ کر گئے۔

"اس دن کیا کہا تھا پھر خدیجہ نے کہ پنکی کیوں آ گئی تھی اس طرح۔" وہ کچھ دیر بعد بولے تو رابعہ کے چہرے پر زبردستی سجی ہوئی مسکراہٹ بھی جیسے یک لخت غائب ہوگئی۔

"رابعہ! تم بتا کیوں نہیں رہیں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔" انہوں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ تو انہوں نے سوچا چھپانے سے فائدہ! پتا تو چل ہی جانا ہے۔ انہوں نے مدھم آواز میں ساری بات بتا دی تو اقبال صاحب جیسے سن ہو کر رہ گئے۔

"اتنی بڑی بات انہوں نے کیسے کہہ دی؟" وہ کافی دیر بعد بولے۔

"سچ اور جھوٹ کے بارے میں تو خدا ہی جانتا ہے۔ مگر اس وقت تو ہماری بیٹی کی چپ انہیں سچا ثابت کر رہی ہے۔" رابعہ نے آہ بھری۔

"ایسا نہیں ہو سکتا، مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسا ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

"خدا کرے، ایسا ہی ہو۔" رابعہ نے دعا کی۔

"اب کیا کریں۔ تم نے بچوں کو ہی لے آنا تھا۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی بات سن کر مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا، بس چپ چاپ اٹھ کر آ گئی۔"

"میرا خیال ہے، مغیث کو اس سارے معاملے کا علم نہیں ہے اور شاید پنکی کا اس سے رابطہ بھی نہیں ہے۔" اقبال صاحب نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"شاید۔"

"بات ایسی ہے کہ فون پر بھی نہیں کی جا سکتی۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔

"مغیث کا پاکستان آنا ازحد ضروری ہے۔ بس اسے کسی طرح اطلاع کر کے آنے کا کہتا ہوں۔ یہ معاملہ اسی طرح حل ہوگا۔"

"آپ صحیح کہتے ہیں، ہماری بیٹی کوئی گری پڑی ہے جو ہم یوں خاموشی سے سر جھکا لیں۔ ان کے ہر الزام کو سچ مان لیں۔" رابعہ کڑھ کر بولیں۔

"ہوں۔ اب یہی کرنا پڑے گا، تم فکر نہیں کرو۔" اقبال صاحب کھڑے ہو گئے، "میں عظیم سے اس مسئلے پر بات کرتا ہوں۔ وہ کیا کہتا ہے۔"

"اس سے کہیے گا بیوی کے کانوں میں نہ ڈال دے، بہن کی زندگی کا معاملہ ہے۔" رابعہ نے آواز نکالی۔

"اتنا بیوقوف نہیں ہے وہ، بیوی کی فطرت سے واقف ہے۔ پھر بھی میں کہہ دوں گا۔ تم اب آرام کرو۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"مسٹر پیٹر تمہارا پوچھ رہا تھا۔ تم آج آئے کیوں نہیں؟" ایاز نے چپ چاپ لیٹے مغیث کو ایک نظر دیکھ کر کہا۔

"بس ایسے ہی۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"کدھر چلے گئے تھے؟" ایاز بستر پر آ بیٹھا۔

"کہیں نہیں۔ ذرا ایک دوست کی طرف۔" مغیث کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"کون سے دوست کی طرف۔"

"ہے ایک، تمہیں نہیں پتا۔" اس کا لہجہ بیگانہ سا تھا۔

"ایسا کون سا دوست ہے تمہارا جس کے بارے میں میں نہیں جانتا۔" ایاز کا انداز مغیث کو

برا لگا۔

"آخر تم کیوں پوچھ رہے ہو، کیا اب میں اپنی مرضی سے کسی سے مل بھی نہیں سکتا۔ کیا ضروری ہے کہ ہر کام تم سے پوچھ کر، تمہیں بتا کر کروں میں۔" اس نے بلند آواز میں کہا اور چڑ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے انداز پر ایاز ایک لمحے کو چپ سا کر گیا۔

"نہیں۔ ایسا کوئی ضروری بھی نہیں ہے سب کچھ بتانا، میرا تمہارا رشتہ ہی کیا ہے۔ سوری۔" ایاز نے سرد لہجے میں کہا اور کمبل درست کرتے ہوئے لیٹ گیا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ ایاز کے انداز پر مغیث کو اپنے لہجے کی زیادتی کا احساس ہوا، وہ کچھ دیر یونہی ندامت محسوس کرتا رہا۔ پھر اسے پکار بیٹھا۔

"ایاز! سوری میں کچھ کچھ غلط بول گیا۔" ایاز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"سو گئے ہو کیا؟" اس نے بے چینی سے اسے پھر پکارا، وہ پھر خاموش رہا۔

"پلیز یار! آئی ایم سوری۔ میں کچھ پریشان ہوں اس لیے۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔

"نہیں کوئی بات نہیں، میں نے برا نہیں مانا۔ انسان بڑی ڈھیٹ چیز ہے حالانکہ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ اب زندگی میں کسی سے کوئی تعلق نہیں جوڑوں گا نہ دور کا نہ نزدیک کا لیکن پھر پتا نہیں کیسے یہ عہد ٹوٹ جاتے ہیں۔" اس کا لہجہ بکھرا ہوا تھا۔

"سوری یار! یقین کرو میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ بس میں پریشان ہوں اس لیے ایسا بول گیا۔ تعلق کوئی چاہنے یا نہ چاہنے سے تھوڑی جڑتے ہیں یہ تو خود بخود قائم ہو جاتے ہیں ہمارے درمیان بھی دوستی اور خلوص کا رشتہ خود بخود قائم ہو چکا ہے اسی لیے میں تم پر بلاوجہ خفا ہوا اور تمہیں میری بات بری بھی لگی۔" وہ بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھ گیا۔ "اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ ذرا اٹھ کر بیٹھو ایک بات کرنی ہے تم سے۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا تو وہ اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے؟" جب مغیث کچھ دیر تک نہ بولا تو ایاز نے پوچھا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بتاؤں؟" اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

"جو بات ہے بتا دو اور ہاں تم کہہ رہے تھے کہ چھٹی کے لیے تم نے درخواست دی ہے۔" ایاز نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں دی تھی، اب سوچ رہا ہوں واپس لے لوں۔" وہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا مطلب، کیا تم پاکستان نہیں جاؤ گی۔" ایاز حیرانی سے بولا۔

"جاؤں گا لیکن ابھی نہیں۔ امی نے منع کر دیا ہے۔ کہ مونا کا بہت اچھا رشتہ آیا ہوا ہے اور وہ لوگ دو تین ماہ میں شادی کرنا چاہ رہے ہیں، اب میں اس کی شادی پر ہی آؤں اور کچھ پیسوں کا انتظام بھی کرنا پڑے گا اس لیے۔" ایاز کو اس کی بے بسی پر ترس آنے لگا۔

"اور کیا بات تھی جس نے تمہیں پریشان کر رکھا تھا اور تم نے بارے چھٹی بھی کی۔ کیا یہی بات تھی؟" ایاز کے پوچھنے پر مغیث نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ اور بات ہے ایاز! میں تھک رہا ہوں بہت زیادہ کچھ تو ہو میرے لیے بھی۔" اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے کرسی سے سر ٹکا دیا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" ایاز نے ٹانگیں بستر سے نیچے لٹکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"ایسے کیسے زندگی گزرے گی۔ مونا کی شادی کے لیے پیسہ ضروری ہے میرا جانا نہیں کیونکہ امی چاہتی ہیں۔ حسیب ہاؤس جاب کر لے تو اس کو اسپیشلائزیشن کے لیے میں یہاں بلا لوں۔ راحیل اپنے دوست کے ساتھ گلاس فیکٹری میں پارٹنر شپ کی بنیاد پر پیسہ لگانا چاہ رہا ہے اور پھر اس کی شادی بھی۔ اس سارے سلسلے میں میرے پاس جانے کی کہیں گنجائش نہیں۔ کم از کم چار پانچ سالوں تک۔"

"پھر؟" ایاز نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پھر کیا ساری قربانیاں مجھے ہی دینی ہیں۔ کیوں آخر؟ زندگی کی خوشیوں پر میرا کوئی حق نہیں؟" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ تمہارا خیال ہے ورنہ تم ابھی بھی سب کچھ چھوڑ کر جا سکتے ہو۔" ایاز نے کہا۔

"نہیں جا سکتا۔ خون کے رشتے تمہارے نزدیک بے معنی ہیں لیکن میرے نزدیک سب کچھ ہیں۔ تم صحیح کہتے ہو کہ سچا رشتہ احساس کا ہوتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ رشتہ کہیں نہیں ہوتا۔" وہ تلخی سی بولا۔

"اگر تمہارے نزدیک خون کے رشتوں کی اتنی اہمیت ہے تو پھر سب سے زیادہ حق تمہارے بچوں کا ہے تم پر اور بیوی کے ساتھ تمہارا احساس کا رشتہ ہے۔ لیکن اس کو تم جھٹلا کر کہہ رہے ہو کہ یہ نہیں ہوتا۔"

"بہر حال میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

"کیا؟"

"میں شام کو راحیل کی طرف گیا تھا۔ اس نے مجھے بلوایا تھا۔ ایاز! اسے یہاں کسی سہارے کی

ضرورت ہے اور مجھے بھی شاید۔'' وہ ایاز کی چبھتی ہوئی نظروں سے آنکھیں چرا کر بولا۔ ''اس نے مجھ سے شادی کی درخواست کی ہے۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم شادی شدہ ہو اور دو بچوں کے باپ بھی۔'' ایاز نے تیزی سے کہا۔

''ہاں یہ جانتے ہوئے بھی لیکن وہ میرے احساسات کو بخوبی سمجھتی ہے اور میں اس کے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ آخر میں کب تک تپتی دھوپ میں تنہا جلتا رہوں۔ کیا کسی شجر تلے بیٹھنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

''حقوق و فرائض کی جنگ بڑی پرانی ہے اور اس کا فیصلہ تم اکیلے نہیں کر سکتے جبکہ بہت سے لوگوں کا تم پر حق ہے لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ احساس کا جو رشتہ تمہارے اور رابیل کے درمیان فقط چند دنوں میں قائم ہوا ہے اور جس کی آنچ تم نے فوراً محسوس کر لی یہی رشتہ تمہارے اور سمیطہ بھابھی کے درمیان سالوں سے ہے۔ اس کی حدت کو تم اتنی جلدی کیسے بھول گئے۔'' ایاز کا انداز کڑوا تھا۔

''میں نے تم سے بہت پہلے کہا تھا کہ مغیث! واپس چلے جاؤ تم لاکھ جھٹلاؤ کہ تم مضبوط اعصاب کے مالک ہو، تم اپنے جذبات کو کنٹرول کر سکتے ہو لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ تم کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہو جذبات کی مضبوطی اور ان کی شدت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ میاں بیوی کے بیچ اگر میلوں فاصلے آ جائیں تو ان کی سوچیں کرپٹ ہو جاتی ہیں۔ اپنی راہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ پہلے دل دور ہوتے ہیں اور پھر احساس مٹنے لگتا ہے جسم کا بھی اور محبت کا بھی۔ مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔

محبت کی یہی تشنگی تمہیں رابیل کی طرف کھینچ کر لے گئی۔ تم صحیح کہتے ہو کہ کوئی خود پر کہاں تک جبر کر سکتا ہے تو پھر سوچو تم مرد ہو، مضبوط ہو اور چاہو تو خود پر قابو پا سکتے ہو لیکن وہ جو تمہاری بیوی ہے۔ تم سے کہیں کمزور۔ اس کی تشنہ آرزوؤں کا تمہیں خیال کیوں نہیں آیا ایسا سوچتے ہوئے۔ کیا تم سے بندھ کر زندگی کی خوشیوں پر اس کا کوئی حق نہیں رہا۔ اس کا حق تم کسی اور کی جھولی میں ڈالنے چلے ہو۔ تم بہت عرصے پہلے ٹوٹ چکے تھے میں نے بھی رابیل کی مدد کی ہے، ہاسپٹل میں اس کی تیمارداری کی ہے۔ اس نے یہی درخواست مجھ سے کیوں نہیں کی، تم سے کیوں کی، کیونکہ تم خود اس کی طرف جھک رہے تھے اپنی مضبوطی کا ڈھنڈورا پیٹ کر اندر ہی اندر کمزور پڑتے جا رہے تھے۔ تمہارا دل اپنی بیوی کی جدائی سے کمزور پڑ چکا تھا اور رابیل نے تمہاری کمزوری کا اندازہ لگا لیا تھا۔

باقی تم اپنی مرضی کے مالک ہو جو چاہو فیصلہ کرو لیکن ایک بار ایسا کرنے سے پہلے اپنی جگہ اپنی بیوی کو رکھ کر ضرور سوچ لینا۔ تمہیں کیسا محسوس ہوتا اور یہ بھی سوچ لینا کہ کیا مردوں کی محبت اتنی ہی بودی

ہوتی ہے کہ چار پانچ سال کا قلیل عرصہ اس کا احساس تک دل سے مٹا دیتا ہے۔''

ایاز کی باتوں نے جیسے مغیث کے سامنے آئینہ رکھ دیا جس میں اسے اپنی محبت کی بگڑی ہوئی شکل بہت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہر بات صحیح تھی ایسا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، ایسا سوچتے ہوئے سمیطہ اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اسے خود پر حیرت سی ہونے لگی۔ یہ تبدیلی کیسے آئی۔ اس کے اندر کیا واقعی دوریاں سوچوں کو کرپٹ کر دیتی ہیں۔ منفی سوچوں کو رستہ زیادہ آسانی سے مل جاتا ہے اسے پتا ہی نہ چلا اور وہ اتنا بدل گیا۔

ایاز نے اسے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کروٹ بدل لی۔

''اور ہاں، یہ خط آیا ہوا ہے تمہارا پاکستان سے۔'' اسے لیٹے ہی خیال آیا تو سائیڈ ٹیبل کی دراز سے خط نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

مغیث نے خط اس کے ہاتھ سے لے کر غائب دماغی سے کھولا اور لیکن سرنام پڑھ کر وہ حیران رہ گیا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی سی تحریر تھی۔

پیارے پاپا!

آداب

آپ حیران ہوں گے کہ میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں، پاپا مجھے اب خط لکھنا، آ گیا ہے، آپ کا ایڈریس میں نے چاچو کی ڈائری سے لیا تھا۔

پاپا آپ پاکستان کیوں نہیں آتے۔ میری کتنی دوستوں کے پاپا باہر ہوتے ہیں لیکن وہ تو ان سے ملنے آتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں آتے۔ پاپا میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں، میں آپ کو یاد نہیں آتی؟

پہلے میں آپ کو اتنا مس نہیں کرتی تھی ماما جو ہوتی تھیں لیکن اب ماما کو بھی نانو کی طرف گئے بہت بہت دن ہو گئے ہیں۔ وہ بھی ہمارے پاس نہیں آتیں۔ میں اور بھائی اکیلے ہیں پاپا۔ بھائی ماما کو یاد کر کے روتا رہتا ہے۔ آپ کا تو اسے پتا نہیں ہے، اس لیے وہ آپ کو یاد نہیں کرتا مگر میں آپ دونوں کو یاد کرتی ہوں۔

ماما ہم سب سے بہت ناراض ہیں اور دادو لوگ ماما سے۔ میرے اور بھائی کے ساتھ پھوپھو سوتی ہیں لیکن اب تو ان کی شادی ہونے والی ہے پھر ہم کس کے ساتھ سوئیں گے؟ پاپا! آپ ماما سے کہیں کہ وہ واپس آ جائیں۔ جب بھائی بہت روتا ہے تو دادو کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ چاچو سے کہتی ہیں ان کی ماں تو ایش (عیش) کر رہی ہے، انہیں یتیم کھانے (خانے) چھوڑ آؤ۔

پاپا یتیم کھانے کون سی جگہ ہے، جہاں آپ رہتے ہیں کیا وہ جگہ ہے۔ پلیز پاپا ہمیں بھی یتیم کھانے بلا لیں یا پھر ہمارے پاس آ جائیں پاپا۔"

اس سے آگے کیا تھا۔ پانی کی چادر آنکھوں کے آگے تن گئی تھی، وہ کچھ پڑھ ہی نہ سکا اور خط کو مٹھی میں بھینچ کر ہونٹوں سے لگا لیا اور ایاز کوشش کے باوجود کچھ نہ پوچھ سکا۔

☆☆☆

"توبہ اتنی رات کو کون آ گیا اور سب جیسے نشہ کر کے سوئے ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں اٹھ رہا۔"

حبیب بستر سے اٹھتے ہوئے منہ میں بڑبڑایا۔ اندھیرے میں اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا نیچے جھک کر سلیپر ٹٹولنے لگا۔ ناکام ہو کر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا تھا کہ پھر ڈور بیل بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے مڑ کر سلیپر پاؤں میں اڑسے اور تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے باہر جاتے جاتے خدیجہ بانو بھی اٹھ کر باہر آ گئی تھیں۔ بیل پھر بج اٹھی۔

"ارے بھائی! کون ہے اتنی رات گئے، کھول تو رہا ہوں۔" اس نے بیل بجانے والے کا نام پوچھے بغیر جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ایک لمحے کو وہ حیران ہی رہ گیا۔

"بھائی جان آپ؟" جیسے ہی مغیث آگے بڑھا۔ اس کے منہ سے یہی نکل سکا پھر اس نے آگے بڑھ کر بھائی کو گلے لگا لیا۔

"حبیب! کون آیا ہے؟" خدیجہ بانو نے برآمدے سے پکارا۔

"امی! دیکھیں کون آیا ہے، آپ حیران رہ جائیں گی۔" وہ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف گھسیٹتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔

"وہ کچھ سامان پڑا ہے باہر۔ وہ تو اٹھا لوں۔" مغیث نے اسے آگے بڑھنے سے روکا۔

"میں اٹھاتا ہوں۔ آپ اندر چلیں۔" حبیب سوٹ کیس اندر گھسیٹنے لگا تو مغیث ماں کی طرف بڑھا۔

"اسلام علیکم امی جان۔" خدیجہ بانو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کے سلام کا جواب بھی نہ دے سکیں، بس اسے دیکھے گئیں۔ پانچ ساڑھے پانچ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔

"مغیث میرا بچہ! آنے کی خبر تو کر دیتے۔" اسے کھینچ کر گلے لگاتے ہوئے انہوں نے خوشی سے کہا۔

"بس اچانک پروگرام بن گیا، اس لیے آ گیا۔" اس نے جواب دیا۔

"چلیں امی! باقی باتیں اندر چل کر ہوں گی۔" حبیب دونوں سوٹ کیس برآمدے تک لے

آیا تھا، سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔

پھر تھوڑی دیر میں سب لوگ اٹھ کر آ گئے موتا اور راحیل بھی اسے دیکھ کر حیران ہوئے۔

"موتا! بھائی کے لیے کھانا لے کر آؤ۔ دیکھتیں نہیں اسے بھوک لگی ہو گی۔" کچھ دیر بعد خدیجہ بانو کو خیال آیا تو موتا سے بولیں۔

"نہیں امی! کھانا تو میں نے پلین میں ہی کھا لیا تھا۔ اب تو بس سونا چاہتا ہوں، بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے صوفے سے سر ٹکا کر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"بھائی! کچھ دیر تو باتیں کریں۔ اتنی مدت کے بعد آپ کو دیکھا ہے۔" موتا کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں۔

"صبح۔ بچو! صبح باتیں کر لینا۔ اب بھائی کو آرام کرنے دو۔ میرا بچہ کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ جاؤ بیٹا! تم آرام کرو۔" انہوں نے محبت پاش نظروں سے مغیث کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ "شب بخیر" کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"کسی نے سمیطہ کا ذکر نہیں کیا۔" اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے سوچا۔ زیرو پاور بلب کی مدھم روشنی میں دعا عباد سے لپٹ کر سوئی ہوئی تھی۔

"دعا اتنی بڑی ہو گئی ہے۔" اس نے کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا اور دھیرے سے دعا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"دعا بیٹا! دیکھو کون آیا ہے۔" وہ شاید گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ ذرا سا کسمسا کر پھر سو گئی۔ مغیث نے بازو اس کے گلے میں ڈال دیا اور اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے اس کا ماتھا چوم لیا۔ عباد کے چہرے پر پیار کرنے کے بعد وہ ان دونوں کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لے کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ مدھم سی سرگوشیوں سے کھلی۔ وہ بستر پر تنہا لیٹا تھا دعا اور عباد اٹھ کر جا چکے تھے۔ اس نے سستی سے کروٹ بدلی تو وہ دونوں بیڈ کے دوسری طرف کھڑے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں انہیں دیکھتے ہی پوری طرح سے کھل گئیں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"دعا بیٹا! ادھر آؤ۔ دیکھو پاپا آ گئے ہیں۔" "تم نے خط لکھا تھا نا کہ میں کیوں نہیں آتا۔ دیکھو میں آ گیا ہوں۔"

اس نے دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ دعا کے چہرے پر شرمیلی سی مسکان تھی۔ وہ ذرا سا جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ مغیث نے اسے دوبارہ پکارا تو وہ عباد کی شکل دیکھنے لگی۔

''آؤ نا بیٹا! پاپا بلا رہے ہیں۔'' پیار بھری پکار پر وہ ذرا سی رکی اور پھر دوڑ کر مغیث کی بانہوں میں سما گئی۔

''عباد جانو! تم بھی آؤ نا۔'' اس نے پریشان کھڑے عباد کو دیکھا۔

''عمی! پاپا بلا رہے ہیں، یہ پاپا ہیں۔ آؤ نا۔'' دعا نے پلٹ کر اسے یقین دلانا چاہا جو حیرانی سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر مغیث کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آؤ نا۔'' دعا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر مغیث کے پاس لے جانا چاہا تو وہ زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے باہر بھاگ گیا ''یہ پاپا نہیں ہیں۔''

''پاپا! ابھی آ جائے گا۔'' دعا نے باپ کے ملول چہرے کو دیکھتے ہوئے تسلی دی۔

''ہاں، آ جائے گا۔ آپ ادھر آئیں۔'' اس نے پیار سے اسے پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

☆☆☆

''وہ کل تمہارے بھائی جان بتا رہے تھے کہ مغیث پاکستان آ گیا ہے دو دن ہو گئے ہیں۔ شاید اسے یہاں آئے۔'' یہ یاسمین بھابھی کی آواز تھی وہ ابو کے لیے چائے بنانے کچن کی طرف آئی تھی تو اس اطلاع نے اس کے قدم باہر ہی روک لیے۔

''اچھا مجھے تو نہیں پتا۔ شاید آ گئے ہوں۔'' عظمیٰ نے جواب دیا۔

''ہاں دیکھو ذرا حال، دو دن ہو گئے ہیں آئے ہوئے اور اس نے بھی بیوی کی خیر خبر نہیں لی۔ مجھے تو معاملہ اچھا خاصا گڑبڑ لگتا ہے۔'' اب کے یاسمین کی آواز کچھ مدھم تھی۔

''کیا مطلب؟'' یا تو عظمیٰ کی حیرانی مصنوعی تھی یا اس کا دھیان واقعی ادھر نہیں تھا۔

''بھئی، دیکھو نا، رات گئے اکیلے اٹھ کر چلے آنا پنکی کا۔'' اس نے زور دے کر اس کا نام لیا ''اور وہ بھی اتنے چھوٹے بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر اور پھر دیکھا تھا، کتنے دن اس نے گھر والوں سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ جس نے کچھ پوچھا، اسی کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اور پھر نوکری کرنے چل پڑی دیکھو ذرا۔ اتنے برسوں کا بسا بسایا گھر بار چھوڑ کر یہاں آ بیٹھی۔ کوئی تو بڑا ہی جھگڑا ہوا ہوگا اور خاوند کو دیکھو، دو تین دن سے آئے ہوئے ہیں اور مڑ کر خبر بھی نہیں لی۔'' باہر کھڑی سمیطہ کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔

''ہاں ایسا ہی کچھ لگتا ہے لیکن اس کی ساس بھی تو بہت فضول ہیں ذرا سی بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر ہو سکتا ہے انہوں نے کچھ غلط کہہ دیا ہو اور جب شوہر کی محبت کا سہارا بھی نہ ہو تو عورت کے صبر کا پیمانہ ذرا جلدی چھلک جاتا ہے۔'' عظمیٰ نے کہا۔

''خیر ایسا بھی کیا کہ انسان آدھی رات کو اٹھ کر تن تنہا چل پڑے ہمارے اپنے گھر میں سو طرح …باتیں ہوتی ہیں اگر ہم بھی ایسا کرنے لگتے تو کب کے ہاتھ پاؤں جھاڑ کر بیٹھے ہوتے۔ میکے اور …سرال میں بہت فرق ہوتا ہے انسان کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ یاد ہے، پچھلے سال مجھ سے کرسٹل کے دو …س ٹوٹنے پر امی نے کیا ہنگامہ کیا تھا حالانکہ گلاس بھی میرے جہیز کے تھے۔ امی نے عظیم کے کان بھر …یے کہ میں نے موڈ آف کیا ہوا ہے۔'' وہ پتا نہیں کون سی مثال ڈھونڈ لائی۔

''وہ بات اور تھی پھر عظیم بھائی نے امی کی ہر بات پر آپ کا دفاع کیا تھا۔ سمیطہ کی پوزیشن …وہ نازک ہے۔ عورت تو خاوند کے بھروسے پر اکڑتی ہے وہ بیچاری کس بھروسے پر ساس سے منہ ماری …ے۔ خدا جانے کیا معاملہ ہے۔'' عظمیٰ حتی الامکان گریز کر رہی تھی۔

''ظاہر ہے سیریس بات ہے۔ امی نہیں گئی تھیں اس دن اس کے سسرال؟ آتے ہی بیمار پڑ …یں۔ اندر کی بات کیا ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ اوپر سے ہمیں بیٹی بیٹی کہتے ہیں اور ہم ہی سے پردے …لے جاتے ہیں جب سگی اولاد کا معاملہ ہو تو وہ پرائی بیٹیوں کو کاہے کو راز دار بنانے لگیں۔'' یاسمین کا لہجہ …ہوا تھا۔

''ظاہر ہے، بیٹی کا معاملہ ہے، چاہ رہے ہوں گے کسی طرح اندر ہی اندر سلجھ جائے۔ ڈھنڈورا …سے فائدہ؟''

''ہونہہ، یہ بات سنیں گی۔'' وہ واپس ابو کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''مغیث دو دن سے آیا ہوا ہے مگر ہمیں کسی نے خبر نہیں کی اور خود اس نے بھی کوئی رابطہ کرنا …ب نہیں سمجھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ معاملہ کیسے سلجھے گا۔'' اقبال صاحب کی پریشان آواز …کر اسے دروازے پر ہی روک دیا۔

''آپ ہی مغیث سے جا کر مل لیں۔'' رابعہ نے کہا۔

''اس نے آنے کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا اور میں اٹھ کر ملنے چل پڑوں۔ بیگم! عزت …بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' اقبال صاحب تلخی سے بولے۔

''بس پھر عزت نفس کو ہی سینے سے چمٹائے بیٹھے رہیں۔ بیٹی کا چاہے گھر اجڑ جائے۔''

''تو کیا کروں، پاؤں پڑوں جا کر ان کے کہ آؤ خدا کے لیے میری بیٹی کو آ کر لے جاؤ۔ ان …کو اور گھوڑے پر چڑھ جاؤں۔'' اقبال صاحب اونچی آواز میں بولے۔

''کہا تھا میں نے نہ دیں ایسے لوگوں میں بیٹی۔ تھڑدلے اور کمینے لوگ۔ دھن کے لالچی۔ …پھول سی بچی کا کیا حال کر دیا۔ کتنے اچھے اچھے رشتے آ رہے تھے اس کے۔ آپ نے اس وقت بھی

میری بات نہیں مانی اور اب بھی اپنی ضد لگا رکھی ہے۔'' رابعہ رونے لگیں۔

''میں نے کیا جان بوجھ کر ایسا چاہا تھا۔ اتنا اچھا لڑکا تھا۔ چاہت والے لوگ تھے، سوچا تھا مال و دولت کی کیا بات ہے۔ محبت کرتے ہیں خوش رکھیں گے۔ مجھے کیا خبر تھی۔'' ان کے لہجے میں پچھتاوے بول رہے تھے۔

''اب وہی اچھا لڑکا ہے نا جس نے دو دن سے خبر نہیں لی۔ ظالموں نے بچے بھی چھین لیے۔ آدھی رہ گئی میری بچی۔ جب رشتہ لینا تھا، کیسی میٹھی زبان تھی اور اب کیسا روپ بدلا ہے، بہروپیوں نے۔'' وہ جلے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''اچھا بس۔ ابھی بہت بولنے کی ضرورت نہیں۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، دو چار دن انتظار کرتے ہیں، شاید مغیث آ جائے۔ اگر وہ نہیں آیا تو پھر بات کریں گے۔ بیٹی والے ضرور ہیں پر اب ایسے بھی کمزور نہیں کہ جو چاہے روند کر گزر جائے، تم حوصلہ رکھو۔ اول تو اس نے اس بات پر یقین ہی نہیں کرنا اور اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو ہم دیکھ لیں گے۔ ابھی تو سمیطہ سے فی الحال مغیث کے آنے کا ذکر نہ کرنا اس کا دل برا ہوگا۔'' انہوں نے بیوی کو سمجھایا۔ باہر کھڑی سمیطہ کا دل جیسے چکنا چور ہو چکا تھا یہ جان کر ہی کہ اسے آئے دو دن ہو چکے ہیں اور اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ بے جان جسم کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

خدیجہ بانو نے جو کچھ اسے بتایا۔ وہ اس کے دل و دماغ کی دنیا ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ ان کی الزام تراشیوں اور طعنوں کے جواب میں وہ کچھ پوچھ ہی نہ سکا بس ڈھیروں بوجھ دل پر لیے چپ چاپ کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ سمیطہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' امی کے ٹھوس لہجے اور یقین دہانی کے باوجود اس کا دل یہی کہے جا رہا تھا۔

سارا دن وہ ایسے ہی کمرے میں پڑا رہا۔ بچے اسکول سے آتے ہی اس کے پاس آئے پھر اس کی گم صم صورت دیکھ کر تھوڑی دیر بعد باہر نکل گئے۔ مونا دوبارہ کھانے کا پوچھنے آئی اس نے سونے کا بہانا کر کے کروٹ بدل لی۔

امی کی بات پر یقین کرتا ہوں تو سمیطہ گندگی کی دلدل میں جا گرتی ہے۔ سمیطہ کا دفاع کرتا ہوں تو امی جھوٹی پڑتی ہیں اور ان دونوں باتوں کی موجودگی میں میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سوچتے سوچتے اس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔

رات کے کھانے پر اس نے سب کے ساتھ بے دلی سے دو چار لقمے زہر مار کیے اور پھر اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کتنی دیر یونہی سڑکوں کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ جب چلتے چلتے تھک جاتا تو دو گھڑی کو بیٹھ جاتا پھر بے کلی سے اٹھ کر چلنے لگتا۔ ذہن کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

جب ساری سڑکیں سنسان ہو گئیں، اس کے پاؤں تھکن سے چور چور ہو گئے تو وہ گھر کی طرف پلٹ آیا۔

حسیب نے گیٹ کھولا تھا اور شاید اس نے اس سے اتنی دیر باہر رہنے کی وجہ بھی پوچھی تھی مگر وہ جواب دیے بغیر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر راحیل کے کمرے کی طرف اٹھی، بس کے کمرے کی روشنی جل رہی تھی، اس کے قدم غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھ گئے۔

وہ کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''آئیے بھائی جان! آپ کہاں چلے گئے تھے آپ کے دوست کا فون آیا تھا۔ اتنی دیر لگا دی آپ نے باہر۔'' وہ اسے کرسی پیش کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں واقعی میں نے باہر بہت دیر لگا دی۔'' اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

''آپ بیٹھیں نا۔'' راحیل نے اس کی ملول صورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چپ چاپ بیٹھ گیا تو راحیل بھی بیڈ کی سائیڈ پر ٹک گیا۔

''اور سنائیں، کتنے عرصے کی چھٹی لے کر آئے ہیں آپ۔'' راحیل نے لہجے کو کچھ بشاش بناتے ہوئے کہا۔

''راحیل! مجھے ایک بات سچ سچ بتاؤ گے۔'' مغیث نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا اس کی گہری نظروں سے راحیل کچھ گڑبڑا گیا۔

''کیا...... کیا بات ہے بھائی جان!'' اس کی آواز ذرا کی ذرا لرزی۔

''اس رات کیا ہوا تھا؟'' اس نے نظریں راحیل کے رنگ بدلتے چہرے پر جما دیں۔

''ک، کس رات بھائی جان!'' اس کی نظریں اس کے سوال کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

''جس رات سمیطہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔'' اس کی سرد نگاہیں راحیل کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

راحیل چپ رہا۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے اس گھر کے لیے کوئی قربانی دی ہے یا کوئی قابل ذکر خدمت سر انجام دی ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر آج تک میں نے تم لوگوں کے لیے کچھ کیا ہے خواہ وہ معمولی

محبت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا صلہ اگر کچھ بنتا ہے تمہاری نظر میں تو مجھے سچ سچ سب کچھ بتا دو۔" مغیث کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

راحیل نے تڑپ کر بھائی کی طرف دیکھا۔

"بھائی! اگر آپ یہ سب نہ بھی کہتے تو بھی مجھے آپ سے یہ بات کرنا تھی، آج یا کل۔ بس ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"بھابھی کا کوئی قصور نہیں۔" اس کے ایک فقرے سے جیسے غار کا پتھر ذرا سا سرک گیا تھا اندر جو جوار بھاٹا صبح سے اٹھ رہا تھا اس کا شور کچھ مدھم پڑ گیا تھا لیکن اسے تو سارا پتھر ہٹانا تھا۔ آدھی روشنی آدھے اندھیرے سے زیادہ خوفناک ہوتی ہے اسے مکمل اجالا چاہیے تھا غار سے نکلنے کا مکمل راستہ، کھلے میدان تک جانے کا۔

"نہ میں نے کبھی ان پر غلط نگاہ ڈالی نہ کبھی انہوں نے مجھے ایسی کوئی آس دلائی کہ جس کی۔" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا "پھر بھی ہمارے درمیان دوستی اور محبت کا عجیب رشتہ تھا، شروع ہی سے آپ کے سامنے کی بات ہے۔ وہ اپنا ہر مسئلہ مجھ سے بیان کر لیا کرتی تھیں اور میں بھی ان کا خیال رکھا کرتا تھا۔ بس یونہی اس میں میرے کسی ارادے کا دخل نہ تھا۔ ہماری بے تکلفی امی کو پسند نہیں تھی مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی کیونکہ ہم دونوں کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔

لیکن شاید مجھے نہیں پتا، یہ چور کب میرے من میں آ کر چھپا تھا۔ کب میری نظر نے یہ خباثت کی تھی لیکن کچھ تھا کہ کچھ دنوں سے میرے دل کا جھکاؤ ان کی طرف زیادہ ہو گیا تھا۔

دو دن سے عباد کو بہت تیز بخار تھا۔ دوسرے دن بھی جب بخار نہ ٹوٹا تو میں اسے دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ بھابھی میرے ساتھ گئیں ڈاکٹر نے نئی دوائیں تجویز کیں۔ ساری دوائیں قریبی میڈیکل اسٹور سے مل گئیں لیکن ایک سیرپ نہ مل سکا۔ میں نے عباد اور بھابھی کو گھر ڈراپ کیا اور خود سیرپ لینے چلا گیا۔ گھر سے کافی دور جا کر ایک اسٹور سے دوائی ملی۔ ابھی میں سیرپ لے کر نکلا ہی تھا کہ میرے دوست مجھے مل گئے اور فلم کے لیے اصرار کرنے لگے۔ پہلے تو میں نے انکار کیا پھر ہامی بھر لی۔ سیرپ کی شیشی میں نے کوٹ کی جیب میں ڈالی اور آخری شو دیکھنے ان کے ساتھ چلا گیا۔

رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب میں گھر آیا گیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی میرے پاس ہی ہوتی تھی۔ میں کھول کر اندر آ گیا میں نے کمرے میں آ کر کوٹ اتارا تو جیب میں پڑی سیرپ کی شیشی دیکھ کر مجھے عباد کا بخار یاد آیا۔ میں بڑا شرمندہ ہوا اور شیشی لے کر بھابھی کے کمرے کی طرف بڑھا۔

وہ سو رہی تھیں عباد بھی سویا ہوا تھا پہلے میں نے سوچا کہ شیشی رکھ کر واپس چلا جاتا ہوں لیکن

پھر سوچا کہ عباد کے بارے میں پوچھ لوں۔ میں نے انہیں آواز دی، انہوں نے نہیں سنی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھیں۔ ان کا دوپٹہ سرہانے کے دوسرے طرف پڑا تھا۔ انہوں نے بلیک کلر کا ہاف سلویز کا سوٹ پہنا ہوا تھا، ان کا بازو آنکھوں پر رکھا تھا۔ زیرو پاور بلب کی روشنی میں ان کا دودھیا بازو میں نے جیسے ہی ان کے کو ہاتھ لگایا، مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اور۔" اس نے ایک دم چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا "بھابھی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے مجھے پرے دھکا دیتے ہوئے زور سے تھپڑ میرے منہ پر مارا اور۔"

"بس۔" مغیث نے کرسی سے اٹھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے تھے اور غصے کی شدت سے جسم ہلکا ہلکا کپکپانے لگا تھا اس نے زور سے مکا کرسی کی پشت پر مارا۔

"میں، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے اپنے گھر میں۔ میرے خدا تم نے، یہ کیا کیا؟" اس کی آواز پھٹی ہوئی تھی۔

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ تھپڑوں سے تمہارا منہ لال کر دوں یا تمہارا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن نہیں۔ یہ تھپڑ مجھے اپنے منہ پر مارنے چاہیں جب کوئی انسان اپنی چیز کی خود حفاظت نہیں کر سکتا، اسے چور اچکوں کو مارنے پیٹنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے بھی اپنی سب سے قیمتی چیز کو بیچ چوراہے میں رکھ چھوڑا تھا کہ جو آئے میری عزت سے کھیل جائے۔ ہاں مجھے مار دو مجھے پیٹو۔ میں ہوں اس سزا کا حقدار۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ اس کی آواز سن کر مونا دوڑی آئی۔

"کیا ہوا بھائی جان! کیا ہوا؟" اس نے مغیث کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

راحیل دوسری طرف منہ پھیرے کھڑا تھا۔

"بھائی جان بھائی جان! پلیز خود کو سنبھالیں کیا ہوا ہے؟" مونا نے مغیث کا بازو سہلایا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ہوا۔ جب چوری بھی اپنے گھر کی ہو اور نقب لگانے والا بھی کوئی گھر والا ہو تو پھر ایسی ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ راحیل اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مغیث نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ اس کا جی چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔

"منیر ماموں اس رات آئے ہوئے تھے۔ وہ سدرہ کے لیے ہاں کر چکے تھے اور کچھ دنوں میں منگنی ہونے والی تھی جیسے ہی بھابھی کی چیخیں سنائی دیں۔ ہم سب اٹھ کر آ گئے۔ راحیل بھائی ایک طرف کھڑے تھے اور بھابھی چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ امی نے انہیں ڈانٹا تو انہوں نے ساری بات بتا تا ہی کہ منیر ماموں اٹھ کر آ گئے۔

امی نے انہیں دیکھتے ہی پانسہ پلٹ دیا۔ سارا الزام بھابھی پر لگا دیا کہ وہ راحیل بھائی کے ساتھ۔

اور راحیل بھائی نے بھی امی کی بات کی تردید نہ کی۔ بھابھی نے امی کی الزام تراشی پر قسمیں کھانی شروع کر دیں۔ امی نے انہیں تھپڑ مار کر چپ کرا دیا اور انہیں اتنے گھٹیا القاب دیے کہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔" مونا کی آواز بھرا گئی" راحیل بھائی کی چپ نے سارا کیس ان کے حق میں کر دیا اور بھابھی نے چادر اوڑھ کر بچوں کو ساتھ لیا اور جانے لگیں تو امی نے کھینچ کر دونوں بچوں کو ان سے علیحدہ کر دیا۔ بھابھی کا چہرہ خطرناک حد تک پیلا پڑ رہا تھا۔ ذلت اور خفت کے احساس سے ان کا بدن کانپ رہا تھا اور ہم سب تماشائی بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے بچوں کی بھی پرواہ نہ کی اور گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ میں نے انہیں روکنا چاہا تو امی نے مجھے ڈانٹ دیا۔

اتنی رات گئے ان کا اس طرح تنہا جانا میں نے حسیب بھائی کی منت کی تو وہ امی کی ڈانٹ کی پرواہ کیے بغیر بھابھی کے پیچھے بائیک لے کر چلے گئے اور پھر ہزار منتوں کے بعد انہیں ان کے گھر چھوڑ آئے پھر نہ انہوں نے کوئی رابطہ کیا اور نہ ادھر سے کوئی گیا۔

امی کو تو بس منیر ماموں کی ڈھیروں ڈھیر جائیداد سے غرض تھی اور شاید راحیل بھائی کو بھی، نوکری نہ ملنے میں ان کی اسی نیت کا دخل ہے۔ بھابھی کی خدمت، قربانی، محبت سب کچھ نظر انداز کر دیا گیا اور آپ، آپ نے کون سا ان کی بہت پرواہ کی تھی۔ آپ تو انہیں شاید گھر لا کر بھول گئے تھے۔ ہمیشہ گھر کی ضرورتوں کو ان پر ترجیح دی۔ بھائی جان انہوں نے قیامت کا صبر جھیلا ہے ورنہ امی کی باتیں سن کر کوئی زندہ رہنے کی تمنا نہ کرے گا۔

ذرا ایک لمحے کو ان کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھیں، آج تک ان کی بے لوث خدمت اور محبت کا کیا صلہ دیا گیا۔ ان کی کردار کشی کی گئی۔ جھوٹا الزام لگا کر انہیں گھر بدر کیا گیا اور اتنے مہینوں سے بچوں سے جدائی، آپ کی بے پروائی اور ان کے اپنے گھر والوں کی سوالیہ نظریں۔ آپ کہاں کہاں تلافی کا مرہم رکھیں گے۔ مجھے اپنے گھر والوں کے اس بے حس رویے پر بے حد دکھ ہوا ہے۔ امی یہ سب کچھ کرتے وقت یہ بھول گئیں کہ خدا نے انہیں دو بیٹیاں دے رکھی ہیں اور اس کی لاٹھی بے آواز ہے اگر امی کی بہتان تراشیوں کی زد میں کہیں ہم آ گئے تو سوچیں ان کا کیا حال ہو گا۔ یہ سب کچھ کرتے وقت وہ یہ کیوں بھول گئیں۔" مونا رونے لگی۔ "اور بھائی جان اپنی ایمان داری کو بھی ذرا تول لیں گا، کہاں آپ سے بھول ہوئی۔ آپ کی نیت ڈگمگائی، کہاں آپ نے اس مقدس رشتے میں بے ایمانی کا سوچا جس کے نتیجے میں راحیل بھائی نے بھابھی کو غلط نظر سے دیکھا۔ قدرت کا نظام ان ہی اصولوں پر کام کرتا ہے۔ مگر ہم لوگ

نہیں سمجھتے۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کر کے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا مال محفوظ ہے۔ ہم محفوظ ہیں مگر ایسا ہوتا نہیں۔ آپ سے تو کہیں ایسی بھول نہیں ہوئی سوچیے گا۔"

یہ مونا تھی اس کی چھوٹی بہن جو اسے آئینہ دکھا گئی تھی۔ عقل سالوں کے ترازو میں نہیں تولی جاتی۔ وہ اسے یہ بتا گئی تھی اور اس کا تو جیسے دماغ شل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے، آ جاؤ دروازہ کھلا ہے۔"

اس نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا تو جواب میں دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا اور کوئی بے آواز قدموں سے اندر آ گیا جب کچھ دیر تک کوئی نہ بولا تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک پل کو اسے لگا جیسے اس کی بصارتیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ مغیث احمد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرے پل اس نے مضطرب انداز میں نظریں کتاب کے صفحے پر جما دیں۔ مغیث کو پتا تھا، وہ اسے بیٹھنے کو نہیں کہے گی اس لیے خود ہی آگے بڑھ کر اس کے سامنے پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ وقت یوں ہی خاموشی سے گزر گیا۔ مغیث کو بات شروع کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے اور وہ اس کی نظروں کی حدت سے جیسے پگھلتی جا رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی ہم کلام تھی آخر سمیطہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کتاب بند کر کے ریک میں رکھنے لگی۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" کتنی دیر سے کمرے میں چھایا سحر ان لفظوں کی پھونک سے جیسے ٹوٹ گیا۔ اس نے ان سنی کر دی اور کتابوں کی ترتیب درست کرنے لگی۔

"سمیطہ! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" مغیث نے نرم لہجے میں اپنی بات دہرائی۔ اس کے ہاتھ ایک لمحے کو رکے اور پھر وہ مغیث کی طرف پلٹی۔

"جانے کا سوال بعد میں آتا ہے مغیث صاحب! پہلے آنے کی بات کریں کہ میں یہاں کیوں آئی؟" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس بات کو بھول جاؤ۔" مغیث نے نظریں چرا کر کہا۔

"بھول جاؤں؟" وہ زور سے بولی ذلت کے اس احساس کو بھول جاؤں۔ بھول جاؤں ان لمحوں کی اذیت کو جنہوں نے میرے پندار کو میرے کردار کو پاش پاش کر دیا تھا سب کے سامنے۔ آپ نہیں گزرے نا اس پل صراط سے جو ذلت کے گڑھے کے اوپر سے گزرتا ہے جس کی بدبو کے بھبکوں نے میرے اندر کو متعفن کر دیا ہے۔ بھول جاؤں میں سب۔" اس کا جسم لرزنے لگا۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں جانتے آپ۔" وہ ہاتھ اٹھا کر تیز لہجے میں بولی "کچھ بھی نہیں جانتے آپ اور آپ کو جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ نہ تھی نہ ہے۔ کیا رشتہ ہے آپ کا مجھ سے۔ کاغذ پر لکھے چند لفظوں کا بندھن اور بس، جسے آپ پانچ سالوں سے بھلائے بیٹھے ہیں اور میں نے۔ میں نے ان بے جان لفظوں کی کیا قیمت چکائی ہے۔ آپ کبھی نہیں جان سکیں گے۔" اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

"سمیطہ آئی ایم سوری۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری جو کچھ ہوا۔"

"سوری، سوری۔" وہ چیخی "سوری فار واٹ؟ مسٹر مغیث۔ آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس کا تنفس تیز تیز چلنے لگا۔ "کیا آپ کا یہ سوری میری پاک دامنی کا اعلان کر سکتا ہے۔ اس تاریک رات نے جو سیاہی میرے چہرے پر ملی ہے اسے دھو سکتا ہے۔ میرے آنسوؤں کا ازالہ کر سکتا ہے، میرے دکھ کا اندازہ کر سکتا ہے اور جتنی اذیت میں نے سہی ہے اس کو Compensate (تلافی) کر سکتا ہے۔ بتائیں مجھے۔" وہ رکی۔

"نہیں مغیث صاحب! مجھے آپ کی سوری کی ضرورت نہیں اور آپ کی بھی نہیں جہاں میں اتنے برس آپ کے بغیر گزار سکتی ہوں، باقی کی زندگی بھی گزار سکتی ہوں۔ چلے جائیں آپ یہاں سے۔" آنسو اسے کمزور کرنے لگے تھے۔ وہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے۔ سارا قصور میرا ہے۔ میری غفلت میری لاپروائی کا۔ میں نے ہی اپنی ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ تم اپنے گھر میں ہو اور میرے نام کی چادر تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گی لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ اپنی چیز کی حفاظت جیسے انسان خود کر سکتا ہے محض حوالے، رشتے اور بے جان لفظوں کے ناتے ان کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ کتنا نادان تھا میں، اپنا سرمایہ دوسروں کے ہاتھوں میں دے کر محفوظ سمجھ بیٹھا تھا۔

اس بات کی معافی میں تم سے ضرور مانگتا ہوں۔" وہ شاید خود سے باتیں کر رہا تھا۔

"معافی مجھے چاہیے مگر آپ سے اس مسئلے پر نہیں بلکہ ان لوگوں سے اتنے ہی لوگوں کی موجودگی میں جتنے اس رات تھے۔ جنہوں میں میری ذلت کا تماشا دیکھا تھا اور مجھ پر جھوٹا بہتان باندھا تھا۔ مغیث صاحب! اس رات کی وحشت کا تصور قبر تک میرے ساتھ جائے گا اس آسیب سے چھٹکارے کی ایک ہی صورت ہے آپ کی والدہ سب کے سامنے میری پاک دامنی کی قسم کھائیں ورنہ میں آپ کے ساتھ اس گھر میں کبھی نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا خود سے عہد ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"میں اب تمہیں اس گھر میں لے کر بھی نہیں جاؤں گا۔ میں نے پلاٹ بیچ کر ایک گھر لے لیا ہے اپنے لیے اور باقی کی رقم سے کوئی نہ کوئی کام کر لوں گا جتنی قربانی میں گھر والوں کے لیے دے چکا ہوں اور جتنا صلہ مجھے اس کے نتیجے میں مل چکا ہے۔ میرے لیے کافی ہے۔"

وہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا "میں انکل اور آنٹی سے بھی معذرت کر چکا ہوں اور اب تم سے بھی معافی مانگتا ہوں۔ بچوں کی خاطر میری اس پہلی اور آخری غلطی کو نظر انداز کر دو۔" اس نے کچھ منت آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ ان تین چار ماہ میں میں جن عذابوں سے گزر رہی ہوں اس کی تلافی یہ دو لفظ نہیں۔ مجھے گواہی چاہیے اپنی پاک دامنی کی پھر میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔" وہ منہ پھیر کر ٹھوس لہجے میں بولی۔

"تمہیں گواہی کس لیے چاہیے میرے لیے ناں۔ تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم آج بھی اسی طرح پاک ہو جس طرح پانچ برس پہلے میں تمہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تمہارا کردار آئینے کی طرح شفاف ہے۔ جس میں صرف میری کوتاہیوں کا عکس ہے اور کچھ نہیں۔"

سمیطہ کی آنکھوں سے آنسو پھسلنے لگے۔

"اور سمیطہ! مجھے کسی گواہی کی ضرورت نہیں۔ مجھے کل بھی تم پر یقین تھا آج بھی ہے۔ جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح۔ اب میں آ گیا ہوں۔ کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔ میں ہوں تمہاری گواہی، تمہارا مان، تمہاری ڈھال۔" وہ بے دم سی ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔

یہی الفاظ اگر چار ماہ پہلے اسے سننے کو مل جاتے تو؟

"اس سارے قصے میں نقصان کس کا ہوا ہے تمہارا، میرا، ہمارے بچوں کا اور کسی کا تو کچھ نہیں بگڑا اور کتنے بدنصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اپنے ساتھ ہونے والے خسارے کا احساس نہیں ہوتا۔ میں قسم نہیں کھاتا اور نہ کوئی وعدہ کرتا ہوں کیونکہ ہم لوگ تو ان وعدوں کو بھی بڑی آسانی سے توڑ دیتے ہیں۔ جو خدا اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر کرتے ہیں۔"

اس کی نظروں میں رابیل کا عکس لہرایا۔

"لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ زندگی میں کسی موڑ پر تمہیں تنہائی کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہونے دوں گا۔ آئی پرامس یو۔" وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"مگر میں اس طرح نہیں جاؤں گی۔ انہیں مجھ سے معافی مانگنا ہی ہو گی۔" وہ اپنا ہاتھ

چھڑاتے ہوئے بولی۔

''تمہارا کیا خیال ہے وہ مان جائیں گی کبھی نہیں۔'' اس نے پھر اس کے ہاتھ پکڑ لیے ''سمیطہ! معاف کر دینا افضل ترین ہے۔ امی کبھی نہیں جھکیں گی۔ میں انہیں جانتا ہوں اور سوچو۔ اگر وہ جھک کر تم سے معافی مانگ بھی لیں تو کیا تمہیں اچھا لگے گا۔ کل اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہو، کیا تم چاہو گی کہ عباد کے سامنے تم اس کی بیوی سے معافی مانگو، خواہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہو اور۔''

''آپ مجھے ایموشنلی بلیک میل نہیں کر سکتے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''یہ بلیک میلنگ نہیں ہے صرف ایک خیال ہے جو میں نے تمہارے سامنے رکھا ہے۔ راحیل امریکہ جا رہا ہے۔ حسیب کو کراچی میں جاب مل گئی ہے۔ مونا کی شادی کے فوراً بعد وہ کراچی سیٹل ہو جائے گا اور امی اس کے ساتھ جائیں گی۔ امی مجھ سے شرمندہ ہیں مگر وہ اس شرمندگی کو الفاظ نہیں دے سکتیں اور شاید میں بھی ایسا نہ چاہوں۔ ان کے لیے ضمیر کی چبھن ہی کافی ہے، اسی لیے انہوں نے حسیب کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا ہے پھر ہمارا سب کے ساتھ کتنا تعلق رہ جائے گا۔

پھر بھی اگر تم چاہتی ہو کہ امی اگر معافی مانگیں تو میں انہیں لانے کی کوشش کروں گا اور اگر وہ نہ مانیں تو ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم دونوں کا سفر اور کٹھن اور طویل ہو جائے گا اور بچے۔ ان کا سوچا ہے تم نے۔ ان دوریوں نے ہمیں یوں بے حال کر دیا ہے۔ وہ تو بہت معصوم ہیں۔ ان کی حالت کے بارے میں سوچو۔'' وہ چپ کر گئی۔

''یہاں انکل آنٹی کے سوا سب کو پتا ہے کہ تمہارا امی سے جھگڑا ہو گیا تھا اور بس۔ امی کو معاف کر دینا تمہاری بڑائی ہو گی۔ راحیل مجھ سے معافی مانگ چکا ہے اور تم سے بھی معافی مانگنے کو تیار ہے۔ وہ کمزور لمحے کی گرفت میں آ گیا تھا اور تم بھی اگر اسے معاف کر سکو تو سب کچھ بھول جاؤ۔ اسے میری درخواست سمجھو۔''

''آپ اتنے دنوں سے آئے ہوئے ہیں اور آج ساری گواہیاں سن کر ادھر آئے ہیں۔'' شکوہ اس کی زبان سے پھسل گیا۔

''دوسرے ہی دن مجھ پر سارا معاملہ کھل گیا تھا۔ اتنے دن بھاگ دوڑ میں گزرے پلاٹ کی فروخت، نئے گھر کی خرید، سامان کی شفٹنگ۔ مونا کی شادی پندرہ دن بعد ہے اور اقبال انکل سے تو میں چوتھے روز ہی مل گیا تھا اور ان سے معافی بھی مانگ گیا تھا اور جلدی نہ آنے کی وجہ گواہیوں کا حصول نہیں بلکہ شرمندگی اور احساس ندامت تھا۔ خود میں حوصلہ نہیں پا رہا تھا تمہارا سامنا کرنے کا۔''

سچ اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ اس نے ایک نظر دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

''چلیں اب؟'' مغیث اسے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں۔ میں ادھر نہیں جاؤں گی۔'' اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

''میں ادھر کی بات نہیں کر رہا۔ ہم اپنے گھر جائیں گے جو صرف تمہارا ہو گا اور ہمارے بچوں کا۔ میں تمہاری گواہی ہوں تمہارا سچ۔ تمہاری ڈھال۔''

لفظ اس کے کانوں میں رس گھولنے لگے تو مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

اور تاخیر کرنے میں نقصان کسی کا نہیں تھا۔ بس آنے والی خوب صورت ساعتوں سے کچھ لمحے کم ہو جانے تھے اور اب یہ نقصان اسے کسی صورت بھی گوارا نہیں تھے۔ اسی لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔

مغیث نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور کرسی کی پشت پر سر رکھ کر ایک مدت بعد جیسے سکھ بھرا سانس لیا۔

☆☆☆

دیپ جلتے رہیں گے

آج کا دن ہی بڑا منحوس تھا۔

وہ تیسری بار چکر کاٹ کر یونیورسٹی روڈ کی طرف آئی تھی۔ آگے ٹریفک ''عارضی طور پر بند ہے'' کا بڑا سا بورڈ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

''اف خدایا۔'' اس نے زور سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا ''اب کدھر سے جاؤں۔ یہ ہمارے حکمران، ہمارے دی آئی پیز، اللہ انہیں ہدایت دے ان کا یہ پروٹوکول ہم جیسے غریب عوام کے صبر کا امتحان کس طرح لیتا ہے کاش انہیں احساس ہوتا۔'' اس نے بے بسی سے کھڑکی سے سر نکال کر آگے یونیورسٹی کو جاتی صاف، پرسکون سیاہ تارکول کی سڑک کو دیکھا جس پر تھوڑی دیر بعد کسی وزیراعظم کی شاہی سواری گزرنی تھی، جس کے استقبال کے لئے سڑک ہر طرح کی ٹریفک کے لئے گھنٹہ بھر پہلے ہی سے بند کر دی گئی تھی، اس کی طرح اور گاڑیاں، موٹر سائیکلیں اور پبلک کنوینس ادھر ادھر چکراتی پھر رہی تھی اس نے بڑی مشکل سے گاڑیوں کے بے ہنگم رش سے گاڑی ریورس کر کے باہر نکالی۔

''اب کدھر جاؤں۔'' مین روڈ سے اس نے گاڑی ایک ذیلی روڈ کی طرف موڑی۔

''عجیب مشکل ہے، یہ اسائنمنٹ بھی آج ہی سب مٹ کروانی ہے۔ مجھے بھی ہر کام عین وقت پر یاد آتا ہے جب سر پر گزرتے وقت کی انتہا کی تلوار جھول رہی ہوتی ہے۔ یہی کام دو تین دن پہلے بھی ہو سکتا تھا۔ اسائنمنٹ سب مٹ کروانی ہے، پروفیسر علوی سے شیلے کے دو تین پوائنٹس ڈسکس کرنے ہیں۔ لیبارٹری سے امی کی رپورٹس لینی ہیں، پھر گھر جا کر امی کو ڈاکٹر خان کے کلینک لے کر جانا ہے۔ بارہ بجنے کو ہیں اور ڈاکٹر صاحب دو بجے تک آجاتے ہیں۔ دو گھنٹوں میں یہ تینوں کام میلوں کے فاصلے، ٹریفک کے رش اور یہ رکاوٹیں......'' اس کی خود کلامی لبوں میں ہی دم توڑ گئی جب گاڑی چرر چر کی چنگھاڑ اور پھر نیم جان آواز نکال کر بالکل ساکت ہو گئی۔

''اس کی کسر رہ گئی تھی۔'' اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی کے انجن سے ہلکی سی چوں کی آواز نکلی مگر اس میں حرکت نہ پیدا ہوئی۔

''یا اللہ! اب کیا کروں؟'' تین چار بار اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر گاڑی کو بھی لگتا تھا، آج بہت دنوں بعد اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا شوق چرایا تھا۔ وہ جھلا کر گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ نیم کچی نیم پکی یہ ذیلی روڈ کدھر جا رہی تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس طرف پہلی بار آئی تھی اس نے گردن گھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سڑک کے دونوں اطراف کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں، مارکیٹ یا ورکشاپ جیسی کسی شے کے دور دور تک آثار نہیں تھے۔ سڑک پر ٹریفک بھی بالکل نہیں تھی۔

''لگتا ہے یہ روڈ آگے جا کر بند ہو جاتی ہے جو ادھر بالکل ٹریفک نہیں ہے۔'' اس نے خود ہی اندازہ لگایا۔ اگست کا آخری ہفتہ ہونے کے باوجود دھوپ اچھی خاصی چبھ رہی تھی۔ ہوا بھی ندارد تھی۔ اگر چل بھی رہی ہوتی تو اس کا اس وقت ہوا کو انجوائے کرنا کا ہرگز موڈ نہیں تھا۔ اس نے ہمت کر کے گاڑی کا بونٹ اٹھا کر انجن اور بے شمار کل پرزوں اور تاروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔

''اب خدا جانے کس پرزے کے پیٹ میں درد اٹھا ہے جس کا درماں میرے پاس تو ہے نہیں۔ کتنی بار عامر بھائی نے کہا تھا، ڈرائیورنگ سیکھ لی ہے تو اس کی بنیادی خرابیاں دور کرنا بھی سیکھ لو مگر اس نے کبھی اس مشورے پر کان نہیں دھرا تھا، اور ایسا حادثہ آج تک ہوا بھی نہیں تھا۔ گاڑی خراب ہوتی بھی تو یا تو کوئی ساتھ ہوتا تھا یا کسی بارونق سڑک پر، جہاں ورکشاپ کہیں آس پاس ہوتی تھی اور آج ہی یہ ایڈونچر......''

زوں کی آواز کے ساتھ گرے کرولا اس کے پاس سے گزری تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ گرد کے طوفان میں جاتی اس گاڑی کا ڈرائیور اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ سارہ کو اس کی مسکراہٹ ایک دم زہر لگی تھی۔ وہ گردن جھٹک کر دوبارہ انجن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''سارے سوٹ کا ستیاناس ہو گیا ہے، گرد مٹی پسینہ توبہ'' اس نے آہستہ آہستہ بیٹھتی دھول کو دیکھ کر اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ بلیک کاٹن کے سوٹ پر دھول چمک رہی تھی۔

''یا اللہ کیا کروں۔'' کوئی خرابی سمجھ میں نہ آئی تو اس نے اکتا کر بونٹ گرا دیا۔

''لفٹ لینے کا یا کسی اور کنوینس سے جانے کا مطلب ہے گاڑی کو یہاں اس اجنبی علاقے میں لاک کر جاؤں۔ کوئی انیس سو اٹھارہ کا ماڈل سمجھ کر اس کے وہیل، لائٹس اتار کر لے گیا تو......'' اس نے دل میں سوچا۔ گاڑی کی حالت واقعی ایسی تھی کوئی بھی ضرورت مند یا شوقیہ چور اس کام کو کرنے میں شرم محسوس نہ کرتا۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

''ساڑھے بارہ ہوگئے۔ طلحہ کا موبائل ہی لے آتی تو اسے کال کر کے بلا لیتی۔''

''موبائل میرے پاس ہوتا تو اسے کال کیسے کرتی؟ لگتا ہے۔ میرا دماغ چل گیا ہے۔'' اس نے خود کو ملامت کرتے ہوئے دائیں بائیں گردن گھمائی، کہیں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسی پل پھر مین روڈ کی طرف سے گرد کا طوفان اٹھتا دکھائی دیا۔ وہ ہاتھ سے گرد ہٹاتے ہوئے گاڑی کے اینڈ میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ گرد کا طوفان اس کے پاس آ کر رک گیا تھا۔ گرے کرولا کا ڈرائیور زرافے کی طرح لمبی گردن نکال کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہیلو! میرا تو خیال ہے، موسم اس قدر دلفریب نہیں جو یوں کھڑے ہو کر اسے انجوائے کیا جائے۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔

''آپ سے مطلب۔ جائیں اپنا راستہ ناپیں جا کر۔''

''میں تو اپنے رستے ہی جا رہا تھا، دوبارہ کالی بلی نے راستہ کاٹا ہے۔ مجبوراً رکنا پڑا۔'' اس نے سارہ کے بلیک سوٹ پر چوٹ کی۔

''شٹ اپ۔'' کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''آپ کی مرضی۔ میں تو آپ کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔''

کہہ کر اس نے اپنی گردن دوبارہ گاڑی کے اندر کی اور زوں کر کے گاڑی ادھر سے لے گیا۔

''کبھی کبھی انسان کو اپنے بے جا غصے کا مزہ چکھنا ہی پڑتا ہے۔ کیا تھا بھلا اس کی مدد لے لیتی۔ آخر کو مجبوری بھی تو مجھے ہی ہے۔ ہر وقت غصہ، تنتنا۔ اب کھڑی یہاں بھٹکتی رہوں۔'' اندر سے کسی نے بری طرح سے لتاڑا تھا۔

اب تو اچھی خاصی گرمی ستانے لگی تھی۔ سورج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا جیسے اسے آج اپنی کارکردگی پر کوئی میڈل لینا ہو۔ اسے کھڑے کھڑے شاید دس منٹ گزر گئے تھے جب پھر وہی گرے کرولا بائیں طرف سے آتی دکھائی دی اس نے گردن موڑ لی۔

''محترمہ! یہ مت سمجھئے گا کہ آپ کا دیدار کے شوق میں یوں بار بار میں اس جگہ کا طواف کر رہا ہوں۔ کبھی سنا تھا آج سچ ہوتے دیکھ لیا بلیک کلر کی برکات۔ آفس جا رہا تھا پیپرز بھول گیا تھا، وہی لینے دوبارہ گھر گیا تھا مگر آپ کو تو لگتا ہے، یہ جگہ اس قدر پسند آ گئی ہے کہ آپ نے اپنی بقیہ زندگی یہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی ہیں۔'' وہ پھر سے اس کے قریب آ کر اسی بے تکلفی سے بولا تھا۔

''اگر میں اس جگہ کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی ہوں تو آپ کو اس کا ٹیکس ہرگز ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

ئیں ادھر سے۔'' وہ اسی بے رخی سے بولی۔

اصل میں تو ہر انسان اپنے مزاج کے ہاتھوں بے بس ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جو ضمیر نے سے لتاڑا تھا کہ اپنے مطلب کے لیے تھوڑی سی خوش اخلاقی برت لینے سے کوئی شان میں فرق نہیں جائے گا۔ اس جھاڑ کا سارہ کے مزاج پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''او کے بہت مال دار ہیں آپ جو اس ٹوٹی پھوٹی سڑک کا بھی ٹیکس بلا چوں چراں ادا کرنے و تیار ہیں وہ بھی خوشی خوشی، اینی وے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''میں آپ سے آخری بار پوچھ رہا ں کیونکہ اس کے بعد مجھے آفس چلے جانا ہے۔ کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟ دوپہر ایک بجے کے د یہ سڑک بالکل سنسان ہوتی ہے۔ چھوٹی موٹی ڈکیتی کے لیے آئیڈیل سائٹ۔ آگے آپ کی رضی۔''

وہ اسے خوب ڈرا کر اب گاڑی بھگا لے جانے کے چکر میں تھا۔ اس کی آخری بات نے سارہ و واقعی دہلا دیا، بات تو بالکل صحیح تھی، دوپہر ایک بجے کیا بارہ بجے بھی یہاں بڑے آرام سے کوئی آ کر سے لوٹ سکتا تھا ابھی تک اس نے یہاں کوئی جان دار تو دیکھا نہیں تھا۔

''سنیں مسٹر سنیں۔'' گرے کرولا دو ہی قدم آگے گئی تھی جب وہ چلائی گاڑی ست ہوتے تے رک گئی۔

''جی فرمایئے۔'' اس نے اپنی لمبی گردن سارہ کی طرف موڑ دی۔

''پلیز ذرا میرا گاڑی تو دیکھیں......''

''دیکھ چکا۔ متر بہتر کا ماڈل ہے۔ حیرت ہے آپ سلامت اسے سڑکوں پر دوڑاتے پھر رہی ں میوزیم والوں نے آپ کو کوئی آفر نہیں کی۔'' وہ شرارتی لہجے میں بولا تو سارہ کو آگ لگ گئی۔

''میوزیم میں رکھنے کے قابل تو آپ کی......'' وہ گردن، کہتے کہتے رک گئی۔ وہ جانتا تو اس یرانے میں پھر کس نے اس کی مدد کرنے آنا تھا اور اس کی گاڑی واقعی میوزیم میں رکھنے کے قابل تھی، ں میں مائنڈ کرنے والی بھی کوئی بات نہیں تھی۔

''جی میری...... کیا میری......؟'' وہ ہمہ تن گوش تھا۔

''کچھ نہیں ذرا دیکھیں۔''

''جی...... دیکھ رہا ہوں۔'' وہ مشتاق نظروں سے واقعی اسے اور اس کی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔

ارہ کو غصہ آ گیا۔

''جائیں آپ ادھر سے۔ مجھے آپ سے مدد نہیں لینی۔'' یہ کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف

پھیر لیا۔

''محترمہ! جتنا نخرا آپ کی گاڑی میں ہے، اس سے دوگنا آپ کے مزاج میں ہے۔''

وہ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ ''لائیں چابی دیں مجھے۔'' سارہ نے ذرا سے توقف کے بعد چابی اسے تھمادی۔

پندرہ بیس منٹ تک وہ انجن اور کل پرزوں کو دیکھتا رہا اسٹیرنگ کے نیچے لگی تاروں سے بھی چھیڑ چھاڑ کی۔ آخر اکیسویں منٹ گاڑی واقعی اسٹارٹ ہوگئی۔ سارہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

''لیجیے محترمہ! آآپ کی گاڑی اسٹارٹ ہوگئی اور مجھے اچھی خاصی دیر ہوگئی ہے آفس سے۔ بائے۔'' چابی اگنیشن میں ہی لگی تھی جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ سارہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ ریورس کرتے ہوئے اس ویران سڑک سے باہر نکل آئی۔ آگے سڑک کھل چکی تھی، دور جاتے ہوٹر کی آوازیں بتارہی تھیں کہ وزیر مملکت کی سواری باد بہاری ادھر سے گزر چکی تھی۔

یونیورسٹی پہنچ کر اس نے ہینڈ بریک کی طرف ہاتھ بڑھایا جب اس کی نظر نیچے گرے موبائل پر پڑی۔

''اوہ! یہ اس شخص کا رہ گیا ہے۔ میں نے تو اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھا اور گاڑی لاک کرکے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئی۔

اور جب لیبارٹری سے امی کی رپورٹس لے کر گھر پہنچی تو دو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ امی کی رپورٹس بہت خراب آئی تھیں۔ بلڈ یوریا کا لیول آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ راستہ بھر سوچ سوچ کر اسے پریشانی ہوتی رہی اور گھر میں اس کے لیے ایک نیا ہنگامہ تیار کھڑا تھا۔

☆☆☆

ناصر بھائی اور عامر بھائی کی گاڑیاں باہر کھڑی دیکھ کر ہی اس کا ماتھا ٹھنک گیا تھا اور اندر...... اندر لاؤنج میں صوفہ کم بیڈ پر امی نیم بے ہوش پڑی تھیں۔

''لیجیے آگئیں۔ امی جان کی خدمت گزار خاص۔'' سیما بھابھی اس کو دیکھتے ہی اونچی آواز میں بولیں۔

''ابھی بھی ضرور آنا تھا۔ تھوڑی اور دیر سے آجاتیں تو اس مفت کی خدمت سے جان چھوٹنے کا سندیسہ مل جاتا۔'' عامر بھائی بھی بڑبڑائے تھے مگر سب نے بخوبی سن لیا تھا۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ چکا تھا۔ وہ شرمندہ سی انہیں قدموں پر کھڑی تھی جن سے اندر داخل ہوئی تھی۔

''کہاں سے آرہی ہو فضول کی آوارہ گردی کرکے؟ کچھ خیال ہے تمہیں اپنی بیمار بوڑھی ماں

[...]۔'' انہوں نے انگلی سے نیم بے ہوش امی جان کی طرف اشارہ کیا ''اس حالت میں تم انہیں چھوڑ چھاڑ [ک]ر سیر سپاٹے کو نکل گئیں کہاں گئی تھیں تم؟'' ناصر بھیا سرخ چہرہ لیے اس سے جواب طلب کر رہے تھے [او]ر اس کے خشک حلق میں کانٹے اگ آئے تھے اس نے تھوک نگلا نوکیلے کانٹوں نے چر سے حلق کو چیرا۔ [آ]نکھوں میں نمی اتر آئی۔

''یہ کیا جواب دیں گی۔ کوئی جواب ہو تو دیں نا۔'' غزل بھابھی کیوں پیچھے رہتیں۔ اسے [ش]رمندہ دیکھ کر انہیں اکثر ہی یوں لطف آیا کرتا تھا اگر جو ٹیپو اوپر نہ جاتا چھوٹے سے بچے کو دادی سے اس [ق]در پیار ہے ہر دو گھڑی بعد دادو سے ملنے بھاگا جاتا ہے۔ وہ اوپر گیا تو امی جان بے چاری بے ہوش پڑی [تھ]یں۔ اس نے آکر شور مچاتے ہوئے مجھے بتایا۔ میرا تو پہلے ہی دل کمزور ہے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ [سی]ما بھابھی کو نیچے آوازیں لگائیں۔ یہ بے چاری اپنی ہنڈیا چولہے پر چھوڑ کر اوپر بھاگیں اور امی جان [...]بے ہوش۔ اب ہم دونوں بے چاریاں کیسے انہیں سنبھالتیں۔ کون سی دوا دینی ہے کہ ان کی حالت کچھ [س]نبھل جاتی، ہمیں تو کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ کبھی سارہ نے ہمیں امی جان کی خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان [ک]ے قریب ہی نہیں ہونے دیا۔ ہائے کس قدر دل تڑپتا ہے کہ ہم بھی دل و جان سے امی جان کی کچھ [خد]مت کریں مگر نا معلوم اس نے کیوں ایسی باتیں امی جان کے دل میں ڈال رکھی ہیں ہمارے خلاف کہ [ج]ب بھی اوپر جاؤ امی جان آرام کے لیے سوجاتی ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہی کہیں اسے۔'' غزل بھابھی نے [حت]ی الامکان درد دل کا سارا مواد اپنی داستان میں شامل کیا، سب کو ہی غصہ آگیا کہ یہ واقعی سارہ ہے جو [بھائ]یوں بہوؤں کو امی جان کے قریب نہیں ہونے دیتی۔

''اس بحث کا اب کیا موقع ہے بھلا۔'' دادی کے ہاتھ پاؤں سہلاتا طلحہ تپ کر بولا۔

''تا کہ اسے احساس ہو۔'' ناصر بھیا اسی غصیلے لہجے میں بولے ''میں اپنی فارنر ڈیل ادھوری [چھ]وڑ کر آرہا ہوں پورے ستر لاکھ کی ڈیل ہے، گھر سے فون مسلسل آرہے تھے۔ امی جان کی طبیعت [خر]اب ہے۔ امی جان بے ہوش ہیں، امی جان کی حالت بگڑ رہی ہے۔ امی جان کو نیچے کیسے لے کر [آئ]یں۔ فون کالز سن سن کر میرا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔ کس طرح میں اپنے کسٹمرز سے معذرت کرکے آیا [ہو]ں میں ہی جانتا ہوں۔''

''اور میں......'' عامر بھیا کیوں پیچھے رہتے۔ ''پروونشل لیول کی میٹنگ تھی آج، سیکرٹری [...]س، ممبر فنانس اور فیڈرل سے چیف فنانس اتنے بڑے بڑے آفیسرز کے ساتھ میٹنگ تھی اور میرے [مو]بائل کی بپ مسلسل بجے جارہی تھی۔ پوری میٹنگ میری ان کالز سے بار بار ڈسٹرب ہورہی تھی۔ بالآخر [...]ڈی صاحب نے مجھے گھور کر موبائل آف کرنے کو کہا، مگر امی جان کی طبیعت کا سن کر مجھے قرار بھی نہیں

آرہا تھا۔ دوسری طرف میری جاب داؤ پر لگی جا رہی تھی وہ تو خدا کا شکر ہے، عین اسی وقت لنچ آورز درمیان میں آ گئے اور میٹنگ ایک گھنٹے کے لیے آف ہوئی تو میں گھر کی طرف بھاگا اور یہ سب کچھ...... سب کچھ سارہ تمہاری غیر ذمہ دارانہ حرکت کی وجہ سے ہوا ہے جب تمہیں معلوم ہے کہ آج امی کا اپائنٹمنٹ ہے تو تم امی کو یوں چھوڑ کر کہاں گئیں۔" عامر بھیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارہ کی گردن مروڑ ڈالیں۔

"اور ڈاکٹر خان تو اٹھ چکے ہوں گے۔ اب کیا کریں گے آپ لوگ۔ امی جان کا تو چیک اپ بہت ضروری ہے۔ انہیں تو کچھ ہوش نہیں۔" سیما بھابھی جلدی سے بولیں۔

"نہیں میں نے رستے میں فون کر کے ان سے آدھ گھنٹے اور ٹھہرنے کی ریکویسٹ کی تھی۔ بڑی مشکل سے مانے تھے۔" ناصر بھیا جلدی سے بولے۔

"ہاں تو امی جان کو ان ہی کا ٹریٹمنٹ سوٹ کرتا ہے اور کسی ڈاکٹر کی دوائی موافق آتی ہے، نہ علاج۔" غزل بھابھی نے اس پر رائے دینا مناسب سمجھی۔

"اچھا میں تو اب جا رہا ہوں۔ پانچ منٹ کی اور تاخیر ہوئی تو لاکھوں کی ڈیل ہاتھوں سے نکل جائے گی، اب تم جلدی سے امی جان کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ اور یہ اپنی فضول کی بھاگ دوڑ جو تم گاڑی لے کر ادھر ادھر کرتی رہتی ہو اس کو کچھ دنوں کے لیے ترک کر کے امی جان کی صحت کی طرف دھیان دو۔ اب ہم گھر بیٹھ کر امی جان کا دھیان رکھیں، یا چار پیسے کمائیں۔ تمہیں کم از کم اتنا خیال تو ہونا چاہیے۔" ناصر بھائی نے ایک بار پھر اس کی گوشمالی کی۔

"میں بھی اب چلتا ہوں۔ لنچ آور ختم ہونے کو ہے۔ آفس میں سو بہانے کر کے نکلا ہوں۔ آج کل نوکری ڈھونڈنا عذاب ہے تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینا اس سے بڑا عذاب، ہر وقت جان سولی پر ٹنگی رہتی ہے کہیں کوئی افسر ناخوش نہ ہو جائے اے سی آر نہ خراب ہو جائے، مگر تمہیں ان باریکیوں کی کیا پروا۔" عامر بھائی براہ راست سارہ سے مخاطب تھے۔ "پیسہ کمانا کس قدر مشکل ہے۔ جب ہم امی جان کے علاج، دوا اور ڈاکٹر کے معاملے میں ایک دھیلے کی کنجوسی نہیں کرتے۔ ان کے علاج پر پانی کی طرح پیسہ بہا دیتے ہیں تو کم از کم ان کی دیکھ بھال جیسا معمولی فریضہ بھی تم ذمہ داری سے انجام نہیں دے سکتیں، کچھ ہو جائے تو بدنامی تو ہماری ہوگی کہ بیٹوں نے علاج کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اب جلدی سے امی جان کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ معلوم نہیں ان کا شوگر لیول لو ہو گیا ہے کہ ہائی۔ صبح انسولین بھی لگائی تھی کہ نہیں۔ امی جان کی آنکھیں نہیں کھل رہیں، غنودگی سی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اچھی طرح چیک کروانا۔ چلتا ہوں میں۔" کہہ کر عامر بھیا مڑے اور اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئے۔ ناصر بھیا پہلے ہی باہر جا چکے تھے۔

"افوہ۔ میری کوکنگ درمیان ہی میں رہ گئی۔ ہنی آنے والی ہے، اس سے تو بھوک ذرا داشت نہیں ہوتی۔ یہ طلحہ بھی جب سے آیا ہے، دادی کے گھٹنے سے لگا بیٹھا ہے۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کر کے گیا تھا، امی جان کی حالت نے تو دماغ ہی ماؤف کر دیا دیکھوں جا کر کچن میں۔" سیما بھابھی اپنے ؤف شدہ، دماغ کو ہاتھ مارتی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

"ٹیپو صبح سے گندا سندا پھر رہا ہے اسے نہلانا تھا کہ امی جان کی افتاد پڑ گئی، حرا بھی کب سے رو ہی ہے۔ اس کو دیکھوں جا کر۔" غزل بھابھی کو اپنے بچوں کی "صفائی ستھرائی" کا خیال ستایا تو سیڑھیوں ی طرف بھاگ گئیں۔

"چلیں پھپھو! دادو کو ڈاکٹر پاس لے کر چلتے ہیں۔"

طلحہ اسے چپ چاپ کھڑے دیکھ کر بولا تو اس کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔

"طلحہ! تم امی جان کو گاڑی تک لے جاؤ گے نا۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

"ہاں لے جاؤں گا۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟" وہ امی جان کو سہارا دیتے ہوئے بولا۔

"میں امی کی فائل لے آؤں۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔

اگر انہیں دو منٹ کی اور تاخیر ہو جاتی تو ڈاکٹر خان اٹھ جاتے۔ اس کے یوں دیر سے آنے پر ہوں نے بھی سارہ کی طبیعت صاف کی۔

"سارہ بی بی! کم از کم آپ کو تو اپنی مدر کا خیال کرنا چاہیے۔ رپورٹس تو آپ لے کر آئیں یارٹری سے۔ وہیں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا ان کی کنڈیشن کس قدر میرلیس ہے۔ بلڈ یوریا کا لیول س قدر ہائی جا رہا ہے دیکھیں کس قدر سویلنگ (سوجن) ہو رہی ہے۔" چیک اپ کے دوران بھی ڈاکٹر سلسل اس کی کلاس لیتے رہے۔

"میں یہ میڈیسن اور انجکشن لکھ رہا ہوں۔ دو گھنٹے انہیں کلینک پر ہی رکھنا۔ میرے اسٹنٹ یں چیک کرتے رہیں گے۔ دو گھنٹے تک ان کی حالت بہتر ہو جائے گی تو پھر آپ انہیں گھر لے جا سکتی ں۔" ڈاکٹر کا قلم تیزی سے پیڈ پر چل رہا تھا۔

تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو
اب ہو چلا ہے یقیں برے ہم ہیں دوستو

طلحہ نے اس کی اتری شکل دیکھ کر زیرلب پڑھا تو وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ وہ دو گھنٹے امی جان کے ے لگی بیٹھی رہی۔

آہستہ آہستہ انہیں ہوش آنے لگا۔ ان کی حالت اب سنبھل رہی تھی۔

"انہیں کچھ کھلائیں پلائیں پھر گھر لے جائیں۔" اسسٹنٹ ڈاکٹر نے ان کا مکمل چیک اپ کر کے جاتے ہوئے ہدایت کی۔

"امی جان! میں ابھی باہر سے کچھ آپ کے کھانے کے لیے لے کر آتی ہوں۔" وہ امی سے کہہ کر باہر نکل آئی۔ طلحہ گھنٹہ بھر میں آنے کا کہہ کر گیا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور وہ اب آئے گا بھی نہیں۔ اسے معلوم تھا وہ اسی طرح کا تھا۔ پل میں بے حد حساس، پل میں بالکل بے نیاز۔

وہ امی کے لیے کچھ اسنیکس لے کر آئی اور ساتھ ڈائٹ سیون اپ، امی نے بمشکل تھوڑا بہت ہی حلق سے اتارا تھا۔

"سارہ! گھر چلو۔ میں گھر جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ تم بھی صبح سے میرے لیے خوار ہوتی پھر رہی ہو۔ کچھ کھا لو۔" وہ بار بار اصرار کر رہی تھیں۔

"امی! آپ پہلے کچھ کھا تو لیں۔ دیکھا نہیں ڈاکٹر صاحب کتنی تاکید کر رہے تھے۔ آپ کتنی ویک ہو رہی ہیں۔" وہ زبردستی انہیں کھلا رہی تھی۔

"سارہ! میرا جی الٹ رہا ہے۔ تم بس گھر چلو...... پرے کرو یہ سب۔" انہوں نے سینڈوچ کا لقمہ واپس اسے تھما دیا۔ وہ گہرا سانس لے کر سب کچھ سمیٹنے لگی۔

وہ امی کو گھر لے کر آئی تو سیما بھابھی لاؤنج ہی میں بیٹھی اسٹار پلس پر لگا کوئی ڈرامہ بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہیں اب امی جان؟" انہوں نے سرسری نظر دونوں پر ڈالی۔

"جی۔" سارہ کو جواب دینا پڑا، نہ دیتی تو ان کا موڈ آف ہو جاتا۔

"بھابھی گیسٹ روم صاف ہے؟ امی کو ادھر ہی لے جاتی ہوں۔ سیڑھیاں کیسے چڑھیں گی۔"

"گیسٹ روم......!" سیما بھابھی چونکیں۔ "وہاں تو شاید ناصر کے کلائنٹ آ کر ٹھہریں گے، بلکہ ابھی ان کا فون آیا تھا کہ میں گیسٹ روم......"

"سارہ! چلو بیٹی، اوپر۔ میں آہستہ آہستہ چڑھ جاؤں گی۔" بھابھی کی بات مکمل ہونے سے پہلے امی نے سارہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تو وہ ان کے ساتھ چل پڑی۔ سیما بھابھی نے کندھے اچکا کر دونوں کو اوپر جاتے دیکھا، اور پھر ٹی وی میں گم ہو گئیں۔ سیکنڈ فلور میں غزل بھابھی بھی لاؤنج ہی میں مل گئیں۔ دونوں کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اللہ سارہ! اتنی دیر کر دی۔ مجھے تو فکر لگ گئی تھی خیر ہو جو اتنا ٹائم لگ گیا ہے۔ کرا لیا چیک

اپ؟ کیا کہا ڈاکٹر نے؟ اب امی جان ٹھیک ہیں؟" وہ امی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں صوفے پر بٹھاتے ہوئے ایک ہی سانس میں سوال کیے گئیں۔

"کرا لیا چیک اپ۔ میڈیسن کچھ چینج کی ہیں۔ انسولین کی ڈوز بڑھا دی ہے اور اگلے ہفتے پھر چیک اپ کروانا ہے۔" سارہ نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ کچن سے اٹھتی کھانوں کی مہک لاؤنج میں پھیلی ہوئی تھی۔ سارہ کی بھوک چمک اٹھی۔ صبح بھی اس نے جلدی میں چائے کے ایک کپ کے ساتھ سلائس لیا تھا دوپہر میں کھانے کے لیے اوپر کچھ بھی پکا ہوا نہیں تھا اور یہ سوچ بھی اسے پریشان کر رہی تھی، اب جا کر کیا کھائے گی۔ بھوک کی وجہ سے اب نقاہت سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"لگتا ہے۔ کچن میں کچھ بن رہا ہے۔" اس نے خود ہی کچھ بے تکلفی سے پوچھا۔

"ہاں۔ بریانی کے لیے گوشت چڑھایا تھا چولہے پر اور مچھلی فرائی کر رہی تھی۔ شام کو آپا جان آ رہی ہیں، تینوں بچوں کو لے کر۔ بس ان کی پسند کی کچھ چیزیں بنا رہی تھی۔ امی جان نے کچھ کھایا۔" غزل نے جلدی جلدی جواب دے کر پوچھا۔

"ہاں ڈاکٹر نے کہا تھا، جلدی سے کچھ کھلانے کو۔ وہیں سے اسنیکس وغیرہ کھلا دیے تھے۔"

"پھر تو تم نے بھی کھا لیا ہوگا۔" غزل بھابھی حسب عادت جلدی سے بولیں۔

"نہیں، ہاں......" وہ کہنا ہی چاہتی تھی کہ غزل بھابھی نے پھر بات کاٹ دی۔

"میرا خیال ہے، اب امی جان کو اوپر جا کر ریسٹ کرنے دو، دوا دینی ہے، تو وہ دے دو۔ میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ تمہیں بھی کہو تو اوپر بھجوا دیتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے ان دونوں کا جواب سنے بغیر کچن کی طرف بڑھ گئیں تو امی نے اسے اوپر چلنے کا اشارہ کیا تو وہ ٹھنڈا سانس بھر کر انہیں اوپر لے آئی۔

غزل بھابھی چائے بھی بھجوانا بھول گئیں۔ امی کے سونے کے بعد اس نے خود ہی اٹھ کر اپنے لیے چائے بنائی اور بسکٹ کے ساتھ پی لی۔ کچھ دیر یونہی خالی الذہن بیٹھی رہی پھر اٹھ کر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

"میری بیٹی ڈپریس ہے، مجھے معلوم ہے دونوں بھائیوں نے ناحق تجھے برا بھلا کہا۔ اتنی تو میری خدمت کرتی ہے ان کو تو یہ بھی توفیق نہیں اور نہ بیویوں کو پھر بھی ہر وقت تمہیں بے جا لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ محتاج ہو گئی ہوں۔ ان کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔" رات کو وہ سونے کے لیے امی کے دوسری طرف آ کر لیٹی تو وہ کہنے لگیں۔

"یہی باتیں ہیں فضول کی جن کو سوچ سوچ کر آپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے۔ ایسی کوئی

بات نہیں۔ آپ کسی کی محتاج نہیں۔ یہ گھر ہمارا ہے اور جو وہ ماہانہ آپ کو خرچ دیتے ہیں تو کچھ احسان نہیں کرتے۔ بیٹے ہیں آپ کے۔ انویسٹ کیا تھا آپ نے اپنا پیسہ۔ ان کی تعلیم کی شکل میں۔ اور میری پیاری امی جان اگر میں بھی آپ کی خدمت نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔'' اس نے بڑے پیار سے اپنی باہنیں ان کے کمزور وجود کے گرد لپیٹیں۔

''یہی تو دکھ مجھے کھائے جا رہا ہے۔'' وہ آہ بھر کر بولیں۔ ''مجھے تم سے خدمت کروانے کا کچھ شوق نہیں، میں تو جلد از جلد تمہیں اپنے گھر کا ہوتا دیکھنا چاہ رہی ہوں۔ تمہارے ہاتھوں میں مہندی لگے، دلہن بنا کر تمہیں اپنے ہاتھوں سے رخصت کروں پتا نہیں خدا وہ دن مجھے کب دکھائے گا۔ مجھے زندگی ہی میں اس فرض سے سبکدوش کرے۔ ایک تو انہوں نے مجھے اٹھا کر تیسرے فلور پر پھینک دیا ہے، جہاں نہ آنے کی خبر نہ جانے کی۔ دو تین رشتہ کرانے والیوں سے کہہ رکھا ہے۔ وہ نیچے آتی ہیں تو پہلی سیما بی بی کے ہتھے چڑھتیں پھر غزل کے، دونوں نے ان دو سالوں میں اپنی دو بہنیں بیاہ لیں انہیں رشتہ کرانے والیوں کے لائے ہوئے پر پوزلز سے جو وہ تمہارے لیے لائی تھیں اور میں سوائے ہاتھ ملنے اور افسوس کرنے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکی۔ اب ان دونوں کو اس لیے تمہارے رشتے سے دلچسپی نہیں ہے کہ پھر یہ زندہ لاش کا بوجھ ان پر آن پڑے گا۔ وہ سمجھتی ہیں، میں ان کی نیت کو نہیں جانتی ہوں اس کی کوئی رضا ہوگی جو یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے اور ایک اس کا دکھ۔'' کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔

''امی جان پلیز۔ اب یہ موضوع مت چھیڑ دیجئے گا۔ آپ نے نیند کی گولی لے رکھی ہے۔ خود کو پر سکون کر کے سو جائیے ورنہ پھر طبیعت خراب ہو جائے گی۔ سو جائیں آپ۔'' وہ آہستہ آہستہ ان کا سر دبانے لگی تو انہوں نے بھی گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر تک وہ سو چکی تھیں۔

''امی کو تو میں نے اس موضوع پر بولنے نہیں دیا مگر اپنے دل کے دریچوں کو کیسے بند کروں جو تمہاری یادوں کے پائیں باغ میں کھل گئے ہیں انس! تم کہاں ہو؟ کہاں ہو تم؟ کس سے پوچھوں۔ کوئی نہیں بتاتا اور تم ایسے بے وفا، کچھ اپنی خبر نہیں دی انس! آ جاؤ، اب امی کی بوڑھی آنکھوں میں انتظار دم توڑ رہا ہے انس......'' وہ دھیمی دھیمی سسکیوں سے رونے لگی۔

☆☆☆

اس اجنبی سے پہلی ملاقات کے دو روز بعد کی شام تھی جب سارہ نے اس اجنبی کو بڑی بے تکلفی سے بڑے بھیا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے دیکھا۔

وہ ناصر بھیا کو امی کا پیغام دینے آئی تھی کہ انہیں امی اوپر بلا رہی ہیں۔ اس شام وہ اتفاقاً

جلدی گھر آ گئے تھے۔

''بھئی عزم! مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو موٹے تازے صحت مند بچے کی تصویر تو ابھی تک میرے ذہن پر نقش ہے جو تقریباً سارا دن ہی ہمارے گھر میں رہتا تھا۔ اب تو تم ماشاءاللہ۔'' ناصر بھیا پر جوش انداز میں اس کے شاندار ماضی کی تصویر کھینچ رہے تھے سارہ دروازے میں ہی رک گئی۔

''ماشاءاللہ کیا......'' وہ جلدی سے بولا ''یعنی خاصا ہینڈسم ہو گیا ہوں، ڈیشنگ بھی۔''

''خاصے خود پرست ہیں حضرت۔'' سارہ نے دل میں سوچا۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' سیما بھابھی نے سراہنے والے انداز میں اس کے وجیہہ سراپے کا جائزہ لیا۔ ''میں نے تمہارا بچپن تو نہیں دیکھا مگر اکثر ناصر کے منہ سے تم لوگوں کے بارے میں ضرور سن رکھا تھا۔'' سیما بھابھی کم ہی کسی کی تعریف کرتی تھیں اور کم ہی کسی سے ملاقات میں بے تکلف ہوتی تھیں۔

''ہاں۔ میری ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ انکل مصطفیٰ کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ شروع شروع میں خط، فون آتے جاتے رہے دونوں طرف رابطہ بھی رہا اس کے بعد زندگی کی ہمہ گیر مصروفیات نے سب کو ہی جکڑ لیا اور ان لوگوں نے بھی خبر نہیں کی انکل مصطفیٰ کی ڈیتھ کی، ورنہ ابو تو ضرور جاتے۔'' ناصر بھیا بولے۔

''تو یہ ہمارے ہمسائے رہ چکے ہیں۔ یہ بھلا کب کی بات ہے؟'' سارہ سوچنے لگی۔

''ہاں۔ بس ان کی موت بھی تو ایک حادثہ تھی۔ روڈ ایکسیڈنٹ کا نتیجہ اور اتنی اچانک کہ عرصہ تک تو ہم لوگ سنبھل ہی نہیں سکے۔ وہ تو شکر ہے، عظیم بھیا اس وقت تک اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے، بہر حال جیسے تیسے زندگی کے دن گزر ہی گئے اور آپ لوگوں نے کون سا انکل کی ڈیتھ کی اطلاع دی۔'' اسے بھی ''جواب شکوہ'' یاد آیا۔

''ابو کو فوت ہوئے تو ابھی تین چار سال ہوئے ہیں۔ تم لوگ تو اب شاید کراچی میں بھی اپنا ایڈریس بدل چکے ہو۔'' بھیا نے لاپروائی سے کہا جیسے ابو کی موت تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔

''بڑے بھیا ہم سے پوچھیں جن کو یہ تین چار سال تین چار صدیوں کے برابر لگے ہیں۔'' اس نے افسردگی سے سوچا۔

''ہاں لیکن اسی علاقے میں ہیں۔''

''اب تو تمہیں ادھر مستقل جاب مل گئی ہے، یہیں رہو گے ناں اب؟'' سیما بھابھی نے موضوع بدلا۔

”امید تو ہے کہ جاب بھی مستقبل ہے اور رہوں گا بھی یہیں، اصل میں، میں امی کو ادھر لانا چاہ رہا ہوں۔ ایک تو ہماری فیملی کے زیادہ تر لوگ لاہور، پنڈی میں رہتے ہیں، کراچی سے ادھر آنا اور ملنا ملانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے امی خود کو وہاں بہت اکیلا اکیلا محسوس کرتی ہیں۔ کچھ انہیں ادھر کی آب و ہوا بھی سوٹ نہیں کی، اتنے سالوں سے کوئی نہ کوئی پرابلم انہیں رہتی رہی ہے۔ سانس کا مسئلہ تو اب سیریس ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے میں کوشش کر رہا ہوں انہیں جلد سے جلد ادھر لے آؤں۔“ اس نے تفصیلاً جواب دیا۔

”وہ تو شاید تمہارے دونوں بھائیوں کے ساتھ رہتیں ہوں گی، وہ کیا انہیں آنے دیں گے ادھر۔ ویسے بھی پہلے خود سیٹ ہو لو پھر سوچنا۔“ سیما بھابھی نے جھٹ پٹ اپنی بے لوث رائے دی۔

”بھائی دونوں......“ وہ رکا۔ ”آنے تو نہیں دیں گے گھر میں لے آؤں گا، امی میرے بغیر اور میں امی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ وہ بشاش لہجے میں بولا۔

”اس کو تو جلنے کے آثار نہیں لگ رہے میں بھلا میسج کیسے دوں۔“ سارہ ذرا سا دروازے سے اندر ہوئی کہ بھیا کی نظر اس پر پڑے تو وہ انہیں متوجہ کر سکے۔ بھیا نے تو نہ دیکھا البتہ اس نے اپنی لمبی سی گردن گھما کر فوراً اسے دیکھ لیا۔

”ویسے ناصر بھائی! ادھر لاہور کے حالات کون سے بہتر ہیں۔“ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس نے دوسرا موضوع چھیڑا۔

”وہ کیسے؟“

”میں نے پرسوں کسی محترمہ کی گاڑی ٹھیک کی۔ ویرانے میں خراب کر کے کھڑی تھیں۔ اب مجھے کیا خبر یہ ان کی چال ہے۔ محترمہ نے بے حد صفائی سے میرا موبائل جیب سے اڑا لیا۔ پورے تیس ہزار کا سیٹ تھا، ابھی تو مجھے خریدے ہوئے بھی چند دن ہوئے تھے۔“ اس کے اتنے گھٹیا الزام پر وہ حق دق کھڑی رہ گئی۔

”زمانہ ہی خراب ہو گیا ہے جس کے ساتھ نیکی کرو، وہی ہاتھ دکھا جاتا ہے تم اس شہر میں نئے ہو، احتیاط کیا کرو۔“ سیما بھابھی نے فوراً مشورہ دیا۔

”میں موبائل لا کر اس کے منہ پر مارتی ہوں۔“ وہ سوچتی ہوئی واپس مڑی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ دو دن امی کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اسے موبائل کا دھیان ہی نہیں آیا تھا، جب وہ موبائل لے کر دوبارہ نیچے آئی تو وہ تینوں اسی طرح مصروف گفتگو تھے۔

”تم اب رات کا کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گے، کھانا بالکل ریڈی ہے۔“ سیما بھابھی بے حد

محبت سے بولیں تو سارہ کو اچھی خاصی حیرت ہوئی۔

”شکریہ بھابھی! میں کھانا دیر سے کھاتا ہوں۔ آپ نے چائے کے ساتھ اتنا کچھ کھلا دیا ہے۔ اب شاید ہی میں رات کا کھانا کھاؤں۔“ وہ فارمل لہجے میں بولا۔

”ارے رہنے دو، اب اتنے بھی اسمارٹ نہ بنو۔ عامر سے نہیں ملو گے۔ وہ تو رات تک آئے گا۔“ ناصر بھیا نے بے تکلفی سے کہا۔

”ان سے تو میں مل کر ہی جاؤں گا اب۔ میں ذرا آنٹی سے مل لوں، ان سے ملنے کی تو امی نے خاص تاکید کی تھی۔ رات کو امی کا یہ تیسرا ڈانٹ بھرا فون تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنے سب کام چھوڑ چھاڑ کر ادھر بھاگنا پڑا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب کہاں جا رہے ہو۔“ سیما بھابھی کچھ پریشان سی ہو گئیں، وہ تو شاید اسے جانے ہی نہیں دینا چاہ رہی تھیں۔

”میں آنٹی سے مل لوں۔ آپ نے بتایا وہ اوپر ہیں۔“

”پنکی، پنکی کو آواز دیں، وہ عزم کو اوپر لے جاتی ہے ویسے اس وقت امی جان آرام کر رہی ہوں گی تم پھر کبھی مل لینا۔“ سیما بھابھی کے سفید جھوٹ پر وہ ذرا حیران نہ ہوئی کیونکہ اس طرح کے سفید، کالے، نیلے، پیلے جھوٹ وہ ہر آنے والے بلکہ امی کے خاص ملاقاتی سے اکثر ہی بولا کرتی تھیں۔

”کوئی بات نہیں۔ میں دیکھ کر آ جاؤں گا۔ رات کو امی کو فون پر جواب بھی تو دینا ہے، سیڑھیاں کس طرف ہیں۔ میں چلا جاتا ہوں۔“ وہ بھی اچھا خاصا ڈھیٹ واقع ہوا تھا بھابھی کے جھوٹ کو ذرا خاطر میں نہ لایا۔

”میں پنکی کو بھیجتی ہوں، وہ تمہیں اوپر لے جائے گی۔“ کہتے ہوئے سیما بھابھی باہر نکل آئیں۔ سارہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی یونہی اخبار دیکھنے لگی۔ سیما بھابھی ایک پل کو تو اسے دیکھ کر کچھ چونکیں پھر پنکی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں، اسی وقت وہ ناصر بھائی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

”ارے یہ سارہ بیٹھی ہے۔ یہ تمہیں امی جان کے پاس اوپر لے جائے گی۔ سارہ! انہیں امی جان کے پاس لے جاؤ۔“ انہوں نے سارہ سے کہا تو وہ ہاتھ میں پکڑا موبائل اخبار کے نیچے کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ناصر بھیا اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ سیما بھابھی، پنکی کو آوازیں دے رہی تھیں جو گہری نیند سو رہی تھی اس کی دوپہر کی نیند ایسی ہی گہری اور طویل ہوتی تھی۔

”یہ لیں اپنا موبائل......“ سارہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ پہلی سیڑھی پر ہی اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل اس کے آگے کر دیا۔ ”اور کسی پر الزام لگانے سے پہلے سوچ لیا

کریں کہ آپ کیا بول رہے ہیں۔" اس کا لہجہ خوف بخود سخت ہو گیا تھا۔

"اوہ تو یہ آپ کی گاڑی میں رہ گیا تھا۔" اس نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

"کیوں اس روز اور کتنی لڑکیوں کی گاڑیاں ٹھیک کی تھیں آپ نے؟" وہ طنز سے بولی۔

"کتنی لڑکیوں کی؟" وہ بڑبڑایا۔ "تین چار کی۔ شاید یاد نہیں۔"

"لگتا ہے، آپ کو ادھر یہی جاب مل گئی ہے مستقل۔"

"آپ جیسوں کی دعاؤں سے کوشش تو یہی ہوتی ہے شہر میں جہاں کہیں بھی کوئی حسینہ اپنی گاڑی کے ساتھ مشکل میں ہو، ہم غیبی امداد بن کر ضرور وہاں حاضری دیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"وہ تو مجھے اس روز ہی معلوم ہو گیا تھا اس "فیلڈ" میں خاصے تجربہ کار ہیں آپ......"

"ارے تم خود ہی جا رہے ہو عزم! پنکی اٹھ تو گئی...... اوہ!" سیما بھابھی جو تیزی سے سیڑھیوں کی طرف آئی تھیں آگے جاتی سارہ کو دیکھ کر چونکیں۔

"چلو اب تم ٹھیک پہنچ جاؤ گے۔" وہ بلند آواز میں بتا کر بولیں تو سارہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"افوہ! ابھی اور سیڑھیاں۔" تھرڈ فلور کے پاس وہ اٹک گیا۔ "لگتا ہے، بہت شوق ہے آپ کو اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا۔ تھوڑا اور اوپر جائیں تو زمین و آسمان کا فرق بھی تمام ہو جائے۔" سارہ نے اس کے مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا۔

امی جان لاؤنج ہی میں بیٹھی تھیں۔ سارہ کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر چونک پڑیں۔

"السلام علیکم۔" وہ خود ہی آگے بڑھا اور بڑے بشاش انداز میں سلام کرتے ہوئے بولا۔

"وعلیکم السلام۔" امی نے تذبذب میں جواب دیا، ساتھ اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"آپ۔ لگتا ہے آنٹی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" وہ ان کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"نہیں بیٹا سوری۔" امی بولیں۔

"میں عزم ہوں، عزم مصطفیٰ۔ آسیہ مصطفیٰ کا چھوٹا بیٹا جو آپ کے ہمسائے رہ...... چکے ہیں، یاد آیا آپ کو۔" وہ آگے جھک کر بولا۔

"ارے تم عزمی ہو۔ آسیہ کے بیٹے۔ ماشاء اللہ اتنے بڑے ہو گئے ہو۔" امی کا چہرہ جیسے کھل اٹھا۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"کیسی ہے آسیہ؟ اچھا تم لوگ ادھر سے گئے۔ میں تو اس کی شکل تو ترس گئی۔ بہن بنی ہوئی

تھی میری اور بے وفا نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ مصطفیٰ بھائی کے انتقال کی خبر بھی نہ کی۔ عظیم، فہیم اور فرخندہ کیسی ہیں؟ فرخندہ کی تو ان دنوں شادی ہونے والی تھی۔" امی ایک ہی سانس میں بولے گئیں۔ بہت دنوں بعد اس نے امی کو یوں خوش دیکھا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں، آپا کی شادی کو تو اب کئی برس بیت گئے۔ اب تو ماشاء اللہ ان کی بیٹی شادی کے قابل ہے۔ بیٹا ڈاکٹر بن رہا ہے۔ دونوں بھائی بھی ٹھیک ہیں۔ شادیاں ہو چکی ہیں۔ دونوں کے بچے بھی کافی بڑے ہو گئے ہیں ان کے اور خوش ہیں سب۔" اس نے بھی ایک ہی سانس میں سارے سوالوں کو نپٹایا۔

"اور آسیہ...... وہ بھی آئی ہے تمہارے ساتھ؟" امی پرشوق لہجے میں بولیں۔

"نہیں، امی تو ابھی کراچی میں ہیں، لے آؤں گا انہیں بھی۔ ابھی تو آپ کا گھر مجھے بڑی مشکل سے ملا ہے۔ بیس برسوں میں تو علاقے کی شکل ہی بدل گئی ہے اور مجھے تو کچھ اتنا یاد بھی نہیں تھا، اور سنائیں، آپ ٹھیک ہیں۔ کافی کمزور لگ رہی ہیں مجھے۔" کافی باتونی لگتا تھا وہ۔

"بس بیٹا، اور کیا ہونا ہے اس عمر میں۔ بیماری، کمزوری اور تنہائی۔" امی کچھ بے بسی سے بولیں۔

"تنہائی کیوں آنٹی! ماشاء اللہ بھرا پرا گھر ہے آپ کا۔ ناصر بھیا سے تو میں مل چکا ہوں، عامر بھائی لیٹ آئیں گے۔ وہ بتا رہے تھے، ان سے مل کر ہی جاؤں گا۔" سونیا آپی مجھے یاد ہیں۔"

"وہ اپنے سسرال میں ہوتی ہے۔ یہ سارہ ہے، تمہیں یاد ہو گی۔"

"کچھ خاص نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ سارہ نے ادھر سے اٹھ کر جانا ہی مناسب سمجھا۔

"سارہ بیٹا...... کچھ چائے، کولڈ ڈرنگ وغیرہ لاؤ۔" امی نے اسے آواز دے کر کہا۔

"پوچھ لیں ان سے، یہ نیچے ٹھیک ٹھاک تواضع کرا کے آئے ہیں۔" سارہ نے کہا تو اس نے سارہ کو گھور کر دیکھا۔

"وہ تو نیچے والوں نے کی تھی، اوپر والے نہیں کریں گے تواضع؟"

"ویسے آپ کی ہونی چاہیے ٹھیک ٹھاک تواضع۔" وہ جواباً اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"وہ کس خوشی میں؟"

"سارہ۔" امی نے سارہ کو گھور کر دیکھا تو وہ کچن کی طرف آ گئی۔

"آنٹی! انس کہاں ہے؟" وہ فریج سے دودھ نکال رہی تھی جب عزمی کی آواز اس کے کانوں

میں پڑی۔ اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ دودھ وہیں رکھ کر وہ فریج کے دروازے کو تھام کر کھڑی ہو گئی اور آنکھوں میں بے ساختہ امڈ آنے والے پانیوں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

"پھپھو! آپ نے آج کیمپس جانا ہے۔" پنکی سیڑھیوں سے ہی اسے پکارتی آ رہی تھی۔

"السلام علیکم دادو! ہاؤ آر یو۔" لاؤنج میں امی بیٹھی تھیں۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے وہ انہیں سلام جھاڑ آئی۔

"جانا تو ہے مگر ذرا لیٹ۔ ہماری ڈیٹ شیٹ آنے والی ہے، اسی کا پتا کرنا ہے اور لائبریری جانا ہے۔" سارہ نے آملیٹ گولڈن ہونے پر پین سے پلیٹ میں نکالا۔

"دیر سے کیوں؟" وہ ٹھنک کر بولی۔ "ابھی چلیں نا، وہ آج طلحہ کا بچہ مجھے چکر دے گیا۔ میں تیار ہو رہی تھی، مجھے بتایا بھی نہیں اور نکل گیا۔ مما تو کہہ رہی ہیں اگر دادو کا مسئلہ نہ ہو تو سارہ والی گاڑی تم لے لو۔ طلحہ صاحب جو بڑے وی آئی پی بنے پھرتے ہیں، ان کی منتوں سے تو جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے تو صاف کہہ دیا۔" وہ آملیٹ توڑ توڑ کر منہ میں ڈالے جا رہی تھی۔

"امی کے لیے بنایا ہے، تم ناشتہ نہیں کر کے آئیں۔" سارہ نے پلیٹ اس کے آگے سے اٹھائی۔

"ناشتہ......اونہوں...... مما ابھی سو رہی تھیں۔ نذیراں کے ہاتھ کی چائے پینے سے بہتر ہے، بندہ گرم پانی سے غرارے کر لے۔ ہائے پھپھو! آج پراٹھے بنائیں نا۔ موسم تو دیکھیں، کیا غضب ناک ہو رہا ہے۔ کالی گھٹا جھوم جھوم کر آ رہی ہیں اور پراٹھوں کے لیے اکسا رہی ہیں۔" وہ للچائے ہوئے انداز میں بولی۔

"یہ بھادوں کی گھٹائیں، بے فکر رہو۔ ابھی کسی اور علاقے کو روانہ ہو جائیں گی ایک قطرہ بھی برسائے بغیر اور تم جیسے پراٹھے پکا کر کڑکتی دھوپ میں کھائیں گے اور اپنا جسم دیکھو ذرا۔ دن بدن امریکی سامراج کی سوچ کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔"

"آئی ڈونٹ کیئر۔" وہ شانے اچکا کر بولی۔ "فریزر میں قیمہ ہے۔" جواب سنے بغیر اس نے فریزر کھولا اور فریز شدہ پیکٹس کا جائزہ لینے لگی۔

"یہ قیمہ ہے نا۔" اس نے ایک پیکٹ نکال لیا۔ سارہ تیزی سے دوسرا آملیٹ تیار کر رہی تھی۔ ایک نظر اس نے پیکٹ کو دیکھا۔

"اب یہ کیا کرنا ہے؟"

"دادو کا ناشتہ دیں۔" اس نے قیمے کا پیکٹ سنک میں ٹونٹی کے نیچے رکھا اور سلیب پر رکھی ناشتے کی ٹرے اٹھا کر لاؤنج میں آ گئی۔ "لیجیے دادو! آپ کا ناشتہ۔" اس نے ٹرے امی کے آگے رکھی۔

"دادو! ایک فرمائش ہے۔" وہ ان کے کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھ گئی۔

"ضرور امی جان! کوئی کھانے پینے کی فرمائش ہو گی۔" سارہ دوسری ٹرے میں پنکی کا ناشتہ رکھ کر لے آئی۔ "یہ لو ٹھونسو۔" ٹرے اس کے آگے رکھی۔

"تھینک یو۔" اس نے ٹرے فوراً اپنی طرف کھسکائی۔

"دادو! آج قیمے والے پراٹھے بنائیں نا دوپہر میں۔ میں اور سارہ کیمپس جا رہے ہیں، بارہ بجے تک آ جائیں گے۔ دادو! اتنا دل کر رہا ہے، آپ جیسے پراٹھے کوئی بناتا ہی نہیں۔" وہ لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"پنکی حیا کرو، امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور تمہیں پراٹھوں کی پڑی ہے، وہ بھی قیمے والے۔ امی سے نہیں بنیں گے، میں آ کر بنا دوں گی" سارہ نے اسے کچن سے ٹوکا، وہ اب چائے تیار کر رہی تھی۔

"آپ کے ہاتھ کے پراٹھے دادو جیسے مزے دار بالکل نہیں ہوتے، آپ رہنے دیں۔ ہیں دادو!" وہ پھر ٹھنک کر بولی۔

"اچھا کوشش کروں گی۔ دعا کرو، میری طبیعت اچھی رہے تو ضرور بنا دوں گی۔ کتنے دنوں بعد تو کسی نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے، ورنہ تو بیکار پرزے کی طرح پڑی رہتی ہوں۔" امی جان اداس ہو گئیں۔

"دیکھا امی کو ڈیپریس کر دیا تم نے، وہ پہلے ہی اتنی پریشان ہو رہی ہیں، اوپر سے۔" سارہ فوراً باہر آ کر بولی۔

"رہنے دیں۔ آپ نے دادو کو کمزور، بیمار کہہ کر بالکل ہی کم ہمت کر دیا ہے۔ دادو! آپ پھپھو کی احتیاطوں پر دھیان نہ دیا کریں، آپ میرے لیے اچھے اچھے کھانا پکایا کریں پھر دیکھیں میرے دل سے آپ کے لیے کیسی اچھی اچھی نیک دعائیں نکلتی ہیں۔ دیکھیے، آپ چند دنوں میں بالکل فٹ ہو جائیں گی اور میں آپ سے ککنگ بھی سیکھ لوں گی۔ دادو جیسا ذائقہ تو کسی کے ہاتھ میں بھی نہیں، پھپھو تو بالکل بے ذائقہ ککنگ......"

ابھی جملہ اس کے منہ ہی میں تھا کہ سارہ جو چائے کا کپ اس کے آگے رکھ رہی تھی، فوراً اٹھا کر اسے گھورنے لگی۔

"نہیں کرتیں، اب تو آپ جیسے کھانے بنانے لگ گئی ہیں اور چائے تو بہت اچھی بناتی ہیں۔"

اس نے فوراً اٹھ کر کپ جھپٹ لیا۔

''بہت دوغلی ہو پٹولڑ کی!'' سارہ اس کے سامنے اپنا ناشتہ رکھ کر بیٹھ گئی۔

سارہ نظر لگاؤ گی میری بچی کو۔ کہاں صحت مند ہو رہی ہے۔'' امی نے فوراً پنکی کو اپنے ساتھ لگا لیا تو پنکی نے شرارت سے سارہ کو آنکھ ماری۔

''امی کی باتوں میں آ کر کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو جانا، بہتر ہے کوئی جم جوائن کر لو، ورنہ پھر تمہاری آمد ورفت کے لیے گاڑی کی نہیں، کرین کی ضرورت پڑ جائے گی۔'' سارہ نے اسے خبردار کرتے ہوئے بولی۔

''میرے پاپا افورڈ کر سکتے ہیں، کرین بھی اور کرین چلانے والا بھی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''چلیں اب اٹھیں، جلدی کریں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' گرم گرم چائے اس نے چار گھونٹ میں ہی پی لی تھی۔

''توبہ ہے پنکی! مجھے ناشتہ تو کر لینے دو، ابھی تو میں نے چینج بھی کرنا ہے۔''

''اور آپ کی کھٹارا اسٹارٹ ہونے میں بھی پورا گھنٹہ لگتا ہے اور جو رستے میں محترمہ پنکچر کا موڈ ہو گیا آرام فرمانے کا تو ہم کل صبح ہی کیمپس پہنچ پائیں گے۔ بس جلدی کریں آپ۔'' پنکی اس کے سر پر سوار ہو گئی۔ سارہ نے اسے گھورتے ہوئے چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ جلدی جلدی چائے پی کر سارہ نے کپڑے تبدیل کیے اور پنکی کے ساتھ چل پڑی۔

''امی! آپ کچھ مت کیجئے گا۔'' میں آ کر کھانا بنا لوں گی۔'' جاتے جاتے وہ امی کو تاکید کرنا نہ بھولی۔

''دادو! قیمے والے پراٹھے وہ بھی صرف آپ کے ہاتھ کے۔'' پنکی کی آواز سارہ سے بھی اونچی تھی۔ امی مسکراتے ہوئے پوتی کی فرمائش پوری کرنے کے بارے میں سوچنے لگیں۔ خیر گزری گاڑی نے رستے میں کوئی اٹھکیلی نہیں کی اور انہیں وقت پر یونیورسٹی پہنچا دیا۔ بارہ بجے دونوں اکٹھی فارغ ہو کر نکلیں۔

''چلو پنکی! جلدی کرو، امی کی دوا کا وقت ہو رہا ہے اور کھانے کا بھی۔ تمہاری وجہ سے مجھے آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔'' سارہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''اب جلدی کی فرمائش آپ مجھ سے نہیں، اپنی اس ''لاڈو'' سے کریں جوان کی طبیعتِ نازک پر گراں نہ گزرے تو۔'' پنکی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''لاڈو'' آج کل جولانی میں ہے، تنگ نہیں کر رہی۔'' سارہ نے پیار سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ

پھیرا۔

''لگتا ہے، آخری ہاتھ کسی خاص مہربان کا لگا ہے، محبت بھرا، جو آج کل بڑے آرام سے ہر فرمائش مان رہی ہے۔'' پنکی کی بات پر سارہ کو آخری مہربان ہاتھ یاد آ گیا تو اس کے لبوں پر خوامخواہ مسکراہٹ سی دوڑ گئی مگر یہ مسکراہٹ اگلے ہی پل افسوس میں بدل گئی۔ یونیورسٹی روڈ کا ٹرن لیتے ہی گاڑی نے چرر چرر کی منحوس آواز نکالی اور بغیر کسی وارننگ کے بالکل ساکت ہو گئی۔

''اس...... یہ اسے کیا ہوا۔'' سارہ جیسے اپنے ہی خیال سے چونکی تھی۔

''وہی جو ہر اہم موقع پر محترمہ کو ہوتا ہے۔ پھپھو! آخر آپ اس موہنجوداڑو کے آخری نمونے کی جان چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔'' پنکی جھنجلا کر بولی۔

''برسوں سے ساتھ ہے پھر ابو کی نشانی مجھے بہت عزیز ہے۔'' سارہ نے کچھ پریشانی سے کہا۔

''تو پھر اسے سینے سے لگا کر رکھیں، چادروں میں لپیٹیں کسی تہ خانے میں رکھوا دیں۔ دادا ابو کی نشانی کو سڑکوں پر کیوں دوڑائے پھرتی ہیں جبکہ آپ کو اس کے کل پرزہ الف ب کی بھی خبر نہیں۔'' پنکی کو بھوک لگ رہی تھی قیمے والے پراٹھوں کے خیال سے اس نے کینٹین میں بھی کچھ نہ کھایا تھا۔

''اللہ مالک ہے، جب جب اس نے عین بیچ سڑک پہ نخرہ دکھایا ہے۔ اللہ نے کوئی نہ کوئی رحمت کا فرشتہ...... فرشتہ......'' اس کی نظریں سامنے سے آتی گرے کرولا پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔

''کیا سچ مچ پھر کوئی فرشتہ آ گیا ہے، نظریں جو یوں پتھر کی ہوں گئی ہیں۔'' پنکی نے اس کے کندھے کو جھنجوڑا۔

''کین آئی ہیلپ یو جنٹل لیڈیز۔'' زرافے جیسی گردن ان کے برابر آ کر رکی، گرے کرولا سے نکلی تھی سارہ نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تو وہ اپنی گاڑی سائیڈ پر پارک کرنے لگا۔

''پھپھو! یہ فرشتہ کون ہے اصلی والا یا......'' پنکی نے عزمی کا جائزہ لیتے ہوئے سرگوشی کی۔

''یہ عزم ہیں، تمہیں بھیا نے نہیں بتایا۔''

''پاپا نے تو کبھی کچھ نہیں بتایا۔ نہ عزم کے بارے میں، نہ عدم کے بارے میں۔ میں نے جو کچھ جانا ہے، خود ہی جانا ہے۔'' پنکی کے جواب پر سارہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''ویسے آپ نے میرے مشورے پر لگتا ہے، غور نہیں فرمایا تھا۔'' وہ گاڑی کے پاس کھڑا ہاتھ پھیلائے سارہ سے چابی طلب کر رہا تھا۔ اس نے چابی نکال کر اس کی کشادہ ہتھیلی پر رکھ دی۔

''کون سے مشورے پر۔؟'' پنکی نے آنکھیں سکیڑ کر مانوس اجنبی کو دیکھا جس کے ہاتھ میں

پھپھو نے بڑے آرام سے چابی تھمادی تھی۔

"عجائب گھر والے۔" وہ بونٹ کھول کر کھڑا تھا۔ سارہ اور پنکی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں۔ "یقین کریں، وہ تو اس نمونے کو دیکھ کر خوشی سے بے حال ہو جائیں گے۔ منہ مانگے دام ملیں گے۔"

"بالکل، میں تو خود پھپھو سے یہی کہہ رہی تھی۔ اسے کسی ورکشاپ والے کے پاس نہ لے کر جائیں وہ تو آپ کو پلے سے کچھ دے کر بھی گاڑی نہ لے گا۔ البتہ میوزیم والے خوشی خوشی یہ عجوبہ روزگار لے لیں گے۔" پنکی بے تکلفی سے بولی۔

"آپ کا تعارف۔" عزم مختلف تاروں اور پرزوں کو چیک کرتے ہوئے بولا۔

"آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔ پھپھو! ایسے ہی ہے نا۔" پنکی نے سارہ کی مدد چاہی۔

"مجھے نہیں پتا۔" سارہ خفگی سے بولی۔ اسے اپنی گاڑی کی انسلٹ پر یونہی غصہ آ جایا کرتا تھا۔

"اس کا انجن تو جیسے آگ کا گولہ بنا ہوا ہے۔" عزم نے انجن کو چھو کر فوراً ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"لو ابھی تو ہم چند میٹر ہی چلے تھے، یہ گرم کہاں سے ہو گیا۔" پنکی منہ بنا کر بولی۔

"یہ ڈرائیور پر بھی ڈیپنڈ کرتا ہے۔ ان کا دماغ بھی کھڑے کھڑے گرم ہو جاتا ہے۔" اس نے سارہ کے ناراض چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"آپ رہنے دیں، ہم خود ہی ٹھیک کروا لیں گے۔" وہ جانے کو مڑی۔

"پھپھو! یہ ستم نہ کریں۔ ایک تو دھوپ کی شدت پھر بھوک کی شدت۔ کیوں آج مجھے مروانے پر تلی ہیں۔ اگر میں آپ کے ساتھ آ ہی گئی ہوں۔" پنکی جلدی سے بولی۔

"پھر کیا فیصلہ کیا محترمہ لیڈیز۔" عزم وہیں ہاتھ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سارہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ پلیز......"

"عزم...... عزم نام ہے میرا۔ یہ تعارف تو کرائیں گی نہیں۔ آپ پنکی ہیں، ناصر بھائی کی صاحب زادی۔ پرسوں آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔" وہ پنکی سے بولا۔

"ہاں، پاپا نے آپ کا ذکر تو کیا تھا، اس لحاظ سے تو......" وہ سوچنے لگی۔ "مگر بھئی! میں آپ کو چاچو واچو بالکل نہیں کہوں گی۔ اتنے ینگ سے تو ہیں، عزم صاحب ٹھیک ہے۔" وہ ایسے خود سے بول رہی تھی۔

"بالکل ٹھیک، ہنڈرڈ پرسنٹ ٹھیک اور یہ آپ کی گاڑی بھی ٹھیک۔" اس نے کہتے ہوئے

بونٹ گرا دیا۔ "اتنی ٹھیک ہو گئی ہے کہ گھر تک جا سکے۔ اس کے بعد براہ کرم اسے کسی مستری کو دکھا ہی ڈالیں کیونکہ اس ماڈل کو تو اب پرانے مستری ہی سمجھ سکتے ہوں گے۔" اس نے چابی سارہ کو تھمائی۔ "اسٹارٹ کر کے دیکھیں۔"

وہ خاموشی سے چابی لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ چند سیکنڈز کے بعد گاڑی مختلف آوازیں نکالنے کے بعد اسٹارٹ ہو ہی گئی۔

"لگتا ہے لاہور میں آپ کو یہی جاب مل گئی ہے اور آپ کے بیان پر یقین بھی آ گیا کہ آپ ایسا کوئی گولڈن چانس مس نہیں کرتے، جہاں کہیں نازنین کی گاڑی خراب ہوئی، آپ حاضر۔" سارہ گاڑی اسٹارٹ ہونے پر مسکرا کر بولی۔

"پھر تو میں آج ہی پاپا سے کہتی ہوں، ایک پرانی کھٹیچر کار مجھے بھی لے کر دیں پھر تو آپ جیسے مہربانوں سے ہر روز ہی شہر کے کسی بھی کونے میں ملاقات کی جا سکے گی۔" پنکی جلدی سے بولی۔

"موسٹ ویلکم۔" عزم سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔ "ہم تو پیدا ہی نازنینوں کی خدمت کے لیے ہوئے ہیں۔"

"بہت فضول خدمت ہے۔" سارہ بولی۔

"یہ فضول خدمت نہ ہوتی تو آپ دونوں ابھی تک دھوپ میں کھڑی گھر جاتے ہی فیئر اینڈ لولی لگانے کے بارے میں سوچ رہی ہوتیں۔ اوکے، اب چلنا چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

"ایک دو روز میں چکر لگاؤں گا۔ انس کا کچھ پتا چلا؟" اس کا سوال اس قدر اچانک تھا کہ سارہ سے کوئی جواب ہی نہیں دیا گیا۔ نفی میں سر ہلا کر اس نے گاڑی کے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ ایک دم سے بڑھا دیا۔ یکا یک آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ سامنے کے منظر چمکتی دھوپ میں بھی دھندلانے لگے تھے۔

☆☆☆

اگلے دو دن اس کے لیے بہت مصروفیت لے کر آئے۔ سونیا آپی اپنے تینوں بچوں کے ساتھ دو دن رہنے کے لیے آئی تھیں۔

"آپی! صرف دو دن؟" اس نے دو دن کا سن کر فوراً کہا۔

"بڑی مشکل سے نکالے ہیں یہ دو دن بھی۔ ہنی اور فہد کے سکول تو کھل چکے ہیں، اگلے ہفتے سے ارم کی سیکنڈ ایئر کی کلاسز اسٹارٹ ہو جائیں گی۔ میں نے سوچا امی کو جا کر دیکھ آؤں، اس کے بعد تو بالکل وقت نہیں ملنا۔ ان کی پھپھو آ رہی ہیں جدہ سے پورے دو ماہ کے لیے پھر میں گھر سے نہیں نکل سکوں

گی۔" سونیا آپی نے تفصیل بتائی۔

"اور امی! آپ سنائیں، کیسی طبیعت ہے، پچھلے دنوں آپ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی سنا ہے بلکہ سیما بھابھی بتارہی تھیں۔ سارہ! تم کم از کم مجھے فون کر کے تو بتا سکتی تھیں، میں اس دن عمران کے ساتھ آ کر امی کو دیکھ جاتی۔ ویسے تو میں خود ہی تیسرے چوتھے دن فون کر لیتی ہوں۔ اس ہفتے کچھ مصروفیت زیادہ رہی اور تم نے بھی فون کرنے کی زحمت نہیں کی۔" موقع ملتے ہی انہوں نے شکوہ کر ڈالا جسے دل میں دبا کر اوپر تک آ گئی تھیں۔

"آپی! امی کی طبیعت تو آپ کو پتا ہے شوگر کنٹرول پر ڈیپینڈ کرتی ہے۔ اس دن بلڈ یوریا کا لیول خاصا ہائی ہوگیا تھا، اس لیے کچھ پرابلم ہوگئی تھی۔ آپ کو پریشان کیا کرتی، آپ کون سا فارغ ہوتی ہیں۔ بچوں کو، گھر کو دیکھنا پھر آپ کی ساس بھی تو ہر وقت کی بیمار ہیں، اس لیے مجھے بطور خاص فون کر کے بتانا اچھا نہیں لگا۔" سارہ نے وضاحت کی۔

"چھوڑو ان باتوں کو، یہ بیماری کا روگ جب سے جان کو لگا ہے، روز ہی کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ تم سناؤ، عمران ٹھیک ہے، نیچے ہی سے چلا گیا اوپر آ کر مل تو لیتا۔" امی نے کہا۔

"امی! شام میں آئیں گے، اس وقت جلدی تھی پھر اوپر آنے میں بھی پانچ منٹ لگتے ہیں۔ آپ بھی سارا گھر چھوڑ کر اوپر آ کر بیٹھ گئی ہیں۔" سونیا نے پرانا گلہ دہرایا۔ امی نے جواب نہ دیا۔

"سارہ! اے سی تو آن کرو۔ اف یہ گرمی تو جان نہیں چھوڑ رہی۔ آپ لوگوں نے اے سی بھی بند کر دیا ہے۔"

سونیا کو گرمی ویسے بھی کچھ زیادہ لگتی تھی اور آج گرمی تھی بھی زیادہ۔

"محترمہ سیما بھابھی نے ایک ہفتہ قبل سرکلر بھیجا تھا، دونوں پورشنز میں پچیس اگست کے بعد کوئی اے سی نہیں چلائے گا کیونکہ اگر اس بار بھی اے سی چل گئے تو میٹر ہی اتر جائیں گے۔"

"ایں...... نیچے تو دھڑا دھڑ دونوں اے سی چل رہے ہیں۔" سونیا فوراً بولی۔

"وہ نیچے ہے نا۔ ویسے بھی بل تو وہی دیتے ہیں۔ عامر بھیا بجلی کا بل کب پے کرتے ہیں۔ ناصر بھائی کو تینوں پورشنز کا بل پے کرنا پڑتا ہے، اس لیے گرمیوں میں ان کا دماغ اے سی کے باوجود خاصا گرم رہتا ہے۔" وہ شرارت سے بولی امی نے اسے گھورا۔ "ویسے اب موسم کافی بدل رہا ہے رات اچھی خاصی خنک ہو جاتی ہے۔"

"ارے رہنے دو، اگست میں رات خنک...... یہ کس دیوانے نے اڑائی ہے۔" رات بھی اس قدر گرمی تھی۔ اگست، ستمبر میں تو اے سی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے پھر امی کے لیے تو اے سی بہت

ضروری ہے، اوپر سے تھرڈ فلور۔ گرمیوں میں کباب، سردیوں میں قلفی۔" سونیا منہ بنا کر بولی۔

"ماشاء اللہ سے ارم سیکنڈ ایر میں آ گئی ہے، کتنی جلدی وقت گزرتا ہے۔ سارہ! تم اٹھ کر کچن کا کچھ کام دیکھ لو اتنے دنوں بعد بچے آئے ہیں۔ کچھ ان کی پسند کی چیز بنا لو۔" امی نے موضوع بدلتے ہوئے سارہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی، امی اب کس موضوع پر آنا چاہ رہی ہیں۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر اٹھ گئی اور کچن میں آ کر فریزر کا جائزہ لینے لگی۔ تینوں بچے نیچے ہی تھے، اس لیے امی اور سونیا آپی کی آوازیں کچن تک باآسانی آ رہی تھیں۔

"جی امی سیکنڈ ایر میں آ گئی ہے۔" سونیا آپی نے امی کے پہلے فقرے سے بات شروع کی۔

"کچھ نہیں بنا پھر؟" امی کا پژمردہ لہجہ صاف اسے بتا گیا وہ کس "بنانے" کی بات کر رہی ہیں۔

"کیا کروں امی! ایک تو اب وقت نہیں ملتا، دوسرے یہ رشتہ کرانے والی، ان کے نخرے اٹھانا کتنا مشکل ہے۔ دس دس فون کرو پھر آتی ہیں، وہ بھی اوٹ پٹانگ رشتے لے کر۔ کتنا اچھا رشتہ تھا فرحان کا۔ جرمنی میں عیش کر رہی ہے غزہ صاحبہ کی بہن۔ ڈاکٹر تھا، اپنا گھر، کلینک، نہ سسرال کا جھنجٹ۔ اتنی تعریفیں کی تھیں میں نے فرحان کی بہن سے سارہ کی۔ وہ تو بن دیکھے ہاں کر بیٹھی تھیں۔ دیکھنے آئیں اور اس غزل کی بچی نے رستے ہی میں جھپٹ لیا۔ اپنی بہن ماریہ آئی بیٹھی تھی، اسے دکھایا۔ خوب چاپلوسی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔ میرے دل سے تو امی اس رشتے کا ملال نہیں جاتا۔" سونیا آپی سال بھر پہلے کا قصہ پھر لے کر بیٹھ گئیں۔ اس نے گوشت اور قیمے کے پیکٹ سنک میں رکھے۔

"چلو، اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی جو یہ رشتہ نہ ہوا۔ نا معلوم ہمارے لیے اس میں کیا ضرر تھا۔ ویسے بھی اس بات کو اب سال بیت گیا، اب تو میرے دل کو جیسے پنکھے لگے ہیں۔ کسی طرح سارہ کا جلد از جلد ہو جائے، میرے سینے پر دھرا بوجھ کم ہو۔ میں اپنی بچی کی صورت نہیں دیکھ سکتی۔ دن رات میری بیماری کے چکر میں کملا کر رہ گئی ہے۔ بھائیوں بھابھیوں کو کچھ پروا نہیں۔ دس دس بلاوے بھیجتی ہوں نیچے، تب دونوں آ کر صورت دکھاتے ہیں۔ سارہ کے رشتے کی بات کروں، فکر ظاہر کروں تو لاپروائی سے اٹھ کر چل دیتے ہیں۔ "اچھا امی کہیں گے، ڈھونڈیں گے، کسی سے بات کریں گے، اسی ٹال مٹول میں بچی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ تم ہی کچھ ہاتھ پیر مارو۔" امی کا بس نہیں چل رہا تھا، اسے آج ہاتھ پکڑ کر کسی کے حوالے کر دیتیں۔

"اور جو چھ ماہ پہلے عادل کا رشتہ آیا تھا، امی! وہ بھول گئیں آپ جسے سیما بھابھی لے اڑیں اپنی چھپکلی بہن کے لیے۔" سونیا جل کر بولیں۔ "وہ بھی آپ کی اس حجرہ نشینی کا نتیجہ تھا۔ آنٹی صغراں،

عادل کی ممی کو اوپر کیا لائیں، سیما بھابھی کی چکنی چپڑی باتوں نے انہیں وہیں گھیر لیا اور سیما بھابھی نے جھٹ پٹ اپنی بہن کی فون کر کے بلوالیا۔ دو گھنٹے میں سارے معاملے طے ہو گئے اور آپ بے خبروں کی طرح مجھے فون کر رہی تھیں کہ تمہاری صغراں ابھی تک نہیں آئی عادل کی ماں کو لے کر اور عادل کی ممی نیچے رشتہ طے ہو جانے کی مٹھائی کھا رہی تھیں۔ دونوں ہی رشتے اس قدر اچھے تھے اور دونوں کی دفعہ میں ساتھ نہ آسکی۔ آنٹی کی طبیعت بھی ان دنوں ہی خراب ہوتی ہے، جب ادھر آنا ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ وہ بھی رشتہ اچھا تھا مگر ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔ ہر منفی نتیجہ کی سوئی امی کے اس نکتے پر آ کر اٹک جاتی تھی کہ نصیب میں نہیں تھا اور آپی کو امی کے اس نکتے سے چڑ تھی۔

"امی! نصیب بھی بنائے جاتے ہیں، ہاتھ بڑھا کر توڑے جاتے ہیں یا نوچے جاتے ہیں، اور کبھی کبھار تو چھیننے بھی پڑتے ہیں۔ کوئی تھالی میں دھر کر آپ کو خوش نصیبی نہیں تھما جاتا۔" سونیا جل کر بولی۔

"ارے چھین جھپٹ کر لیا تو کیا لیا، کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالا۔ ساری عمر اللہ کے بھی مجرم اور خلق خدا کے بھی۔ ضمیر کی مار علیحدہ۔" امی اپنے نکتہ نظر سے نہیں ہل سکتی تھیں۔

"امی! بیٹھی رہیں آپ اپنی خوش خیالی لے کر۔ کہاں کا حق، کہاں کا ڈاکہ۔ امی جان! آج کل جو چھین لیا، وہ ہمارا ہے، اس میں ڈاکے کا کیا ذکر......"

"اچھا چھوڑو، تمہیں ایک بات بتاؤں۔" امی کو معلوم تھا اب سونیا سے لمبا لیکچر سننے کو ملے گا، فوراً بات ٹال گئیں۔

بیاہی ہوئی بیٹیاں کیسی سہیلیاں سی لگتی ہیں۔ مجھ سے تو امی کبھی اس طرح دل کی بات نہیں کرتیں۔ بریانی کا مسالہ بناتے ہوئے سارہ نے دونوں ماں بیٹی کی بے تکلف گفتگو سن کر سوچا۔

"وہ مصطفیٰ صاحب نہیں تھے جو بیس سال پہلے ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔" امی بولیں۔

"جی وہ جو کراچی چلے گئے تھے جن کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ آسیہ آنٹی کی بات کر رہی ہیں نا آپ۔" سونیا کا حافظہ بلا کا تیز تھا، اسے بچپن کے قصے کہانیاں بھی ابھی تک سیاق و سباق کے ساتھ یاد تھیں۔ یہ تو پھر ساتھ کی دیوار کا قصہ تھا۔

"ہاں، ہاں وہی۔" امی پر جوش لہجے میں بولیں۔

"کیا ہوا انہیں؟" سونیا کچھ بیزار سی تھی۔

"ہونا کیا ہے، ان کا چھوٹا بیٹا یاد ہے نا تمہیں عزم۔"

"ہاں یاد ہے۔" سونیا آپی کشن اٹھا کر صوفے پر دراز ہو گئیں۔

"وہ آیا تھا تین چار دن پہلے ادھر۔"

"ہمارے گھر؟" وہ کچھ حیرانی سے بولی۔

"ہاں، آسیہ نے ایڈریس دیا تھا اور ملنے کی تاکید بھی کی تھی، اسی لیے آیا تھا۔ ماشاء اللہ بہت ہینڈسم، خوبصورت اور اونچا لمبا نکلا ہے۔ میں تو پہچان ہی نہ سکی۔"

"کیا کرتا ہے؟" سونیا کا لہجہ ہنوز بیزار تھا۔

"کسی اچھی کمپنی میں ملازمت کر رہا ہے۔ گھر، گاڑی دونوں کمپنی والوں نے دے رکھے ہیں۔"

"شادی شدہ ہے؟"

"پتا نہیں، میں نے پوچھا نہیں۔ اس نے بتایا نہیں۔" امی سادگی سے بولیں۔

"امی جان! کسی معاملے میں تو ہوشیاری دکھالیا کریں۔" سونیا آپی کو امی کو سمجھانے کا ایک اور موقع مل گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کوئی فون نمبر وغیرہ تو ہوگا آپ کے پاس؟"

"نہیں، کہہ رہا تھا۔ کچھ دنوں تک پھر چکر لگاؤں گا، آسیہ بھی آئے گی۔ دونوں بڑے بیٹے تو بیاہ دیے ہیں، بیٹی پہلے ہی اپنے گھر کی کر دی تھی بلکہ عزم بتا رہا تھا کہ اس کے بچے بھی جوان ہیں۔"

"اب آئے گا تو مجھے فون کر کے بلوالیں، میں ملوں گی مجھے یاد ہے، بہت اچھے لوگ تھے۔ خاص طور پر آسیہ آنٹی بہت پولائٹ تھیں۔ بہت دھیمی آواز میں بات کرتی تھیں۔ ہے نا امی!"

"ہاں، آسیہ کی یہ خاص بات تھی۔ بہت مدھم آواز میں بولتی تھی۔ کبھی ہم نے اسے چیخ کر بات کرتے نہیں سنا تھا، اچھی عوت ہے۔ عزم کہہ رہا تھا کہ کچھ بیمار ہے، سانس وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ ادھر کی شاید آب و ہوا موافق نہیں۔ کہہ رہا تھا، میں اب سیٹ ہو گیا ہوں۔ ماں کو ادھر ہی لے آؤں گا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے، نیچے ملا تھا وہ سب سے؟" سونیا کچھ سوچ کر بولی۔

"نیچے ہی سے تو آیا تھا ناصر، سیما کے پاس بیٹھ کر۔ عامر اور غزل تو تھے نہیں۔"

"اب آئے تو فوراً اوپر بلوالیں، سیما بھابھی کے پاس زیادہ نہ رکنے دیں۔" سونیا بولی۔

"ایں......وہ کیوں؟" امی حیرانی سے بولیں۔ "اب تو سیما کی دونوں بہنیں ٹھکانے لگیں، اب کس بات کر ڈر۔" امی سونیا کا خطرہ بھانپ کر بولیں۔

"امی! آپ بہت بھولی ہیں۔ آپ کی پوتی، سیما بھابھی کی بیٹی پنکی شادی کے قابل ہے۔ آنرز کر رہی ہے وہ۔ آپ شاید بھول رہی ہیں۔" سونیا آپی کی بات اس قدر اچانک تھی کہ پیاز چھیلتے اس

کے ہاتھ بھی تھم سے گئے۔

''ایں......!'' امی بھی حیران ہوگئیں۔ ''نہیں، پنکی تو ابھی چھوٹی......''

''پلیز امی! کچھ زمانے کے رخ کو بھی سمجھیں۔ پنکی انیسویں سال میں ہے۔ پروپوزل اچھا مل جائے تو سیما بھابھی اس کی کم عمر بھی نہیں دیکھیں گی۔ مجھے ان کی ذہنیت کا علم ہے۔ خیر چھوڑیں، ہم کون سا رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ پہلے میں مل تو لوں عزم مصطفیٰ سے۔'' سونیا نے خود ہی بات تمام کردی۔

''امی! انس کا کچھ پتا چلا؟'' سارہ نے چھری سلیب پر رکھ دی۔ آنکھوں میں بے تحاشا پانی آرہا تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہیں سلیب پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔

امی نے نفی میں سر ہلایا تو سونیا ٹھنڈی آہ بھر کر چپ کرگئی۔

☆☆☆

''سارہ! تم اگلے ہفتے تیار رہنا، منڈے تک میں آنٹی جمیلہ کے ساتھ آؤں گی۔ ان کی کوئی ملنے والی ہیں، وہ ساتھ ہوں گی۔ ان کا بیٹا سی اے ہے، کینیڈا میں ہوتا ہے۔ ادھر بھی اپنا گھر، بزنس ہے۔ اچھے خوشحال، خوش اخلاق لوگ ہیں۔ میں نے امی کو بتا دیا ہے، تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم ذہنی طور پر......'' صبح ناشتے کے بعد سارہ چائے کے خالی برتن ٹیبل سے اٹھانے لگی تو سونیا نے اسے ہاتھ روک کر پاس بٹھا لیا اور تفصیل سمجھانے لگی۔

''پلیز آپی!'' ''آپ کو معلوم ہے، میرا فائنل ایگزام سر پر ہے اور آپ یہ وقت کی راگنی بھی کوئی رشتہ، کبھی کوئی۔ مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔ امی کو کون دیکھے گا۔ ان کی صحت دیکھ رہی ہیں آپ۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔ کئی مہینوں سے بلکہ تین چار سال سے تو یہ پروپوزل پروپوزل کی آنکھ مچولی اس کے ساتھ کھیلی جارہی تھی۔ ابھی اس کی باری آتی بھی نہ اور پروپوزل کی بال کسی اور کے کورٹ میں ٹھک سے جا گرتی اور وہیں کیچ کرلی جاتی اور سارہ کے حصے میں آتیں امی کی اٹھتے بیٹھتے سرد آہیں اور بڑبڑاہٹیں۔

''تمہیں کس نے کہا تھا یہ ایم فل کا روگ پالو۔ ماسٹر کرلیا، کافی تھا۔ پہلے ہی لوگ پوسٹ گریجویٹ لڑکی کو اچھا خاصا عمر رسیدہ تصور کرتے ہیں۔ تم نے ایم فل کا تمغہ بھی اپنے ماتھے پر سجالیا اور رہ گئی امی کی صحت......تو صرف تم ہی نہیں رہ گئیں امی کی دیکھ بھال کرنے والی۔ نیچے والے خدانخواستہ مر گئے ہیں، سب ہی امی کا خیال رکھتے ہیں اور ان کی صحت کیوں بہتر نہیں ہورہی، اس کی وجہ بھی تمہیں معلوم ہے۔'' سونیا اس کی جھنجلاہٹ پر کچھ غصے سے بولی۔

''معلوم ہے، میں ذمہ دار ہوں۔ ہاں میں ہی ذمہ دار ہوں۔ کہہ دیں، میں ہرگز برا نہیں مانوں گی۔ اتنے سالوں سے بھی تو یہی سن رہی ہوں۔ آپ کا اگر بس چلے تو مجھے کسی راہ چلتے ریڑھی بان

کے ساتھ کردیں، اور امی کی صحت کا جتنا خیال نیچے والے رکھتے ہیں، آپ کو معلوم ہے، اور مجھے کوئی گولڈ میڈل نہیں لینا سب سے شاباش لے کر......'' وہ بھی جیسے پھٹ پڑی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''یہی تو میں پھپھو سے کہتی رہتی ہوں۔ آپ جلدی سے اپنے ہاتھ پیلے کروائیں۔ دادو کے لیے ہم جو بیٹھے ہیں۔ پھپھو! آپ کی رخصتی کی گاڑی ابھی گیٹ سے نکلے گی بھی نہیں، میں اپنا سامان اٹھا کر اوپر دادو کے پاس آجاؤں گی۔ انڈیپینڈنٹ لائف۔ بغیر کسی کی روک ٹوک کے، خاص طور پر طلحہ کے آرڈر سے مکمل آزادی۔ سچ پھپھو! آپ شادی کی ہامی تو بھریں۔'' پنکی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شاید سارہ کے آخری فقرے سن لیے تھے، اوپر آتے ہی بولی۔

''اور دادو تو اس قدر اچھی ہیں، بالکل بے ضرر۔ مجھے تو ان کے ساتھ رہ کر بڑا مزہ آئے گا۔ کیوں دادو!'' وہ فوراً امی کے ساتھ لپٹ کر بیٹھ گئی۔

''بالکل، میرے بچے ہی فرمانبردار ہیں، محبت کرنے والے۔ مجھے معلوم ہے، پنکی مجھ سے کس قدر محبت کرتی ہے۔'' امی نے اس کا ماتھا چوما۔ ''بس محبت کے اظہار کا اس کے پاس ٹائم کم ہوتا ہے۔'' ان کی آخری بات پر پنکی سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

''دادو......'' وہ شکایتاً بولی۔ ''ہاں۔ سارہ پھپھو جیسی فل ٹائم نرس بننے میں مجھے واقعی سالوں لگیں گے۔'' وہ خود ہی اقرار کرتے ہوئے بولی۔

''سونیا پھپھو! اچ کریم بخش میں سیل لگی ہے۔ چلیں، میں کتنے دنوں سے سارہ پھپھو سے کہہ رہی ہوں، یہ تو سنتی نہیں۔ آپ چلیں گی تو یہ بھی تیار ہوجائیں گی۔'' پنکی کو جیسے یاد آیا تو فوراً سونیا سے بولی۔

''شاپنگ تو مجھے بھی کرنی ہے۔ گھر میں تو بازار جانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ چلو سارے فٹافٹ تیار ہوجاؤ، میں بھی چینج کرلیتی ہوں۔ ابھی دوپہر کے کھانے میں بہت ٹائم ہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔'' سونیا شاپنگ کے لیے کسی بھی وقت تیار ہوسکتی تھی، فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

''میں بھی تیار ہو آؤں۔ پھپھو! جلدی آئیے گا نیچے، مما ساتھ والی آنٹی فرحانہ کی طرف گئی ہیں، واپس آگئیں تو کوئی نہ کوئی بہانا کرکے ٹال دیں گی، جلدی۔'' پنکی جس طرح اچانک آئی تھی، اسی طرح فوراً اٹھ کر نیچے بھاگ گئی۔

''چلو سارہ! اٹھو۔'' سارہ کو اسی طرح بیٹھے دیکھ کر سونیا نے کہا۔

''مجھے نہیں جانا، آپ جائیں۔ امی اکیلی رہ جائیں گی۔'' وہ خفا خفا سے لہجے میں بولی۔

''امی کے پاس ارم ہے نا، وہ اب تک سو رہی ہے۔ آدھے گھنٹے تک اٹھ جائے گی اور

ہمارے آنے تک کچھ نہ کچھ لنچ کے لیے بھی تیار کر لے گی، امی کو کھلا بھی دے گی۔ تم بھی اپنے لیے کچھ خرید لینا۔ پچھلے سال کے سارے سوٹ تم نے اس سال پہنے ہیں۔ سردیوں کے لیے کچھ دیکھ لینا، امی کا ایک آدھ سوٹ۔ تم اٹھو تو سہی بوڑھی روح۔" سونیا نے آخر میں بڑبڑا کر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

"آپی! پلیز......" وہ بالکل جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

"سارہ! چلی جاؤ، یوں خود پر آدم بیزاری طاری مت کرو۔ لڑکیاں ہنستی بولتی، اچھا پہنتی اوڑھتی بھلی لگتی ہیں۔ تم تو میری بیماری کے ساتھ بیماری ہو کر رہ گئی ہو۔ میرے دل کو جو روگ لگا ہے، اس کا علاج کس کے پاس نہیں۔ تم کیوں جیتے جی خود کو زندگی سے دور کر رہی ہو۔" امی کی بات پر دونوں بہنوں کے چہرے مرجھا گئے۔

"اٹھو، اب دیکھا امی کو افسردہ کر دیا۔ تم خوش خوش رہو تو امی بھی خوش رہیں۔" سونیا نے اسے ٹوکا تو وہ بادل نخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر سونیا نے پنکی کے ساتھ ایچ کریم بخش ہی نہیں، پورا مال روڈ ہی گھوم ڈالا۔

"ہیلو۔" وہ تینوں اس وقت "صاحب جی" سے نکل رہی تھیں، جب دائیں طرف کسی نے ان کے پاس آ کر کہا تھا۔ تینوں چونک کر مڑیں۔ عزم مصطفیٰ کا مسکراتا چہرہ ان کے سامنے تھا۔ سونیا نے کچھ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا تو سارہ کو مجبوراً تعارف کروانا پڑا۔

"آپی! یہ عزم مصطفیٰ، امی نے بتایا تھا نا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"اور یہ شہر کے کسی بھی کونے، کسی بھی سڑک سے ایک دم اگ آنے کی ناقابل یقین صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ پھپھو! یہ تو بتائیں نا آپ کی گاڑی کے ماہر امراض قلب۔" پنکی کی سرگوشی اتنی بلند ضرور تھی کہ سارہ کے علاوہ سونیا اور عزم نے بھی سن لی۔

"یہ خوبی بھی کسی کسی میں ہوتی ہے ہر جگہ پائے جانے کی ورنہ اکثر لوگ تو ایک جگہ کھڑے کھڑے اپنی عمر تمام کر دیتے ہیں چاہے دماغی طور پر یا جسمانی طور پر۔"

اس کے اشارے کو سونیا اور پنکی تو نہ سمجھیں۔ سارہ نے البتہ ایک تیز نظر اس پر ڈال کر رخ پھیر لیا۔ سونیا کے دل کی مراد پوری ہو گئی ان کے مکالمے کے دوران ہی اس نے عزم کا تفصیلی جائزہ لے ڈالا تھا، خوبصورت، ہینڈسم، ذہین اور سب سے بڑھ کر خوش اطوار کسی بھی جگہ سونیا اسے اپنے بہنوئی کے طور پر متعارف کراتی تو یقیناً اس کا سر فخر سے بلند ہوتا۔ اس سوچ کے ساتھ جیسے اس کا دل جوش سے بھر گیا۔ شاپنگ کی ساری تھکان ختم ہو گئی۔ دھوپ کی تیز چمک اور گرمی سے جلتا بلتا مال ایک دم سے خوشگوار ہواؤں اور نرم دھوپ کے حصار میں آ گیا تھا۔

"بھئی۔ امی سے رات تمہارا اتنا ذکر سنا کہ میں تو بے چین ہو رہی تھی تم سے ملنے کو۔ بیس سال پہلے دیکھا تھا تمہیں اور آج...... ماشاء اللہ مجھے پہچانا۔" سونیا پورے دھیان سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"بیس سال تو سونیا آپی! اچھے اچھوں کا نقشہ بدل جاتا ہے، گاؤں شہر اور شہر گنجان آبادیوں میں بدل جاتے ہیں۔ کمزور مٹی سے وجود بڑے بڑے پہاڑ دکھنے لگتے ہیں۔ سونیا آپی یہ نظر کا دھوکا ہوتا ہے یا گزرے وقت کی ستم کاریاں......" وہ شرارتی لہجے میں بولا۔ سونیا بچپن میں بالکل دھان پان تھی کمزور اور لاغر اور اب شادی کے بعد رفتہ رفتہ اس کا جسم پھیلتا ہی چلا گیا اور اب تو کوئی ایکسر سائز، کوئی ڈائٹنگ اس کے تن و توش کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

"غضب کا حافظہ ہے تمہارا عزمی کے بچے! تمہیں ابھی تک یاد ہے کہ میں بچپن میں کیسی تھی۔" اس کے مذاق کا سونیا نے ذرا بھی برا نہ مانا ورنہ سونیا کے جثے کو نشانہ بنانا اپنی شامت کو آواز دینے کے برابر تھا۔

"واقعی پھپھو! آپ کسی زمانے میں ایسی بھی رہی ہیں؟ ناقابل یقین۔" پنکی کی بات پر سونیا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اور سناؤ امی، بھائی آپا، سب ٹھیک ہیں نا۔ تمہارے ابو کا سنا بہت افسوس ہوا۔" وہ کھڑے کھڑے ہی خوش اخلاقی کے سارے ریکارڈ توڑنے لگی تھیں۔ سارہ کو کوفت ہونے لگی۔

"ٹھیک ہیں سب۔ آپ ادھر شاپنگ کر رہی تھیں۔" ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ بیگز دیکھ کر عزم نے کہا۔

"ظاہر ہے مال پر بندہ شاپنگ کے لیے ہی آ سکتا ہے اتنی کڑی دھوپ میں کوئی دھوپ خوری کے لیے تو آنے سے رہا۔" پنکی جھٹ سے بولی۔

"ارے بے بی! آپ کو کیا معلوم، مال کی دھوپ خوری بھی اپنے اندر ایک الگ چارم رکھتی ہے، کیوں سونیا آپی؟"

"ہاں۔ سونیا آپی نے تو جیسے ریسرچ کر رکھی ہے، شہر بھر میں کون سی جگہ کی دھوپ اپنے اندر کتنا چارم رکھتی ہے۔" سارہ کے منہ سے ایک دم نکلا تھا۔

"ویسے سونیا آپی! آپ کی یہ بہن کچھ سنکی سی نہیں ہیں۔ آدم بیزار سی۔" وہ بھی منہ پھٹ تھا۔ کئی دنوں کی دل میں رکھی بات کہہ ڈالی۔

"نہیں۔ سارہ تو بہت خوش باش، ملنسار لڑکی ہے۔ بس آج کل امی کی وجہ سے کچھ پریشان

رہتی ہے اسی لیے۔ سونیا نے محبت سے سارہ کی آدم بیزاری کی ڈھال ای کی بیماری کو بنا ڈالا۔

"لگتا ہے یہ ہر وقت اپنے منہ کے آگے اسی ڈھال کو سجائے پھرتی ہیں جب دیکھو پریشان، ہراساں اور ہونق۔

"آپی! چلیں گھر۔" بہت دیر ہو چکی ہے ای۔"

"ای انتظار کر رہی ہوں گی۔ انہیں دوا دینی ہوگی۔ دیکھ لیا آپ نے میری بات کا پروف وہ بھی فی البدایہ۔" اس نے فوراً ہی سارہ کی بات پکڑی تو پنکی بے اختیار ہنس پڑی۔

"آپ بہت برجستہ گفتگو کرتے ہیں۔ سچی مزہ آ جاتا ہے آپ سے مل کر۔" پنکی کی بات پر سارہ نے پنکی کو گھور کر دیکھا اور پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔

"تھینک یو بے بی۔"

"میں بے بی نہیں ہوں۔ آنرز کر رہی ہوں۔ پچھلی بار بھی آپ کو بتایا تھا۔" پنکی نے فوراً احتجاج کیا تو سونیا نے کچھ چونک کر پنکی کی طرف دیکھا سارہ جو دو قدم ہی آگے بڑھی تھی، رک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"ارے مائنڈ کیوں کرتی ہو، تم ماسٹر بھی کر لو، میرے لیے تو بے بی ہی رہو گی، میری بھتیجی ماہا بھی تمہاری ہم عمر ہے، میں اسی کے خیال میں تمہیں بھی کہہ جاتا ہوں۔" عزم نے کچھ شرمندگی سے کہا۔

"جناب! میں خیال نہیں حقیقت ہوں۔ فائیو فور انچ کی۔" وہ شوخی سے بولی۔

"انس او کے۔ نیکسٹ ٹائم بی کیئرفل۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر سارہ کی طرف بڑھی۔ چکن کے پنک بیل باٹم اور وائٹ کرتے میں اس کی چال میں عجب بانکپن تھا شولڈر کٹ گھنگھریالے بال سنہری لچھوں کی طرح اس کی دودھیا گردن اور چہرے کے گرد ہلکورے لیتے کتنے خوبصورت لگ رہے تھے، سارہ کو ایک دم ہی احساس ہوا کہ پنکی تو بہت کیوٹ ہے۔ ایک بھتیجی کی طرح نہیں ایک نوخیز دوشیزہ کی طرح۔ سونیا اور عزم باتیں کرتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔

"آپی! آج شام کو تو آنا مشکل ہے۔ پر اس نیکسٹ ٹائم آپ جب بھی آئیں گی۔ مجھے فون کر دیں، میں ضرور آؤں گا، بلکہ آ جائیں میری طرف...... آج شام کو ہی۔"

"نہیں بھئی۔ ابھی نہیں۔ آنٹی آ جائیں تو پھر ہم تمہاری شاندار سی دعوت قبول کریں گے۔" سونیا بے تکلفی سے بولی۔ اس کے دل نے عزم کو سارہ کے لیے او کے کر دیا تھا۔

"بہت شاندار، واقعی۔" عزم نے دہرایا۔ "او کے آنٹی کو میرا اسلام کہیے گا۔ میں ایک دو دن میں چکر لگاؤں گا۔ اور ہاں انس کا کچھ پتہ چلا؟" وہ چلتے چلتے رک گئے تھے، سارہ گاڑی کا لاک کھول

رہی تھی، اس کے ہاتھ وہیں تھم سے گئے۔

"نہیں بالکل بھی نہیں۔" سونیا کا پرملال لہجہ، سارہ لاک کھول کر گاڑی میں بیٹھی۔ اس کے زخم رسنے لگے تھے، ابھی زخم پر کھرنڈ بھی نہیں آتا تھا کہ کوئی انس کا پوچھ کر بے دردی سے اس کھرنڈ کو کھرچ ڈالتا تھا، وہ نم آلود آنکھوں سے مال روڈ کی پر رونق سڑک کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

انس اور سارہ کی عمروں میں تین چار سال کا فرق تھا، جبکہ انس اور عامر بھیا کی عمروں میں تقریباً آٹھ سال کا فرق تھا، ناصر بھیا، عامر اور سونیا آپی کا گروپ ان دونوں سے عمر میں بھی بڑا تھا اور سوچ میں بھی۔ اس لیے سارہ اور انس میں تین چار سال کا فرق ہونے کے باوجود بے حد دوستی تھی، دونوں کا اسکول بھی چھ سال تک ایک ہی رہا تھا، جب تک انس اسکول میں رہا، سارہ نے نہ کلاس میں نہ اسکول میں کسی اور سے دوستی کی۔ صبح دونوں اکٹھے اسکول جاتے، بریک میں اکٹھے لنچ کرتے اور واپسی بھی دونوں کی ساتھ ساتھ ہوتی تھی، پھر جب ایٹتھ میں انس نے سائیکل پر اسکول جانا شروع کیا تو سارہ اس کے ساتھ اس کی سائیکل پر بیٹھی ہوتی۔

پہلے دن تو انس نے اسکول کے آدھے راستے میں جب سارہ کا بوجھ بلکہ دونوں کے بھاری بھرکم اسکول بیگز کے بوجھ سے سائیکل ڈگمگائی اور پھر انس کے بے حد قابو پانے کے باوجود سائیکل الٹ گئی اور سارہ بیچ سڑک منہ کے بل گری تھی۔ اسے اپنی چوٹوں میں درد تو بعد میں ہوا، پہلے اپنی بیچ سڑک میں گرنے سے ہونے والی انسلٹ کا احساس ہوا اور پھر یہ احساس کہ اسے انس نے گرایا ہے۔ اس کے اکلوتے عزیز پیارے دوست، بھائی نے تو اس کو مارے رنج اور طیش کے کچھ یاد نہیں رہا، سوائے ان مغلظات کے جو وہ سڑک پر اوندھی پڑی انس کی شان میں کہہ رہی تھی۔ راہ میں آتے جاتے پیدل سوار سارہ کی گالیوں اور انس کی کھسیانی حالت سے خوب ہی محظوظ ہوئے تھے۔

"پلیز معاف کر دو۔ سوری دیکھو میری غلطی نہیں تھی۔ تم نے پہلو بدلا تھا سائیکل کو ابو کی گاڑی سمجھ...... نہیں۔" اس نے لجاجت سے ساری غلطی سارہ کے کھاتے میں ڈالنا چاہی۔

"ہاں۔ میں تمہاری پیجارو میں بیٹھی تھی نا۔ ہوائی جہاز کی آرام دہ سیٹ تھی نا جس پر میں پہلو بدل رہی تھی، وہ زور سے ہاتھ نچا کر چلائی۔" چلے جاؤ تم یہاں سے۔ مجھے جہاں جانا ہوگا۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔"

وہ اتنی زور سے چیخی کہ انس ڈر کر دو قدم دور ہٹ گیا۔ وہ روتے ہوئے بمشکل خود ہی اٹھی۔ گھٹنے میں تیز چبھن اور درد کا احساس ہوا تھا، ذلیل الو! ای ابو کو بتاؤں گی، آئندہ کبھی تم سے بات کی تو میرا

نام بدل دیا۔" اس نے لنگڑا لنگڑا کر گھر کی طرف پیدل چلنا شروع کر دیا۔ اب اسکول جانے کی تو حالت نہ تھی، انس سر جھکائے دونوں بیگز سائیکل سے لگائے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"سارہ! آج تمہارا میتھس کا ٹیسٹ ہے۔ دو گی نہیں۔" انس کو معلوم تھا ابو ابھی گھر پر ہیں۔ سارہ کو یوں مجروح حالت میں دیکھ کر جو درگت ان کے ہاتھوں انس کی بنے گی۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ سارہ اسکول چلی جائے۔

"تم دے دو جا کر میرا ٹیسٹ۔" وہ تڑخ کر بولی اس کی طرف دیکھے بغیر۔

"اور تمہارا سوشل اسٹڈی کا بھی ٹیسٹ ہے، اس کی ٹیچر تمہیں معلوم ہے، ٹیسٹ نہ دینے پر کتنی سخت سزا دیتی ہیں سارے اسکول کے سامنے۔" انس نے پھر اسے ڈرایا سوشل اسٹڈی کی ٹیچر واقعی بہت سخت تھیں۔ سارہ کے قدم ذرا سست پڑ گئے۔ ٹیسٹ تو اس کا تیار تھا، وہ سوچنے لگی، مگر اسکول کیسے جائے گی۔ اسکول تو خاصا دور ہے اور انس کے ساتھ...... کبھی نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا اور تیز تیز چلنے لگی۔

"تمہیں سامنے کروں گی مس گلناز کے۔" وہ مڑ کر بولی تو انس بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔

"سارہ پلیز، ابو کو کچھ نہ بتانا۔" اب اسے واحد رستہ منت سماجت کا نظر آیا۔

"تم گھر تو چلو۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ "بہتر ہے، اسکول چلے جاؤ ورنہ آج کا دن تمہاری زندگی کا تاریک ترین دن ہوگا۔" وہ دھمکا کر بولی۔

"سارہ! ہم دونوں دوست بھی تو ہیں۔" وہ لجاجت سے بولا۔

"تھے...... ہیں نہیں۔" وہ غصے سے بولی۔ "اس دوستی کو اب گئے دنوں کی یاد سمجھو۔"

"سارہ! میری اچھی بہن۔" وہ اب اس کے برابر چل رہا تھا۔

"سڑک پر گراتے وقت تو یاد نہیں آیا تھا تمہیں کہ میں تمہاری دوست، بہن، ہمسائی۔ کچھ ہوں بھی کہ نہیں، ہائے۔" اس کی کہنی میں درد کی لہر اٹھی۔

"سوری یار! میں نے جان بوجھ کر تو......"

مگر سارہ نے اس کی کوئی سوری قبول نہیں کی، اور واقعی ابو نے ساری بات سن کر انس کو چار چانٹے جڑے تھے، وہ اسے تاعمر یاد رہے۔ چار تھپڑوں نے اسے اچھی طرح چاروں سمتیں یاد کرا دی تھیں، اچھل اچھل کر ہر تھپڑ پر وہ کمرے کے چاروں جانب گرا تھا۔ ابو کی گڈ بکس میں تو وہ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ عمر بھیا اور ناصر بھیا کی طرح کبھی اس کی رپورٹ ایکسیلینٹ نہیں ہوتی تھی۔

"آئندہ تم اس کے ساتھ اسکول نہیں جاؤ گی، چلے ہیں حضرت ابھی سے ٹارزن بننے۔ پہلے اپنا بوجھ تو اٹھانا سیکھ لو پھر بہن کا بھی ڈھو لینا۔ نالائق کہیں کا۔"

ابو نے فیصلہ صادر فرمایا۔ انس اپنے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے کمرے میں بھاگ گیا اور شام تک کمرے سے نکلا ہی نہیں اور سارہ کا غصہ تو ایک گھنٹے بعد ہی اتر گیا تھا اور درد، پین کلر کھانے سے اور دوا لگانے سے زخم ٹھیک ہو گیا تھا، اب اسے انس نظر نہیں آ رہا تھا تو کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بیڈ پر بھی جیسے کانٹے اگ آئے تھے، وہ پیر جلی بلی کی طرح اس کے کمرے کے باہر پھر رہی تھی۔

"امی! انس کو باہر بلائیں نا، اس نے کھانا نہیں کھانا۔" آخر اس سے صبر نہ ہو سکا تو کچن میں شام کی چائے تیار کرتی امی سے جا کر بولی۔

"وہ تو میں دو گھنٹے پہلے ہی اس کے کمرے میں دے آئی تھی۔" امی کباب تلنے میں مصروف تھیں، مڑے بغیر بولیں تو وہ مایوس ہو کر باہر آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد انس خود ہی باہر چلا آیا۔ پھولا ہوا ناراض چہرہ لیے وہ لاؤنج میں ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا۔ سارہ بے چینی سے اس کے ارد گرد منڈلانے لگی۔ انس نے توجہ نہ دی۔

"انس! وہ مجھے میتھس کا کام تو کرا دو۔" آخر اس کو بہانا سوجھ ہی گیا پاس آ کر بیٹھ گئی۔ انس نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی اور پھر منہ ٹی وی کی طرف کر لیا۔

"انس! آئی ایم سوری۔ ابو تمہیں اتنا ماریں گے۔ مجھے علم نہیں تھا۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"نہیں نہیں۔ تمہیں تو یقین تھا، اس سے بھی زیادہ ماریں گے، اب تمہیں دکھ ہو رہا ہے کہ ابو نے صرف چار چانٹے کیوں مارے۔ مولا بخش کیوں نہ منگوالیا۔" وہ طنز سے بولا۔

"سوری بھائی! مجھے اتنی تکلیف تھی، اس لیے میں نے ابو سے تمہاری شکایت لگائی ورنہ پہلے کبھی میں نے اس طرح تمہاری شکایت لگائی ہے۔"

"پہلے کبھی میرے ساتھ سائیکل پر جو نہیں بیٹھیں۔" وہ جتا کر بولا۔

"کل سے تو تم عامر بھیا کے ساتھ جاؤ گی۔ آؤ گی بھی ان کے ساتھ۔ بریک میں کوئی دوست بھی بنا لینا، جب راستے الگ الگ تو دوستی بھی ختم۔" انس نے ہاتھ اٹھا کر معاملہ ہی تمام کر دیا۔

سارہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے اکلوتے دوست کو دیکھا۔

"انس! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میری تمہاری دوستی یوں ختم ہو سکتی ہے۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔ بات اس کے دل کو جا لگی تھی، وہ اور انس الگ، الگ نا قابل یقین۔ انس کا دل تو اس کے آنسو دیکھ کر ہی پگھل گیا تھا۔

"اچھا چپ کر جاؤ روؤ تو نہیں۔ دوسرے پل وہ اس کی طرف مڑ کر بولا بے اختیار اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سی۔" سارہ کے منہ سے نکلا۔ کچا زخم دکھ گیا تھا۔

"اوہ سوری۔ چلو کل سے اکٹھے چلیں گے پیدل اور واپسی بھی اکٹھے اور دوستی بھی قائم۔ اب تو چپ کر جاؤ۔" وہ اس کے آنسوؤں سے ہراساں ہو گیا تھا۔

"پیدل نہیں سائیکل پر۔ کل سے تم احتیاط سے سائیکل چلاؤ گے۔" انس سے دوستی کی خوشی میں سارہ تکلیف بھول گئی تھی۔

"واقعی تو ملاؤ پھر ہاتھ۔ دونوں آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔ میری پاکٹ منی آج ویسے ہی پڑی ہے۔" سارہ نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اب یہ تم دونوں میں صلح بھی ہو گئی۔ صبح تو دھواں دھار جنگ تھی۔" سونیا آپی لاؤنج سے گزریں تو دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ دیے بیٹھے دیکھ کر بولیں۔

ہم تم میں لڑائی ہو گی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی

دونوں یک زبان ہو کر ہنستے ہوئے بولے۔

☆☆☆

"ارے پھپھو! آپ ادھر ہیں۔ دادو آپ کو یاد فرما رہی ہیں، عزمی صاحب آئے بیٹھے ہیں ان کے پاس۔" پنکی اس کے پاس آ کر بولی تو وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکی ڈھلتے سورج کی ترمزی شعاعیں سارے ٹیرس پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، اس نے سر اٹھا کر آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھا جو شام ہونے سے پہلے اپنے گھونسلوں تک پہنچنے کے لیے کوشاں تھے۔ اس نے چپکے سے آنکھوں میں آئی نمی کو ہتھیلیوں میں جذب کیا۔

"پھپھو! آپ رو رہی ہیں۔" پنکی آگے کو جھکی اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے۔

"نہیں تو بالکل بھی نہیں۔" وہ سر جھکا کر ٹیرس کے نیچے نظر آتے گیرج کی طرف دیکھنے لگی، وہاں تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ابو نے جب گھر بنایا تو اس جگہ چھوٹا سا لان تھا ہری بھری گھاس کے اس چھوٹے سے قطعے کے ارد گرد کیاریاں تھیں۔ ابو نے اس میں گلاب کی قلمیں لگائی تھیں سرخ سفید اور پیلے گلاب کی۔ ایک لیموں کا پیڑ تھا۔ ایک آم کا اور ایک امرود کا، مگر یہ خوشبو بھرا قطعہ صرف چند سال ہی ادھر ہریالی دکھا سکا تھا۔ پہلے ناصر بھیا نے گاڑی لی تو گھاس والے قطعے کو ختم کر دیا گیا، اور پختہ گیرج بنا دیا گیا، صرف پھولوں کی کیاریاں رہ گئیں، بعد میں عامر بھیا نے بھی گاڑی لی تو پھولوں کی کیاریاں بھی ختم کر دی گئیں۔ نیچے بلیک ٹائلوں کا خوبصورت پختہ فرش تھا۔ اور گزرے دنوں کی یادوں کی خوشگوار مہک

اور بس۔

"ہاں۔ تم کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔

"میں نے کیا کہنا ہے۔ وہ دیکھیں عزمی صاحب جا رہے ہیں۔ دو تین بار آپ کا پوچھا۔ آپ ادھر تھیں۔ میں نے ہی کمپنی دی۔" نیچے کھڑے گیٹ کے باہر گرے کرولا کا لاک کھولتے ہوئے عزم مصطفیٰ نے غیر ارادی طور پر اوپر دیکھا تو سارہ کو اپنی طرف دیکھتے پا کر بے اختیار مسکرا دیا، سارہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

"چلو، نیچے چلتے ہیں۔" وہ مڑ کر پنکی کو دیکھے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اس روز شام کے چھ بجے تھے جب امی کی طبیعت بالکل اچانک اور بہت زیادہ خراب ہو گئی حالانکہ صبح ہی گلوکومیٹر سے اس نے امی کی شوگر چیک کی تھی۔ خون اور یورین دونوں میں لیول بالکل نارمل تھا۔ سارا دن کوئی بد پرہیزی بھی نہیں کی تھی، اور کوئی نئی اچانک دل دکھانے والی کچھ بھی تو ایسی بات نہیں ہوئی تھی، اور امی کا رنگ دھلے لٹھے کی طرح سفید ہوا جا رہا تھا، آنکھیں جیسے باہر ابل ابل کر آ رہی تھیں اور ان خوفزدہ آنکھوں میں جو دہشت لرزاں تھی اس نے سارہ کے ہاتھ پاؤں ہی پھلا دیے۔ امی کا جسم جیسے برف کا تودہ بنتا جا رہا تھا۔ بالکل یخ اور بے جان۔

گھر پر سارہ، پنکی، سیما بھابھی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ طلحہ دو روز سے ٹیکسلا اور اس کے مضافات کی طرف مطالعاتی دورے پر گیا ہوا تھا۔

غزل بھابھی کی کزن کی شادی تھی حیدر آباد۔ عامر بھیا، اور غزل بھابھی بچوں کے ساتھ کل سے ادھر جا چکے تھے، ناصر بھیا آج صبح ہی اسلام آباد گئے تھے، ان کی واپسی بھی رات گئے یا اگلے دن ہی متوقع تھی، ویسے بھی ان تینوں میں سے کوئی گھر پر بھی ہوتا تو بھی امی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا، چیک اپ کروانا، دوائیں دینا سارہ کی درد سری تھی، "پھر میں اس قدر کیوں گھبرا رہی ہوں۔" یہ بات سوچ کر اس نے خود کو مضبوط کیا، اور امی کو نیچے اتارنا ہی سب سے بڑا اور کٹھن مرحلہ تھا۔

"اس دفعہ جو مرضی ہو جائے۔ میں ناصر بھیا سے خود کھل کر بات کروں گی یا تو ہمیں نیچے کوئی کمرہ دیں یا کوئی اور متبادل انتظام کریں۔ امی کی طبیعت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے اور یوں انہیں نیچے لانا بے حد مشکل کام ہے۔" وہ پنکی اور سیما بھابھی کے ساتھ امی کو نیچے لاتے ہوئے دل میں پکا عہد کر رہی تھی۔ امی کا بے جان جسم سیڑھیوں سے نیچے گرا جا رہا تھا، اور تینوں سے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، دل میں درود شریف کا ورد کرتے وہ بالآخر انہیں نیچے اور پھر گاڑی تک لے ہی آئیں۔

"بھابھی! آپ گھر پر رہیں۔ میں اور پنکی لے جاتے ہیں میں نے ڈاکٹر خان کو فون کر دیا ہے۔ وہ کلینک آ چکے ہیں۔"

وہ جلدی جلدی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سیما بھابھی سے بولی۔ پنکی پہلے ہی پچھلی سیٹ پر امی کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔

"چلیں پھپھو! جلدی کریں۔" پنکی امی کی ہتھیلیاں سہلاتے ہوئے بولی امی کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

"جاتے ہی مجھے فون کر دینا۔ مجھے فکر رہے گی۔" گیٹ کے پاس سیما بھابھی نے انہیں آواز لگائی۔

"انہیں فوراً ہارٹ کیئر سینٹر لے جائیں فوراً۔" ڈاکٹر خان نے امی کو گاڑی میں چیک کر لیا اور بولے۔ گھبراہٹ ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! سب خیریت ہے نا؟" سارہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔

"خیریت ہی ہے بالکل، لیکن اب دیر نہ کریں انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔ ہارٹ میں معمولی سی پرابلم ہوئی ہے۔ وہ لوگ بہتر طور پر ری کور کر لیں گے۔ اب جلدی کرو ہری اپ۔" ڈاکٹر صاحب نے پچھلا دروازہ بند کر دیا اور خود پیچھے ہٹ گئے تو اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مڑ کر امی کے نیم مردہ وجود کو دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

ہارٹ کیئر سینٹر تقریباً شہر سے باہر پر سکون علاقے میں بنا ہوا تھا۔ ٹریفک کا رش، سگنلز کی بھر مار انہیں سینٹر پہنچتے پہنچتے ہی گھنٹہ لگ گیا امی کی فوری طور پر ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔

"ابھی ٹھہر جاؤ۔ آئی سی یو کا سن کر بھابھی پریشان ہو جائیں گی۔ دیکھتے ہیں ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔" اس نے خود کو سنبھال لیا تھا، دل مسلسل امی کی خیریت کے لیے محو دعا تھا، ذہن کی سوچوں کی سب پروازیں سمٹ کر اس ایک دراز ے کا طواف کر رہی تھیں، جس کے پیچھے امی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ ان کی حالت اب کافی حد تک خطرے سے باہر ہے، لیکن ابھی ہم انہیں آئی سی یو میں ہی رکھیں گے۔" آدھے گھنٹہ بعد ڈاکٹر نے آ کر بتایا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا ہوا ہے امی کو۔ ان کو شوگر ہے، اس کا لیول تو بالکل نارمل تھا۔ انہیں انجائنا کی تکلیف ہوئی تھی اور آئی سی یو میں ہم انہیں اس لیے رکھ رہے ہیں، خدانخواستہ ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ بہر حال آپ دعا کریں، ویسے ابھی وہ کافی بہتر ہیں۔ آپ انہیں دیکھ سکتی ہیں مگر بات نہیں کریں گی۔" ڈاکٹر انہیں تسلی دے کر چلا گیا تو دونوں اندر آ گئیں۔ امی آنکھیں موندے شاید سو رہی

تھیں، دونوں بازوؤں میں ڈرپ لگی تھیں۔

"انہیں مکمل ریسٹ کی ضرورت ہے، انہیں کوئی شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے جو اس تکلیف کا باعث بنا ہے۔" امی کو دیکھتے ہوئے اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی چند لمحے پیشتر کی باتیں گونجیں۔

"صدمہ۔" ایک آہ سی اس کے منہ سے نکلی تھی۔

"پھپھو، باہر چلتے ہیں، سسٹر کہہ رہی ہے۔" پنکی کے کہنے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نرس انہیں باہر جانے کا اشارہ کر رہی تھی، دونوں باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"میں مما کو فون کر آؤں۔" پنکی اٹھ کر چلی گئی۔

"ڈاکٹر صاحب! امی کو رات ادھر ہی رکھیں گے؟۔" دو گھنٹے بعد ڈاکٹر راؤنڈ پر آئے تو سارہ نے پوچھا۔

"جی بی بی! آج رات کو ادھر ہی رکھیں گے، ویسے ابھی وہ خطرے سے باہر ہیں۔" ڈاکٹر کہہ کر نرسنگ روم میں چلے گئے۔"

"پنکی! تم گھر چلی جاؤ مگر کیسے جاؤ گی۔ تمہیں تو ڈرائیونگ بھی نہیں آتی، رات کے دس بج رہے ہیں، اس وقت تو ادھر سے پبلک کنوینس سے بھی جانا ٹھیک نہیں۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"پھپھو! میں ادھر ہی ہوں۔ کہیں نہیں جا رہی۔ دادو میری بھی کچھ لگتی ہیں، صرف آپ کی مدر نہیں۔" پنکی برا مان کر بولی اور خفگی سے منہ پھیر لیا۔

"سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا، یار! تم یونیورسٹی سے تھکی ہاری تین بجے تو آئی تھیں۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا، آتے ہی میرے ساتھ دوڑ پڑیں۔ اچھا ناراض تو مت ہو۔" سارہ نے فوراً اس کا کندھا اپنی طرف گھمایا۔

"ہائے پھپھو۔" وہ فوراً مان جاتی تھی، اس وقت بھی پل بھر میں مان گئی۔

"کیا ہوا؟" سارہ گھبرا گئی۔

"کھانا۔" اس نے ہاتھ سے پیٹ دبایا۔ "قسم سے انتڑیوں بل کھا رہی ہیں بلکہ ایک دوسرے کو کھا جانے پر آمادہ نظر آ رہی ہیں، اگر تھوڑی دیر تک مجھے کچھ کھانے کو نہ ملا۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ آپ نے سوئی بلا کو جگا دیا ہے یاد کروا کے۔ کریں اب اس کے "کھانے" کا انتظام۔" پنکی تو پہلے ہی بھوک کی کچی تھی۔ اوپر سے چھ سات گھنٹوں سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔

"کینٹین چلتے ہیں۔ دیکھتے ہیں ادھر کیا ہے۔" سارہ نے تسلی دی۔

"کچھ بھی نہیں ہے۔ میں فون کرنے گئی تھی۔ وہ اپنے برتن دھو رہا تھا جس میں اس نے آلو

میٹھی، ماش کی دال اور ابلی ہوئی سبزیاں پکائی تھیں۔ یہ ہارٹ سینٹر ہے نا۔ مرغن غذائیں منع ہیں۔ وہ بھی سب بک بکا گئے۔ اس کے پاس تو چائے بھی نہیں اور یہ ہاسپٹل تو ہے بھی اللہ میاں کے پچھواڑے، اب کیا کریں۔ پوری رات پڑی ہے، پنکی نے ہولناک تصویر کشی کی۔

''تم آؤ تو سہی، دیکھتے ہیں، کینٹین سے کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔'' سارہ اس کا ہاتھ تھام کر چل پڑی۔

''کینٹین واقعی ویران پڑی تھی۔ پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''لگتا ہے، ادھر ساڑھے دس نہیں، ساڑھے دو بج چکے ہیں۔ بھئی کھانا کچھ نہیں ملے گا۔'' سارہ نے اس کا کیبن بجایا۔

''باجی! اب تو کچھ نہیں ہے، یہ بسکٹ کے پیکٹ ہیں۔ یہ لے لیں۔''

''اور چائے۔'' پنکی فوراً بولی۔

''وہ تو جی اب صبح ہی ملے گی۔'' وہ کچھ بے چارگی سے بولا۔

''یہ ہاسپٹل والوں نے کیسی کینٹین بنا رکھی ہے۔ مریض تو چلو بستر پر پڑا ہوتا ہے، اس کے اٹینڈنٹ تو ادھر بھوکے مرتے ہوں گے۔'' پنکی بولی۔ لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر ادھر کھڑے رہنے کے بعد دونوں بسکٹ کے پیکٹ لے کر آ گئیں۔

''کیسے ظالم لوگ ہیں، بھوکا مارتے ہیں۔ ہمیں بھی کیا خبر تھی، آتے ہوئے کچھ لے ہی آتے۔ نکلے بھی تو ایمرجنسی میں تھے۔ سوکھے بسکٹ حلق سے بھی نہیں اتر رہے، چائے ہی مل جاتی۔'' پانی کے ساتھ بسکٹ کھاتے ہوئے پنکی مسلسل بولے جا رہی تھی، دھیان امی کی طرف تھا۔ رات کے ڈھائی بجے تھے، دونوں ایک ہی صوفے پر سکڑی سمٹی نیم غنودگی میں تھیں، جب نرس نے انہیں جھنجوڑ کر جگایا۔

''بی بی! آپ کی والدہ کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ یہ دوائیں فوری طور پر چاہئیں۔ ہاسپٹل کے اسٹور سے نہیں ملیں گی، باہر سے لے کر آئیں، جلدی جائیں۔'' دوائیوں کا ایک بڑا نسخہ نرس انہیں تھما کر آئی سی یو میں چلی گئی۔

''کک...... کیا ہوا امی کو...... پنکی! یہ دوائیں......'' سارہ کے تو جیسے حواس ہی کام کرنا چھوڑ گئے۔

''کیسے عجیب سے لوگ ہیں۔ جنگل میں ہاسپٹل ہے، کینٹین ندارد، اسٹور میں دوائیاں ندارد۔ کدھر آ گئے ہیں۔ پھپھو! ادھر تو مریضوں کو مارنے کا پکا پکا انتظام ہے بلکہ ان کے ساتھ آنے والوں کو بھی۔'' پنکی جھلا کر اٹھی۔ ''لائیں مجھے دیں، میں دیکھتی ہوں۔''

''کدھر جاؤ گی، میں چلتی ہوں۔ دونوں گاڑی میں جاتے ہیں۔'' سارہ اس کے پیچھے لپکی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔ ایک دفعہ خود چیک کر لوں، نہ ملیں تو پھر دیکھیں گے۔'' وہ کہتے ہوئے تیز قدموں سے چلی گئی۔

''اسے گئے آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا، سارہ کو فکر لاحق ہونے لگی۔

''بی بی! دوائیں نہیں آئیں۔'' وہی نرس پھر سر پر تھی۔

''میری امی کیسی ہیں؟''

''دعا کریں، ڈاکٹر ٹریٹمنٹ کر رہے ہیں۔ دوائیں......'' اس نے ہاتھ پھیلایا۔

''وہ لینے گئی ہے، میں دیکھتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے باہر جانے لگی کہ سامنے سے پنکی کے ساتھ عزم مصطفی کو آتے دیکھ کر رک گئی۔

''سسٹر! میری دادو ٹھیک ہیں، یہ دوائیں۔'' پنکی تقریباً بھاگتے ہوئے آئی تھی۔ دواؤں کا لفافہ نرس کو تھما کر بولی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، دوائیں لے کر آئی سی یو میں چلی گئی۔

''السلام علیکم۔'' پاس بیٹھ کر عزم مصطفی نے کہا۔

''کیسی ہے اب آنٹی کی طبیعت؟''

''معلوم نہیں۔'' وہ سر جھکا کر آنکھوں میں آئی نمی کو چھپا کر بولی۔

''آپ دونوں ادھر اکیلی تھیں تو کم از کم مجھے ہی فون کر دیتیں۔''

''خیال ہی نہیں آیا۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ہاں، آپ ساری نیکیاں اپنے کھاتے میں ہی لکھوانا چاہتی ہیں۔'' اس کے کہنے پر سارہ نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

''شکر ہے، اسٹور پر فون موجود ہے، میں نے انہیں فون کیا۔ بے چارے فوراً بھاگے آ گئے اور بڑا میڈیکل اسٹور، یہ ہاسپٹل کے بالکل قریب ہے۔ پیدل بھی پانچ منٹ کا رستہ ہے۔'' پنکی اسے بتا رہی تھی، وہ چپ رہی۔

پھر آدھ گھنٹہ بعد ڈاکٹر نے آ کر بتایا کہ اب ان کے پیشنٹ کی حالت بہتر ہے۔

''آپ انہیں دیکھ سکتی ہیں مگر ابھی وہ سو رہی ہیں، آپ ان سے بات کرنے یا جگانے کی کوشش نہ کیجئے گا اور ایک ایک کر کے اندر جائیں۔'' ان تینوں کو دیکھ کر ڈاکٹر نے آخری ہدایت کی۔ وہ تینوں باری باری جا کر امی کو دیکھ آئے۔

ایک ہی رات میں امی کس قدر کمزور اور نڈھال سی ہو گئی تھیں۔ سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا

تھا۔ کمزور تو وہ ان دو تین سالوں میں کافی ہو چکی تھیں مگر آج کل...... سارہ انہیں دیکھتے ہوئے بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی تو پنکی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔

"میں آپ دونوں کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔" عزم انہیں باہر بٹھا کر چلا گیا۔

ڈس پوزیبل گلاسوں میں گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے، چکن رول اور کلب سینڈوچ لیے وہ تھوڑی دیر میں آ گیا تھا۔

"اف مزہ آ گیا، آپ کا نام تو عزم کی بجائے غیبی مدد ہونا چاہیے۔" پنکی خوشی سے بولی اور جلدی جلدی کھانے لگی۔

"سارہ! آپ بھی کھائیں نا۔" عزم نے خالی چائے پیتے دیکھ کر سارہ سے کہا۔

"نو تھینکس، اس وقت کچھ نہیں۔"

"آپ دونوں نے تو شاید رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔" پنکی کو ندیدوں کی طرح دو رولز کھانے کے بعد سینڈوچ کھاتے دیکھ کر عزم نے کہا۔

"کھانا کیا تھا، اس جنگل میں ملتا کیا ہے۔ میں تو جانے سے پہلے اس ہاسپٹل کے کان کھینچ کر جاؤں گی، دیکھیے گا آپ۔" سب کچھ کھا چکنے کے بعد چائے ہاتھ میں لیتے ہوئے پنکی نے کہا۔ سارہ تو ایک رول ہی کھا سکی تھی، اس کا گلا بری طرح سے دکھ رہا تھا۔

"بالکل، میں اس نیک کام میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" عزم نے فوراً کہا۔

پھر تینوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ اسی وقت فجر کی اذان سنائی دی۔

"اب تو اللہ کا شکر ادا کیجیے آنٹی کافی بہتر ہیں۔ میرا خیال ہے، آپ دونوں ذرا دن طلوع ہوتا ہے تو گھر چلی جائیں۔ میں آنٹی کے پاس ہوں۔" عزم نے ان دونوں کے ستے ہوئے چہرے دیکھ کر کہا۔

"آپ پنکی کو لے جائیں، میں امی کے پاس رہوں گی۔"

"آئیں عزی! چائے کا ایک ایک کپ اور لے کر آتے ہیں پھر بیٹھ کر فیصلہ کرتے ہیں، کون رہے گا، کون کون جائے گا۔" پنکی اٹھتے ہوئے بولی۔

"ارے لڑکی! معلوم ہے، میں تم سے کتنا بڑا ہوں۔ عزمی عزمی یوں کہتی ہوں جیسے ہم دونوں بچپن میں کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔" وہ اس کے پیچھے جاتے ہوئے بولا۔

"دونوں یوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچھے لگ رہے ہیں۔" سارہ نے دونوں کو اکٹھے جاتے دیکھ کر بے اختیار سوچا سونیا آپی کی بات یاد آ گئی تھی۔ پنکی اب بڑی ہو گئی ہے۔ وہ اس کے سڈول بدن

اور بھرپور سراپے کو دیکھ کر سوچنے لگی۔

"یہ لیں مس بقراطن۔ چائے۔" عزم کی آواز اور چائے کے کپ نے اسے چونکا دیا۔

"یہ پنکی کدھر رہ گئی؟" کپ ہاتھ میں تھام کر اس نے پوچھا۔

"اس کی کوئی فرینڈ مل گئی تھی جس کے انکل ادھر ایڈمٹ ہیں۔ ادھر گپ شپ لگانے کھڑی ہو گئی ہے۔" عزم کے جواب پر وہ چپ ہو گئی۔

"سارہ! آپ کیا سوچتی رہتی ہیں؟" چند لمحوں بعد اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کچھ تو ہے۔ ایک سوچ کا جہاں جو آپ کی ان اداس آنکھوں میں جھانکتا رہتا ہے اور دیکھنے والے کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے آپ کچھ خاص سوچتی رہتی ہیں۔ کیا......؟"

"ارے کچھ بھی نہیں۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ "کچھ بھی تو نہیں، مجھے کیا سوچنا ہے۔" وہ چائے سے اٹھتی بھاپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"آنٹی کی طبیعت اچانک کیوں خراب ہو گئی؟ پرسوں شام میں آیا تھا، بالکل ٹھیک تھیں۔" اس نے موضوع بدلا۔ وہ چند لمحے چپ رہی۔

"کل...... کل...... انس کا برتھ ڈے تھا......" وہ کہتے کہتے ایک دم سے رو پڑی تو عزم بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

"میرا دل چاہتا ہے ان ڈگریوں کو آگ لگا دوں یا پھر خود کو۔" انس نے اپنے ڈاکومنٹس کا خاکی لفافہ سامنے صوفے پر زور سے اچھالا اور پھر خود کاؤچ پر ڈھیر ہو گیا۔ سارہ نے اس کے مایوس پژمردہ اور تلخ چہرے کو دیکھا۔

"اتنی دیر لگا دی۔" رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ دونوں بھابیاں اور بھائی اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ابو، امی اپنے کمرے میں تھے۔ ایک وہی تھی جو انس کے انتظار میں جاگ رہی تھی کہ وہ آئے تو اسے کھانا دے کر سوئے۔

"شکر کرو، آ گیا ہوں۔" اس نے تلخی سے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

"مل جائے گی نوکری، تم اس قدر ٹینس کیوں ہوتے ہو۔ ابھی تو تمہیں سال بھر ہی ہوا ہے جاب تلاش کرتے ہوئے۔"

"صرف سال بھر......" وہ سر اٹھا کر چلایا۔ "سارہ بی بی! اس سال بھر میں اپنی حیثیت،

اوقات اور وزن سب کا علم ہوگیا ہے مجھے۔ کیا ہوں میں، شاید ایک تنکے سے بھی ہلکا جسے حالات کا ایک معمولی جھونکا جب چاہے پھونک مار کر کہیں بھی اڑا لے جاسکتا ہے۔'' اس نے جوتے اٹھا کر کمرے کے دروازے کی طرف اچھالے۔

''کیا کر رہے ہو، سب سو رہے ہیں۔'' سارہ نے اسے ٹوکا۔

''اور جو میرا نصیب سو رہا ہے، اس کی تکلیف صرف مجھے ہے۔''

''میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں، تم منہ ہاتھ دھو لو۔ چائے پیو گے نا، میں بھی پیوں گی۔''

جاتے جاتے سارہ نے پوچھا تو انس نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ باہر نکل آئی۔ کھانا انس نے خاموشی سے کھایا۔ سارہ نے بھی کچھ نہ پوچھا۔

''چائے ذرا اسٹرونگ بنانی تھی۔ سر میں بہت درد ہے۔'' چائے کا مگ اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔

''کوئی ٹیبلٹ لا دوں۔'' سارہ نے ہمدردی سے اس کے تھکے تھکے سے وجود کو دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

''آپ کہاں گئے تھے۔'' سارہ نے یونہی پوچھا۔

''مت پوچھو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔''

''آخر کیوں پریشان ہو، مل جائے گی جاب۔ تم کیا خدانخواستہ بھوکے مر رہے ہو یا تمہارے بچے فٹ پاتھ پر سو رہے ہیں۔'' سارہ جھنجلا کر بولی۔

''یہی حال رہا تو یہ نوبت بھی آجائے گی۔ ابو کی بات سنی تھی صبح تم نے ناشتے کی میز پر۔''

''کیا؟''

''نوکریاں ان کو نہیں ملا کرتیں جن کو گھر میں مفت کی مل رہی ہوتی ہے۔ دو تین فاقے کرنے پڑیں، چوتھے دن نوکری مل جائے گی۔ کیا میں نہیں سمجھتا وہ کسے کہہ رہے تھے۔ وہ کبھی بھی مجھ سے خوش نہیں ہوتے اور کوئی بھی مجھے کسی قابل نہیں سمجھتا۔ نہ میں ناصر بھیا کی طرح ذہین ہوں، نہ عامر بھیا کی طرح لائق اور محنتی۔ سب کی نظروں میں، میں نااہل ہوں۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''انس! یہ تمہاری سوچ کا قصور ہے، ورنہ کوئی تمہیں نااہل نہیں سمجھتا۔ ابو کا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ تو تمہیں......''

''ربش۔'' اس نے ہوا میں جیسے مکھی اڑائی۔ ''میں بچہ ہوں جسے وہ اکسانا چاہ رہے تھے، بہلانا چاہ رہے تھے۔ ایسا کچھ نہیں ہے، وہ مجھے صاف صاف لفظوں میں کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں جلد از

جلد کوئی جاب تلاش کروں۔ وہ اب میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔

ان کی پنشن میں چار افراد کا گزارا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے، اور یہ سچ بھی ہے۔ وہ مجھے پڑھا لکھا چکے۔ اب تو مجھے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونا چاہیے اور میرے سارے دوست بھی کام دھندے سے لگ چکے ہیں کچھ بزنس کر رہے ہیں، کچھ باہر جا چکے ہیں۔ میں نے ناصر بھیا سے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے بزنس میں کہیں کھپا لیں۔ ساتھ شامل کر لیں مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ بزنس میں ساجھے داری کے قائل نہیں۔ ان کا سالا پھر کیوں ان کے بزنس میں شیئر ہولڈر ہے۔'' تیز گرم چائے نے جیسے اس کو اندر تک جلا ڈالا تھا۔

''تم اصل میں بہت حساس ہو رہے ہو۔ سب تمہیں اپنے مخالف نظر آرہے ہیں، بھیا نے تو خود بتایا تھا ابو کو کہ ان کا بزنس آج کل ڈاؤن جا رہا ہے ورنہ وہ تمہیں اپنے ساتھ ضرور شامل کر لیتے اور وہ جھوٹ بھی نہیں بول رہے تھے۔ کاروباری مندے کا رجحان تو آج کل پوری دنیا......''

''سارہ پلیز، تم جا کر سو جاؤ، میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہے۔ میں مزید اس موضوع پر نہیں بول سکتا کھانا گرم کر کے دینے کا شکریہ۔'' وہ انتہائی رکھائی سے بولا تھا۔ سارہ نے بے حد دکھ سے اسے دیکھا۔

''تم مجھے بھی دوسروں کے ساتھ شامل کرتے ہو، اپنے سے الگ، جدا۔ انس! میں تو تمہاری دوست ہوں۔'' وہ ایک دم سے رونے والی شکل بنا کر بولی۔

''میں تمہیں کیوں دوسرے کے ساتھ شامل کروں گا، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اتنا ٹائم ہوگیا ہے۔ پلیز اب تم جا کر سو جاؤ صبح کی اٹھی ہوئی ہو۔ تمہاری تھکاوٹ کے خیال سے کہہ رہا تھا، تم مائنڈ کر گئیں۔ امی کی طبیعت اب ٹھیک ہے کل انہیں بخار سا تھا۔''

''ہوں ٹھیک ہے، تم بھی سو جاؤ اب جا کر'' وہ روٹھے پن سے کہہ کر چائے کے خالی مگ اٹھا کر جانے لگی۔

''سارہ! ناراض تو نہیں ہو نا یار! میں بہت تھک گیا ہوں ایک آفس سے دوسرے آفس کے دھکے کھا کھا کر۔ سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر میرے گھٹنوں کے پیچ ڈھیلے ہوگئے ہیں۔ میری پولیٹیکل سائنس کی ڈگری ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تو میرا دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ میں نے کتنی محنت لگن اور محبت سے یہ ڈگری حاصل کی تھی۔ جس کی زمانے کی نظروں میں کوئی ویلیو ہی نہیں تو مجھے دکھ تو ہوگا نا۔ بس یہ بات ہے۔'' وہ اس کے پاس جا کر معذرت خواہ انداز میں بولا۔

''تم حوصلہ رکھو۔ ہمت کیوں ہارتے ہو۔ مل جائے گی جاب۔''

"ہاں مل جائے گی۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا "اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں سارہ! کیا میری زندگی کا یہی مقصد ہے۔ کیا اللہ نے مجھے اسی لیے پیدا کیا تھا نوکری مل جائے روٹین سیٹ ہو جائے پھر شادی، بچے۔ زندگی کولہو کے بیل کی طرح جت جائے پھر بچوں کی فکریں پھر اڑتے برسوں کی دھول میں ناقابل شناخت ضعیف چہرہ اور بدن اور پھر مٹی کا ایک ڈھیر۔ کیا اسی لیے میں ہوں، مجھے پیدا کیا گیا۔"

"تو سب لوگ یونہی زندگی گزارتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کیا انوکھا ہوگا بھلا......"

"سارہ! کیا یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ کھاؤ پیو اور جیو اور مر جاؤ بس۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"تمہیں نیند آرہی ہے لگتا ہے۔ کچھ زیادہ ہی تھک گئے ہو۔ سو جاؤ جا کر۔" سارہ برتن کچن میں رکھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

"کیا ہے ہماری زندگی کا مقصد...... انس کیوں الجھ رہا ہے...... شاید سب نے اسے اپنے مسئلے سے نمٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ ابو اس کا حوصلہ بندھانے کے بجائے اسے طعنے دے کر اچھا نہیں کرتے......" سوچتے سوچتے وہ سو ہی گئی۔

پھر چند دن بعد انس کو جاب مل گئی۔

"بہت اچھی نہیں ہے۔ عارضی سمجھو، اور میں نے کسی کو بتایا بھی نہیں۔ مذاق اڑائیں گے میرا، بہرحال جب تک اچھی جاب نہیں مل جاتی، یہ جاب میرا حقہ پانی چلائے گی۔" وہ بہت خوش نہیں تھا۔

"کہاں ملی ہے جاب؟" سب کی طرح سارہ نے بھی پوچھا۔

"کوئی ہفت روزہ رسالہ ہے جس میں ٹرانسلیٹر کی پوسٹ ہے۔ غیر ملکی اخباروں، رسالوں اور جریدوں میں سے منتخب تحریروں کو اردو میں ٹرانسلیٹ کرنا اور موثر انداز میں اسے تحریری شکل دینا، تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور کام دلچسپ ہے، مگر محنت طلب اور دیدہ ریزی کا کام ہے، جب تک دل لگے گا کروں گا، ورنہ چھوڑ دوں گا۔" وہ خود ہی فیصلہ کرتا جا رہا تھا۔

"چلو اب تو خوش ہونا کوئی تمہیں ہینڈی کیپ تو نہیں سمجھے گا۔ تم بھی گھر کے فعال ممبر بن رہے ہو۔" سارہ نے اس کا دل بڑھایا۔

"ہاں، اگر کوئی سمجھے تو......"

"پھر وہی مایوسی...... اچھا سنو، امی تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔" اپنے تئیں سارہ نے اسے خوش کرنا چاہا۔

"شادی وہ بھی میری......" وہ خاصی حیرانی سے بولا۔

"کیوں کیا تمہارے ہاتھ میں شادی کی لکیر نہیں۔" وہ بولی۔

"شادی کی تو ہے مگر بیوی کی نہیں۔" وہ ہاتھ پھیلا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب، شادی ہوگی تو بیوی گھر آئے گی۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے نہیں آسکتی۔" وہ مسکرایا۔

"کیوں؟" سارہ نے کچھ غصے سے اسے دیکھا۔

"ابھی مجھے تنخواہ ملی نہیں اور تم نے ہزار روپے کی شاپنگ کر لی ہے۔ سات سو کا کھانا کھا چکی ہو، جو چاہتی ہو مجھ سے منوا لیتی ہو۔ میری بیوی نے تمہیں مجھ پر اس قدر حاوی دیکھا، اس نے تو دوسرے دن بوریا بستر باندھ کر چل پڑنا ہے۔"

"انس......" سارہ نے اسے زور کا مکا مارا۔

"ہائے! میں مر گیا۔ دیکھنے میں دھان پان سی ہو۔ کتنا مضبوط ہاتھ ہے تمہارا۔" وہ کمر پکڑ کر دہرا ہو گیا۔

"میں امی کو بتاتی ہوں جا کر۔" سارہ اسے گھورتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"ہیلو کیا حال ہے آنٹی کا اب؟" عزم اس کے سامنے کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"ٹھیک۔" وہ ذرا سا چونکی۔ "ٹھیک ہیں اب تو۔"

"سارہ! آپ بیٹھے بیٹھے کدھر کو جاتی ہیں، میں آرہا تھا آپ ایسے بیٹھی تھیں جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ اردگرد سے بالکل بے خبر، لاتعلق آخر ایسی کون سی سوچیں ہیں جو آپ کو اس بری طرح سے جکڑ لیتی ہیں کہ گرد و پیش بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔" دس منٹوں میں عزم مصطفیٰ نے دوسری دفعہ اس سے یہ سوال کیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس۔ مجھے کہاں کھونا ہے۔ امی کے متعلق سوچ رہی تھی ڈاکٹر کہہ رہے تھے۔ انہیں کل تک ڈسچارج کر دیں گے گھر جا کر بھی مکمل بیڈ ریسٹ بتا رہے ہیں، بس یہی سوچ رہی تھی۔" وہ اب پوری طرح واپس آچکی تھی۔

"یہ تو بہت Expected (متوقع) باتیں ہیں۔ اس میں اس قدر کھو جانے والی کون سی بات ہے؟" وہ بھی بال کی کھال اتار رہا تھا۔

"اوہو بھئی، بتایا تو یہی بات ہے۔ اور کوئی بات نہیں" وہ جھنجلائی۔

''او کے۔کھانا کھالیا آپ نے؟'' اس نے خود ہی موضوع بدلا۔

''کھالیا تھا۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''گھر نہیں جائیں گی۔''

''ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی گھر سے آئی ہوں۔ سیما بھابھی ابھی گئی ہیں۔''

''چائے پییں گی، لے آؤں؟''

''چائے ہے۔ میں تھرماس میں گھر سے بنا کر لائی ہوں۔ آپ کے لیے نکالوں۔''

''اگر آپ ساتھ دیں تو۔'' وہ اب امی کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور ان کی فائل اٹھا کر دیکھنے لگا تھا۔

''اور اگر میں ساتھ نہ دوں تو......'' وہ چائے کپ میں نکالتے ہوئے بولی۔

''تو پھر رہنے دیں۔'' وہ فوراً بولا۔ ''کیونکہ اکیلے چائے تو میں گھر میں بھی پی سکتا ہوں۔''

''یعنی آپ کو صرف ساتھ چاہیے۔ آئی مین کمپنی، وہ چاہے میں دوں یا......''

''میں دوں۔'' پنکی اندر داخل ہوتے ہوئے بولی تو عزم مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

''بالکل اگر پنکی کا ساتھ ہو تو چائے کا مزہ دوبالا۔''

''بلکہ تین بالا اگر میں بھی ہوں تو؟'' طلحہ، پنکی کے ساتھ آیا تھا، فوراً بولا۔

''نہیں بھئی ''بال'' والی چیز ویسے ہی...... مکروہ ہو جاتی ہے۔ میں تو ایسی چائے نہیں پیوں گی۔'' پنکی فوراً بولی۔

''تم تو مکروں چیز بھی کھا جاؤ بے دھڑک بشرطیکہ کھانے والی ہو۔ موٹو۔'' طلحہ نے اسے چھیڑا۔

''پھپھو! دیکھ لیں اسے، خود تو جیسے بہت اسمارٹ ہے نا تنکے میں جان۔''

''پنکی! اسے اسمارٹ نہ کہو سپاٹ کہو۔'' سارہ نے چائے کا کپ عزم کو تھمایا اور دوسرا پنکی کو۔

''پھپھو! ویٹس فاؤل پہلے چائے مجھے دیں۔'' طلحہ نے کپ فوراً پنکی سے جھپٹ لیا۔؟

''یہ ہاسپٹل ہے مائنڈ اٹ۔'' پنکی نے اسے گھورا تو وہ مسکرا کر چائے پینے لگا۔

☆☆☆

میرے درد کے مسلم انگاروں پر جل رہے ہیں

بے حد ہیں صادق و جعفر جو آستین میں پل رہے ہیں

فرزند توحید سے نہیں کوئی امید، دختر مسلم کیا کرے گی

فقط نوحے اور مرثیے ہیں جو سینوں میں جل رہے ہیں

مجھے اس ٹھنڈے لہو کی قسم ہے جو رگوں میں ٹھہر گیا ہے

وہ مرد آہن، مرد مومن سرحدوں کی زنجیر میں جکڑ گیا ہے

مجھے ان نونہالان وطن کی قسم ہے جو اپنا بچپن نہ بنا سکے

وہ تعمیر ملت تو کیا کریں گے جو خود اپنی ہستی نہ بنا سکے

کہاں ہیں میرے عہد کے قاسم و طارق ولید و نصیر!

مجھے جوان ناتواں کی قسم ہے جو فقط قبروں تک ہی جا سکے

افسوس میری تربیت کے بے ہنر ہاتھ حسین رضی اللہ عنہا سا کوئی پھول نہ کھلا سکے

میرے بدن سے رستے لہو کی کیا اوقات کفر و الحاد کے آگے

نکال کر پھینک دوں ان داغوں کو جو ایک بھی شمع نہ جلا سکے

کوئی میری آہ میں اثر بھر دے، کوئی میری قوم کو متحد کر دے

خون مسلم کی ارزانی تو دیکھے کوئی اس لہو میں رنگ بھر دے

میرے خدا بہت ہو چکے ہیں ذلیل و رسوا تیرے نبی ﷺ کے امتی

انس...... یہ...... یہ تم کیا پڑھ رہے ہو آج کل؟'' وہ اس کی ڈائری کے ورق پلٹتی جا رہی تھی، جگہ جگہ اسی قسم کے پرجوش اشعار، نظمیں لکھی ہوئی تھیں۔

انس ابھی باتھ روم سے نہا کر نکلا تھا۔ اپنے گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتا سارہ کے ہاتھ میں اپنی ڈائری دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''یہ...... چھوڑو تم، کیوں پڑھ رہی ہو۔ کسی کی پرسنل ڈائری نہیں پڑھتے جاہل۔'' اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر ڈائری جھپٹ لی۔

''یہ تمہارا پرسنل ہے'' سارہ نے ڈائری کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ذہن میں عجیب سے وہم کلبلانے لگے تھے۔

''ہاں، ہے۔'' وہ ڈائری لاکر میں رکھتے ہوئے بولا۔

''انس! تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟''

''کیوں کیا میرے سینگ نمودار ہو رہے ہیں۔'' وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارنے لگا۔

''تم آدھی رات کو گھر آنے لگے ہو۔ صبح منہ اندھیرے نکل جاتے ہو۔ چھٹی والے دن بھی

گھر سے غائب۔ گھر آتے ہو تو اپنے کمرے میں قید ہو جاتے ہو جیسے گھر والوں سے تمہارا کوئی تعلق ہی نہ ہو، رات کو ابو، امی کو خوب سنا رہے تھے اب چلو، امی تمہاری کلاس لیں گی۔“

”اس میں کلاس لینے کی کیا بات ہے، یہ میری جاب کی ڈیمانڈ ہے۔“ وہ لاپروائی سے بال سنوارتا رہا۔

”گولی مارو ایسی جاب کو۔ چوبیس گھنٹوں کی بیگار ہے جو تم کسی کو اپنی شکل نہیں دکھا سکتے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”بھئی، گولی تو نہیں مار سکتا۔ بڑی مشکل سے تو مجھے یہ جاب ملی ہے۔“ وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

”پتا ہے، کل ناصر بھیا بھی امی سے کہہ رہے تھے کہ مجھے انس کے آفس کا ایڈریس دیں۔ میں خود اس کا آفس دیکھ کر آؤں گا۔“

”کیوں انس کوئی دودھ پیتا بچہ ہے جو ایسی ویسی جگہ پر جاب کرے گا اور جب میں دھکے کھا رہا تھا، اس وقت تو ناصر بھیا کو خیال نہیں آیا۔“ وہ کڑھ کر بولا۔

”انس! میں تو تمہاری دوست ہوں نا۔ تم از کم مجھے تو بتا دو، یہ کیسی جاب ہے، جس میں تم آدھی رات سے پہلے گھر نہیں آ سکتے۔ پہلے تم مجھے اتنا ٹائم دیتے تھے۔ آؤٹنگ پر لے جاتے تھے۔ اب تو میں تم سے بات کرنے کو ترس گئی ہوں۔“

”سارہ! زندگی، خصوصاً ہماری زندگی کیا ان بے مقصد ایکٹوٹیز کی متحمل ہو سکتی ہے۔ کبھی سوچا ہے تم نے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”خصوصاً ہماری زندگی سے کیا مراد ہے تمہاری۔ کیا ہوا ہے ہمیں۔“

”یعنی، ہم مسلمان۔“ وہ بولا۔

”کیا ہوا ہم مسلمانوں کو؟“ وہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

”سارہ! تم اخبار نہیں پڑھتی، ٹی وی نہیں دیکھتیں، کرنٹ افیئرز سے بے خبر ہو کیا؟“

”یہ کوئی آج کی بات تھوڑی ہے، جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں تب سے یہ ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ اس میں کیا نئی بات ہے۔“

”نئی بات۔“ وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ ”ہاں نئی بات تو ان کے لیے ہوتی ہے جن کے گھروں پر بم برسائے جاتے ہیں۔ راتوں کو انہیں بے گھر کر کے ٹھٹھرتی ہڈیوں کے گودے کو جما دینے والی سردی میں لائن بنا کر الٹالیٹ جانے کا حکم دیا جاتا ہے، جن کے بچوں کو، شیر خوار بچوں کو بازوؤں سے بم مار کر

ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا جاتا ہے جن کی عورتوں کو بے آبرو کر دیا جاتا ہے، جن کے شہروں کو ہنستے بستے بھرے پرے شہروں کو کھنڈرات بنا دیا جاتا ہے، نئی بات تو ان کے لیے ہوتی ہے تم درست کہتی ہو بچپن سے دیکھتے آ رہے ہیں سنتے رہتے ہیں، دیکھ دیکھ کر سن سن کر ہم پتھر کی طرح بے حس ہو چکے ہیں، کب سے دیکھ رہے ہیں سن رہے ہیں فلسطین پر بم برسائے جا رہے ہیں، بچوں کو سر عام گولی ماری جا رہی ہے، ان کی عورتیں، لڑکیاں، بچیاں، بندوقیں اٹھا کر اپنے جسموں سے بم باندھ کر کفر والحاد کے آگے ریت کی دیوار بنی کھڑی ہیں۔ ان کے مرد توانا، جوان، بوڑھے اپنے وطن کے لیے اپنے مذہب کے لیے سینہ تان کر مٹھی بھر یہودیوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ گولیاں کھا رہے ہیں، بے نام قبروں میں جا رہے ہیں۔ کشمیر کی وادی میں ظلم کی بھٹی آج تو نہیں بھڑکی۔ اس آگ کو بھڑکتے دہکتے تو پچاس برس ہونے کو آئے۔ اس بھڑکتی آگ میں کتنے گھر جلے کتنے جسم پھنکے کتنے لوگ کوئلہ بنے۔ کوئی آج کی بات تھوڑی ہے۔ یہ تو پچاس برسوں سے ہو رہا ہے۔ ان معاملوں سے ہمارا کیا تعلق ہے، افغانستان تو رابورا کی پہاڑیاں بنتا جا رہا ہے مٹی ملبے کا ڈھیر انسانوں سمیت۔ زندہ انسانوں سمیت۔ اس سے ہمارا کیا واسطہ۔“ وہ تلخ لہجے میں بولتا چلا گیا اس کی پیشانی کی رگ ابھر گئی تھی۔ سارہ دم سادھے سن رہی تھی، بولی۔

”انس! تم کیا کہہ رہے ہو۔“ اس کی آواز سرگوشی کی مانند تھی۔

”جو تم سن رہی ہوں۔“ وہ جیسے تھک گیا تھا کرسی سے سر ٹکا کر بولا۔

”تم پہلے تو ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔“ وہ حیرت زدہ تھی۔

”پہلے۔“ وہ ہنسا۔ ”پہلے میں بھی تمہاری طرح دیکھتا اور سنتا تھا۔“

”اور اب۔“

”اب......اب محسوس کرنے لگا ہوں اس درد کو۔ اس زخم سے اٹھتی ٹیس کو جو امت مسلمہ کے جسم پر لمحہ بہ لمحہ لگائے جا رہے ہیں، بہت اپنے دل کے قریب محسوس کرنے لگا ہوں ان زخموں کو۔“ وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

”کیوں اب کیوں ایسا ہو رہا ہے؟“ سارہ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”سارہ! امت مسلمہ تو ایک جسم کی مانند ہے۔ ایک حصے میں درد ہوتا ہے تو تمام جسم درد محسوس کرتا ہے، پھر ہمیں یہ درد، یہ زخم کیوں محسوس نہیں ہوتے۔ ہمارے دلوں میں درد کی وہ چبھن کیوں نہیں پیدا ہو رہی جو ہمارے مسلمان بھائیوں کو ہو رہی ہے۔“

”تم نائن الیون کے بعد کے واقعات سے پریشان ہو۔“

”سارہ ابھی تک اس کی سوچ سے مطابقت پیدا نہیں کر پا رہی تھی۔“

''تمہارے کہنے کے مطابق یہ کوئی نئی بات نہیں۔ نائن الیون کے گزر جانے کے بعد، مہینوں بعد بھی تو میں ایسا ہی رہا تھا تمہارے جیسا۔''

''تو پھر......؟'' سارہ کو اس کی سوچ کی تبدیلی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''افغانستان کا حال دیکھ رہی ہو۔'' وہ بولا۔ وہ کچھ نہ بول سکی بس اسے دیکھتی رہی۔

''ہنستے بستے شہر کھنڈر بن رہے ہیں۔ ریت، خاک، مٹی کے تودے۔'' انس کی آنکھوں میں عجب سا ہراس تھا۔

''افغانستان......وہ رکی۔'' وہاں کی پیاسی زمین صدیوں سے لہو مانگتی ہے ہسٹورین (تاریخ دان) ہی کہتے ہیں۔

''کیا محض تاریخ دانوں کے ایک مقولے پر ہم صبر کر کے بیٹھ جائیں۔'' وہ جیسے تڑپ کر بولا۔ ''ہمارے ہمسائے کے گھر میں آگ لگی ہو تو ہم چین سے سو سکتے ہیں۔''

''تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' سارہ بے بسی سے بولی۔

''ہاں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں فوڈا سٹریٹ بنا سکتے ہیں۔ ساری ساری رات کیبل پر ہمسایہ ملکوں کی فحش فلمیں دیکھ سکتے ہیں، ان کے بیہودہ گانوں پر تھرک سکتے ہیں لمبی لمبی گاڑیاں اگر ہیں تو ان میں آوارہ پھر سکتے ہیں۔ نہیں ہیں تو انہیں دیکھ کر آہیں بھر سکتے ہیں، انہیں حاصل کرنے کے لیے خود کو پیسے کی دوڑ میں شامل کر سکتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں اینٹ گارے لگا کر شداد جیسی جنتیں اور ان میں محل تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس مٹی کے وجود کے لیے ہزاروں آسائشیں اپنے گھر میں مہیا کر کے بھی تشنہ رہ سکتے ہیں، نرم نرم گدوں پر لیٹ کر ایڈونچرس کہانیاں اور فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔ کیا کچھ نہیں ہماری زندگیوں میں تو ہمیں جنگ کی بھٹی میں اپنے جسموں کو جلانے والے اپنے بھائیوں کی جلن کا کیا احساس ہوگا اور کیوں ہوگا۔'' انس کی سوچ سرتاپا بدل چکی تھی کچھ ماہ پہلے تک وہ خود بھی تو یہی کچھ کرتا تھا سارہ کے ساتھ چائنیز ریسٹورینٹ میں جاتا اکثر ایڈونچرز انگلش موویز لاتا اور اسے بھی دیکھنے کو دیتا لمبی ڈرائیو اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اور آج اس کی نظر میں سب کچھ بے وقوفانہ تھا۔ کیسے؟ سارہ اس تبدیل شدہ انس کو تکے جا رہی تھی۔

''سارہ! ہم خود کو دھوکا دے رہے ہیں، بہت بڑا فریب۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''ہم اس چند روزہ فانی زندگی کے فریب میں آ گئے ہیں۔ اس زندگی کی خوبصورتیاں تار عنکبوت کی طرح ہمیں چہار جانب سے جکڑ رہی ہیں۔ ہم اس زندگی کے نشے میں بدمست ہیں، جب یہ جام چھٹے گا، ہماری آنکھیں کھلیں گی، اس وقت ہمارے پاس ایک لمحے، ایک پل کی بھی مہلت نہیں ہوگی۔''

وہ بہت دکھی ہو رہا تھا جیسے......اس نے زندگی کے چہرے سے اصلی پردہ ہٹا کر دیکھ لیا تھا۔

سارہ کو جھرجھری سی آ گئی۔

''لگتا ہے۔ تم آج کل کسی مذہبی جماعت کی میٹنگز باقاعدگی سے اٹینڈ کر رہے ہو۔'' سارہ سر جھٹک کر بولی۔

''کیا مذہب پر صرف مذہبی جماعتوں کی اجارہ داری ہے۔ عام مسلمانوں پر کچھ فرض نہیں۔ اس کے بارے میں جاننا۔''

''کیوں فرض نہیں۔'' ''نماز پنجگانہ روزہ، حج، زکوٰۃ...... ہمارے گھر میں تمہارے سامنے ہم بہن بھائی، امی ابو نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں اور روزہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ زکوٰۃ باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور حج کا ارادہ بھی ہے امی ابو کا۔''

''سارہ! میں کبھی کبھی سوچتا ہوں تو اللہ کو اپنے بالکل قریب محسوس کرتا ہوں تو معلوم ہے، مجھے کیا لگتا ہے۔''

اس نے جیسے سارہ کی بات سنی ہی نہیں تھی، آہستگی سے بولا۔

''اللہ اداس ہے؟'' وہ جیسے رو دینے کو تھا۔

''کیا......کیا مطلب؟ تم ہوش میں تو ہو۔ کیسی کفر کی باتیں کر رہے ہو انس! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔''

''سارہ! تم دیکھتی ہو۔ ہمارے گھر میں ہی نہیں تقریباً سب گھروں میں لوگ بہت باقاعدگی سے نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کا اہتمام کیا جاتا ہے اسلام اتنا چودہ صدیوں میں نہیں پھیلا جتنا ان چند سالوں میں...... بچے بچے کے ہاتھ میں تسبیح ہے۔ گھر گھر میں قرآن کے حافظ پائے جاتے ہیں، وظیفے کیے جا رہے ہیں۔ خضوع وخشوع سے نمازیں ادا کی جاتی ہیں، قرآن کے مطالب سمجھے جا رہے ہیں۔ گھر گھر ترجمہ وتفاسیر پڑھی جا رہی ہیں۔ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ راتوں کو قیام تو اب عام سی بات ہو چکی ہے پھر بھی......پھر بھی......

عجب بے سکونی سی ہے، ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اتنی زیادہ عبادت وریاضت جب دنیا بھر میں کی جا رہی ہو تو اس کی بازگشت آسمانوں تک تو ضرور جاتی ہوگی پھر ذہنوں میں سوچوں میں ابتری کیوں، دنیا بھر میں بے سکونی کیوں۔ ہماری عبادتیں، ریاضتیں کتنے ہی خلوص سے کی جائیں پھر بھی اللہ کو خوش کیوں نہیں کر رہیں، کبھی سوچا تم نے۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی ذہنی سوچ اس قدر آگے تک چلی گئی۔ چند ماہ پہلے تو

وہ بہت سطحی سوچ رکھتا تھا، عام سی، بالکل روٹین والی پھر یہ سب کیا ہے۔ سارہ کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

"ہماری عبادتوں کے باوجود اللہ اداس کیوں ہے؟" وہ پھر سے بولا۔ سارہ کیا جواب دیتی، اسے دیکھتی رہی۔

"اللہ کی مخلوق، اللہ کی پیدا کردہ مخلوق دکھی ہے، زخمی ہے، لہولہو ہے۔ بموں سے اڑائی جارہی ہے، گولیوں سے بھونی جارہی ہے، فنا کی جارہی ہے۔ جیتے جی ملبے تلے دبائی جارہی ہے اس کی مخلوق سسک رہی ہے، رو رہی ہے فریاد کناں ہے۔ لہولہو چہرہ، آنکھیں، ہاتھ پاؤں اور مفلوج ذہنوں کے ساتھ اللہ کے رحم، اس کی رحمت کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے پھر ہماری عبادتیں اسے کیسے خوش کریں گی، ہماری نمازیں، ہمارے سجدے، ہمارے قیام...... زخمی امت مسلمہ کے لیے مرہم نہیں بن سکتے۔ نماز، روزے، حج، زکوٰۃ تو ہمیں یاد ہے۔ جہاد کو ہم کیوں بھول گئے ہیں۔ مجاہدوں کو ہم نے دہشت گردوں کا نام دے دیا ہے پھر اللہ ہم سے کیسے خوش ہوگا۔ اسلام کی عمارت جہاد جیسے اہم ستون کے بغیر کیسے کھڑی رہ سکتی ہے، صحیح وسالم۔"

"تم نے کوئی جہادی تنظیم جوائن کرلی ہے۔" سارہ نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

"نہیں میں مسلمان پیدا ہوا ہوں، اپنی پیدائش کے چھبیس سال بعد دوبارہ کلمہ پڑھا ہے۔ میں نے اسلام کی اصل روح کو سمجھ کر اسے دین فطرت جان کر اور بس۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"انس! تم جاب چھوڑ دو، اس نے تمہاری ذہنی کیفیت بالکل بدل دی ہے۔ بس تم ادھر سے ریزائن کردو۔" سارہ کو اس کی باتیں اچھی تو لگی تھیں مگر عجیب ساخوف بھی محسوس ہوا تھا۔

"چھوڑ دوں گا، چھوڑ ہی دینی ہے بلکہ سمجھو چھوڑ دی۔ میں ایک ماہ کے لیے سیر وتفریح کے پروگرام پر جارہا ہوں ناردرن ایریاز میں۔ کل کا سارا دن تو پیکنگ میں گزرے گا۔" اگلا پروگرام بھی حیران کن تھا۔

"تم زیادہ خود مختار نہیں ہوگئے، امی، ابو سے پوچھ لیا ہے۔"

"آج پوچھ لوں گا۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"انس! تم......" اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیسے سرزنش کرے۔

"ہاں میں......" وہ شرارت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بہت ہینڈسم ہوگیا ہوں۔"

"تم ادھر کیا کررہی ہو، آجاؤ امی کے پاس۔ میں طلحہ کے ساتھ جارہی ہوں۔ پنکی ابھی ناصر کے ساتھ آجائے گی۔" وہ ہاسپٹل کے لان میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ لان کا یہ

تاریک کونا اسے جائے عافیت لگا تھا۔ وہ ادھر کر بیٹھی تو انس کے بارے میں سوچتی چلی گئیں۔ سیما بھابھی اپنی بات کہہ کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئی، جہاں طلحہ گاڑی کھولے ان کا منتظر کھڑا تھا۔

"سارہ سست قدموں سے ہاسپٹل کی بلڈنگ کی طرف بڑھ گی۔

☆☆☆

امی کو ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوئے دوسرا دن تھا جب عزم مصطفیٰ شام کے وقت کسی اجنبی خاتون کے ساتھ امی کے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ کمرہ ٹی وی لاؤنج سے متصل تھا۔ کبھی سارہ کے تصرف میں ہوتا تھا پھر وہ اوپر شفٹ ہوگئی امی کے ساتھ تو سیما بھابھی نے اسے فیملی گیسٹ روم کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا۔

"السلام علیکم۔" عزم کی آواز پر سب نے مڑ کر دیکھا۔ اس وقت سب ہی امی کے کمرے میں جمع تھے۔ دونوں بھائی، بھابھیاں، پنکی، طلحہ اور سارہ۔ پینتیس چھتیس برس کی اسمارٹ اور پرکشش خاتون تھی پھر اچھا قیمتی لباس اور بھاری جیولری کے ساتھ مسکراتا چہرہ۔

"یہ میری بڑی بھابھی ہیں۔ انیلا بھابھی لاہور آئی ہوئی تھیں اپنے میکے، آنٹی کا سنا تو ان کی خیریت دریافت کرنے چلی آئیں۔" عزم نے اس خاتون کا تعارف کرایا تھا جو بیٹھتے ہوئے امی کو سلام کرکے ان کی خیریت دریافت کررہی تھیں۔

"انیلا...... انیلا ہو نا تم۔" سیما بھابھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ارے سیما! یہ تم ہو۔" وہ بھی ذرا سی کوشش کے بعد فوراً اٹھ کر سیما بھابھی کے گلے لگ گئی۔

"چلو جی، ادھر تو پرانے دوستانے نکل آئے، وہ بھی لگتا ہے بچپن کے۔" طلحہ نے کہا۔

"یہ میرا بیٹا طلحہ ہے اور یہ پنکی۔" سیما بھابھی بڑے جوش سے اپنے بچوں کا تعارف کرارہی تھیں۔

"ہم دونوں نے چار سال تک کالج میں اکٹھے پڑھا ہے۔" وہ خوشی سے بتارہی تھیں۔

"سیما بھئی! مہمانوں کی تواضع کا بھی کچھ خیال کرو۔" ناصر بھیا نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"آپ کو تو میں فوراً ہی پہچان گئی ہوں، آپ ناصر بھائی ہیں نا۔ میں آپ کی شادی میں شریک ہوئی تھی، اس کے ایک ماہ بعد میری شادی ہوگئی، اس کے بعد کبھی مل ہی نہ سکے۔ بہت خوشی ہو رہی ہے آج یوں اچانک سیما کو دیکھ کر۔" وہ بھی خوشی سے بتارہی تھیں۔

"بھابھی جان! آپ آنٹی کی عیادت کو آئی ہیں، انہیں بھی پوچھ لیں پھر باہر چل کر بیٹھتے

ہیں۔ آنٹی کو ڈاکٹر نے مکمل ریسٹ بتایا ہے۔'' عزم نے ہولے سے بھابھی کو یاد دلایا تو وہ امی کی طرف مڑیں۔ سامنے سارہ بیٹھی تھی، اسے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''یہ سارہ ہے، میری چھوٹی نند اور یہ میری دیورانی غزل ہیں۔ میرا خیال ہے، ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

سیما بھابھی نے جلدی جلدی تعارف نپٹایا اور انیلا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئیں۔

''اب کیسی طبیعت ہے آنٹی کی؟'' عزم شاید اپنی بھابھی کے یوں کھڑے کھڑے عیادت کرنے پر شرمندہ تھا، ناصر بھائی سے پوچھنے لگا۔

''اب تو اللہ کا شکر ہے، بالکل ٹھیک ہیں، بس کمزوری ہے، وہ بھی آہستہ آہستہ دور ہوگی۔''

ناصر بھائی امی کا بتا کر معذرت کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ انہیں بھی بیگم کی دوست کی کمپنی اچھی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد عامر بھائی اور غزل بھابھی اٹھ کر چلے گئے۔ طلحہ اور پنکی پہلے ہی باہر جا چکے تھے۔

''آپ کے ایگزام کب ہیں؟'' اس نے سارہ سے پوچھا۔

''اگلے ماہ کے اینڈ تک۔'' وہ امی کے چہرے پر نظریں جما کر بولی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ دوائیوں کی وجہ سے انہیں غنودگی سی رہتی تھی۔

''پھر آگے کیا لیکچرر شپ کا ارادہ ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے گہرا سانس لیا۔

''نہیں۔'' وہ حیرت سے بولا۔ ''ایم فل کرنے کے بعد بھی نہیں۔''

''عزم صاحب! میں کوئی جاب نہیں کر سکتی، امی کو میری ضرورت ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''کرنا ہوتی تو ماسٹر کے فوراً بعد بھی کر سکتی تھی۔'' وہ بڑے پیار سے ماں کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ عزم مصطفیٰ کی نظروں نے اس کے جذبے کو سراہا تھا۔

''تو پھر یہ ایم فل۔''

''میرا شوق ہے کیونکہ علم تو جتنا بھی حاصل کرو، کم ہے۔''

''پھپھو! آپ کی چائے یہیں لے آؤں، عزم! پاپا چائے پر ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' پنکی نے کمرے میں جھانک کر پوچھا تھا۔ سارہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور عزم ''ایکسکیوزمی'' کہتے ہوئے پنکی کے پیچھے باہر نکل گیا۔ پنکی اس کی چائے کمرے ہی میں دے گئی۔

اس نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا دیا۔ شام کی مدھم روشنی اندر

آنے لگی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

''ویسے آج ادھر میں آئی تو آنٹی کی طبیعت کا پوچھنے تھی لیکن ایک دوسری بات بھی ہے۔''

یہ انیلا بھابھی کی آواز تھی جو ٹی وی لاؤنج سے آ رہی تھی۔ وہ خاصی مدھم آواز میں بول رہی تھیں۔ ناصر بھیا اپنے کمرے میں تھے۔ پنکی، طلحہ اور عزم باہر گئے تھے۔ ڈرائیونگ پر بلکہ پنکی نے پیزا کھانے کی فرمائش کی تھی۔ سارہ کو بھی جانے کو کہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا۔

''دوسری بات کون سی بھئی؟'' سیما بھابھی نے پوچھا۔

''عزم ادھر مجھے اپنی منظور نظر دکھانے لایا ہے، میری ساس اسی مہینے کے آخر تک آ رہی ہیں۔ آتے ہی جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ کریں گی کیونکہ عزم نے کہہ رکھا تھا، لڑکی وہ پسند کرے گا۔ مناسب تیاریاں سمجھو مکمل ہیں، صرف عزم کے اشارے کا انتظار تھا۔'' انیلا بھابھی بولیں۔

''تو ادھر کون سی لڑکی ہے؟'' سیما بھابھی نے پوچھا۔

''ارے بڑی بے خبر ہو، جوان بیٹی کی ماں ہو۔'' انیلا بھابھی نے شاید سیما بھابھی کو چٹکی کاٹی تھی۔

''ایں..... کیا مطلب؟''

''عزم کو پنکی پسند ہے، تم بس منگنی کی تیاری کرو۔ سمجھو تمہاری تو لاٹری نکل آئی۔ لڑکا تو وہ ہیرا ہے پھر لاہور کی سسر صاحب کی سب پراپرٹی اس کے نام ہے۔ ادھر ماں بھی بہتیرا بینک بیلنس اس لاڈلے سپوت کے لیے جوڑ کر بیٹھی ہیں۔ بس اس رشتے میں ایک ہی ذرا سا جھول ہے۔''

''وہ کیا؟''

''عزم ماں کو ساتھ رکھے گا، پر کب تک۔ تم پنکی کو سمجھا دینا، اپنے طریقے سے اس کے دماغ سے ماں کی محبت کا بھوت نکال دے گی۔'' سارہ آنکھیں بند کر کے کرسی پر جھولتے ہوئے ان دونوں کی پلاننگ سن رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس گفتگو کے بعد اسے لگا، یکایک اس کے دل کا ایک کونہ بالکل خاموشی سے ویران ہو گیا ہے۔ ایک دم سنسان، اجاڑ بیابان۔ اس نے جھولتے جھولتے رک کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اس ویران گوشے کو محسوس کرنے کی کوشش بھی کی تھی، وجہ جاننے کی بھی مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

''کیا عزم نے اپنے منہ سے نام لیا ہے پنکی کا؟'' سیما بھابھی کی آواز تھی۔

''تو اور میں خود سے کہہ رہی ہوں۔ سیما! تم تو گھامڑ ہی رہی ہو، بے وقوف سی ابھی تک۔ ساس نند کا بکھیڑا سینے سے لگا کر بیٹھی ہو۔ مجھے دیکھو، شادی کے چھ ماہ بعد ہی عظیم کو لے کر الگ گھر لے لیا تھا۔ یہ ساس نند کا ٹنٹنا مجھ سے نہیں ہوتا۔''

''ارے یہ دونوں بھائی بڑے ماں ورتا ہیں۔ اس معاملے میں ہماری ایک نہیں سنتے پھر یہ سارہ بی بی بھی تو ہیں ماں کی چمچی۔ بھائیوں کو ایک ایک رپورٹ دیتی ہے۔ بس اسی ایک معاملے پر تو میرا ناصر پر زور نہیں چلتا۔ ویسے تو دونوں ماں بیٹی کو اوپر کی منزل پر نکال پھینکا ہے، اس سے زیادہ ناصر نہیں مانتے۔'' سیما بھابھی نے زمانے بھر کی مظلومیت لہجے میں سمو کر کہا۔ ''دیکھ لو، کتنا حوصلہ ہے ساری زندگی سسرال کے جھمیلے میں گزار دی۔''

''بھئی حوصلہ ہے تمہارا، میں آج رات کو فون کر کے اپنی ساس کو تمہاری رضامندی دے دوں گی۔''

''کیا بات کرتی ہو انیلا! مجھے ناصر سے تو پوچھ لینے دو پھر پنکی سے بھی تو پوچھنا ہے۔''

''پنکی کا تو تم رہنے دو، اس سے پوچھ کر ہی تو عزم مجھے ادھر لے کر آیا ہے۔ ناصر بھائی سے تم ابھی پوچھ لو۔'' وہ تو جیسے سب کچھ طے کر کے ہی جانا چاہتی تھیں۔

''کیا غضب کرتی ہو۔ میری ساس بیمار پڑی ہے، ایسے میں ناصر سے بات کر لی تو میرے گلے پڑ جائیں گے۔ ایک دو دن میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گی۔''

''چلو، میں آج امی کو فون کر کے عزم کی پسند کی خوشخبری تو سنا دوں گی۔ سیما! بھئی تمہاری پنکی تو واقعی بہت خوبصورت ہے اور معصوم بھی۔ ہمارے دیور جی نے بھی چن کر لڑکی پسند کی ہے۔ تم دیکھنا، میری ساس کیسی نہال ہوں گی پنکی کو دیکھ کر۔ اس بیٹے میں تو ان کی جان ہے۔ عزم کی پسند تو شروع سے چوزی ہے۔''

سارہ کو لگا کمرے میں آکسیجن کم ہو گئی ہے۔ اٹھ کر پچھلے دروازے سے زینے کی طرف آ گئی۔ ٹیرس کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر اس نے خوب گہرے گہرے سانس لیے۔ شام کا دھندلکا اب سب طرف چھا چکا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے بھی شام کا بسیرا رات کے آشیانے میں جلدی ہو رہا تھا۔

وہ ٹیرس پر تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرنے لگی۔

''عزم کی پسند لاجواب ہے۔ شوع ہی سے چوزی ہے۔'' اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔

''رات......'' اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ''اب تو رات بہت لمبی ہو گئی ہے۔ سردیوں کی لمبی راتیں...... ایگزام کی تیاری بھی کرنا چاہیے۔ تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ امی ٹھیک ہو جائیں تو پھر...... سونیا آپی کو کل آ جانا ہے، وہ دن پھر غارت۔'' ''پنکی اور عزم کی جوڑی اچھی لگے گی۔'' وہ اونٹ پٹانگ باتیں سوچے جا رہی تھی۔ پتا نہیں دل کدھر بھٹکا جا رہا تھا۔ نیچے گاڑی کے دروازے کھلنے کی آواز

پر وہ ٹیرس سے جھانکنے لگی۔

عزم اور پنکی گاڑی کے پاس کھڑے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

''بہت اچھا کپل ہے، پنکی! خوش رہو۔'' خوامخواہ ہی اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ یک ٹک ان دونوں کو دیکھتے جا رہی تھی۔

☆☆☆

پھر انس ناردرن ایریاز میں چلا گیا اور سیر و تفریح کی غرض سے۔ حالانکہ امی، ابو اس پر خوب ناراض ہوئے تھے۔

''تم زندگی کے بارے میں اس قدر غیر سنجیدہ کیوں ہوتے جا رہے ہو انس! میں دن بدن تمہارا رویہ بدلا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ تم نے آخر کیا ٹھان رکھی ہے اور یہ اچانک بلا مقصد سیر سپاٹا، وہ بھی اس موسم میں جب چند ہفتوں تک ان علاقوں کی طرف جانے والے اکثر راستے بند ہو جایا کرتے ہیں موسم کی شدت کی وجہ سے۔'' ابو اس پر ناراض ہو رہے تھے۔

''میں اس سے پہلے لوٹ آؤں گا۔ آپ کو میں یقین دلاتا ہوں، جتنا سنجیدہ میں زندگی کے بارے میں اب ہوا ہوں، پہلے کبھی نہیں تھا۔ میں واپس آ جاؤں گا تو آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔'' وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو کھولتے بند کرتے کہہ رہا تھا۔

''انس! تمہاری عمر میں تمہارے دونوں بھائیوں کی لائف سیٹ ہو چکی تھی۔ جاب کے لحاظ سے بھی اور شادی کے لحاظ سے بھی اور یہ تمہارا غیر سنجیدہ رویہ ہی ہے کہ تم ابھی تک ڈھنگ کی جاب نہیں حاصل کر سکے۔'' ابو تو یوں بھی اس سے خفا رہتے تھے۔

''واپس آ کر کوشش کروں گا خوب سنجیدہ ہو کر......'' اس نے سر اٹھا کر کہا۔

''انس! واپس کب تک آؤ گے۔'' امی کچھ بے چین سی ہو کر بولیں۔

''دو ہفتے یا تین ہفتے یا......'' وہ امی کا مضطرب چہرہ دیکھنے لگا۔ ''میں آ جاؤں گا جلدی۔ آپ فکر مت کیجئے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔'' وہ امی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ امی نے بے ساختہ اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ماتھا چوم کر دل ہی دل میں اسے ڈھیروں سلامتی کی دعائیں دی تھیں۔

''اللہ حافظ۔'' وہ اٹھا اور کہہ کر باہر نکل گیا۔

''تمہارے اسی بے جا لاڈ پیار نے اسے کی سوچ کو غیر متوازن، غیر سنجیدہ بنا رکھا ہے۔ آخر تم اسے سمجھاتی کیوں نہیں۔'' ابو کی غصیلی تنبیہہ اس نے جاتے جاتے سنی تھی۔

اسے گئے دو ہفتے ہو چکے تھے پھر تین پھر چار۔ پورا مہینہ گزر گیا۔ اس دوران صرف ایک بار

اس کا فون آیا تھا، وہ بھی جانے کے چوتھے دن کہ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔

''انس! کب آ رہے ہو واپس۔'' سارہ نے ہی فون اٹینڈ کیا تھا۔ اس کے جانے سے وہی سب سے زیادہ اکیلا پن محسوس کر رہی تھی، بے قراری سے بولی۔

''جلد آ جاؤں گا، تم دعا کرنا۔''

''کیا...... کیا دعا کروں۔''

''مجھے...... اللہ میرے مقصد میں کامیاب کرے، میری نیت کو قبول کرے۔'' اس نے عجیب سی دعا بتائی۔

''یہ کیا دعا ہوئی، سیر کے دوران کیا مقصد ہو سکتا ہے۔''

''نیک...... نیک مقصد۔ مجھے اللہ کامیاب کرے، اللہ حافظ۔'' اس نے عجلت میں فون بند کر دیا۔ واپسی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

پھر سارہ، امی، ابو کا انتظار طویل ہو گیا۔ اسے گئے دو ماہ ہو چکے تھے، جب رمضان شروع ہوا۔ گھر میں انس کے نہ ہونے سے ایک عجیب سی اداسی جو اتر آئی تھی۔

''سارہ بیٹا! میرا دل پریشان ہے۔ میرا جوان بچہ کہاں چلا گیا۔ کوئی خیر خبر نہیں۔ اس کے دوستوں کی طرف پھر سے معلوم کرو۔'' امی کا دن رات کا چین برباد تھا۔ ابو ہر وقت گم صم بیٹھے رہتے۔ ہر فون کی بیل پر لپک کر فون اٹھاتے، اس کے سب دوستوں کی طرف بھی ہو آئے تھے۔ کسی کو بھی اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

''چند دنوں تک شمالی علاقہ جات میں برف باری شروع ہو جائے گی، موسم ادھر شاید سرد ہوتا جا رہا ہے، رستے بلاک ہو جائیں گے، وہ کیوں واپس نہیں آ رہا۔'' ابو بے چینی سے بولے۔

''معلوم نہیں۔ غیر ذمہ دار تو وہ کبھی بھی نہیں تھا، کم از کم فون یا خط کچھ تو اپنی اطلاع دے۔'' امی رونے لگیں۔

''وہ ایسا ہی غیر ذمہ دار ہے۔ میں کہتا تھا نا تم سے، سمجھاؤ اسے مگر تم...... تم نے کبھی میری بات کو سنا ہی نہیں۔'' ابو پریشانی میں بولتے۔

''ابو پلیز...... امی کی طبیعت پہلے ہی اچھی نہیں۔'' سارہ روتے ہوئے امی کو اپنے ساتھ لگا لیتی تو ابو کڑھتے ہوئے کمرے سے چلے جاتے۔

''سارہ! وہ کہاں نوکری کرتا تھا، اس کا آفس تو پولیس نے سیل کر دیا ہے۔ ناصر پتا کرنے گیا تھا، اسی لیے تو دونوں بھائیوں نے انس کی رپورٹ پولیس میں نہیں کرنے دی، اس طرح وہ دونوں بھی

مشکوک قرار پاتے۔ کیا پتا اب اس دفتر میں کوئی آ گیا ہو، کوئی فون نمبر وغیرہ۔ میرا دل وسوسوں کے بھنور میں چکریاں کھا رہا ہے، کچھ ہو نہ جائے میرے لال کو۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھنا، اپنی رحمت کے سائے میں۔'' امی ہاتھ پھیلا پھیلا کر اس کی سلامتی کی دعا مانگتیں۔

ایک رات سارہ نے اس کی الماری کا لاک توڑ کر ساری تلاشی لی۔ ڈائریاں، جرائد، اخبار، آرٹیکلز، مسلمانوں کی دگرگوں حالت اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم اور مغربی اقوام کا سرد ظالمانہ رویہ اور اس رویے کا توڑ جہاد۔ ان ہی سوچوں میں لبریز اس کی تحریریں تھیں۔ ایک ڈائری سے اس نے کچھ فون نمبرز نوٹ کیے۔ اگلی صبح دھڑکتے دل سے اس نے نمبر ملایا۔ تیسری بل پر کسی نے فون اٹینڈ کیا۔

''السلام علیکم۔ جی فرمائیے۔'' ایک شائستہ سے لہجے میں نوجوان آواز تھی۔

''جی...... یہ آفس کا نمبر ہے۔'' وہ رک رک کر بولی۔

''آپ نے کدھر فون کیا ہے۔'' لہجہ ہنوز نرم تھا۔

''دیکھیں۔ مجھے کچھ معلومات لینی ہیں۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے بات شروع کرے۔

''کیسی معلومات؟''

''میرا بھائی آپ کے آفس میں کام کرتا تھا بلکہ شاید ابھی بھی کرتا ہے۔''

''بی بی...... مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''آپ کے آفس میں کوئی شعبہ ہے جس میں ٹرانسلیٹر کی ضرورت تھی۔''

''ہاں مگر وہ تو عارضی ویکنسی تھی، آج کل تو نہیں ہے۔''

''پہلے کون تھا اس سیٹ پر۔''

''آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''دیکھیں۔ میرا بھائی ڈھائی ماہ سے گھر سے غائب ہے۔ ایک دو ہفتے کے لیے ناردرن ایریاز میں تفریح کا کہہ کر گیا تھا، ابھی تک نہیں لوٹا۔'' وہ کچھ غصے سے بولی۔

''تو اس سے ہمارا کیا تعلق۔'' وہ لاتعلقی سے بولا۔

''وہ آپ کے آفس میں کام کرتا تھا، یہ تعلق تو ہے نا۔''

''بی بی! ہمارا کوئی آفس نہیں ہے، آپ کا بھائی ہمارے ساتھ کام کیوں کرے گا۔''

''پلیز! ہم بہت پریشان ہیں، میری امی بیمار ہیں، میرے ابو بہت فکر مند ہیں، کیا کریں، کس سے پوچھیں؟'' وہ رو دینے کو تھی۔

"پولیس میں رپٹ کرادیں۔شاید آپ کے بھائی کا اغوا کرلیا گیا ہو۔"

"خدانہ کرے۔" وہ دہل گئی۔

"آپ کے بھائی کا نام کیا ہے۔؟" چند لمحوں بعد وہ بولا۔

"محمد انس وحید۔" دوسری طرف پھر خاموشی چھاگئی۔

"آپ کو معلوم ہے نا میرے بھائی کے بارے میں؟" وہ اس کی خاموشی پر بولی۔

"نہیں نہیں، ہمیں کچھ نہیں معلوم۔" اس نے کہا فون بند کردیا پھر وہ سارا دن ٹرائی کرتی رہی یا تو نمبر بزی ملتا تھا یا پھر بیل جانے کے باوجود کوئی اٹینڈ نہ کرتا۔تیسرے دن فون مل گیا اور ریسو کرنے والا بھی وہی شخص تھا۔

"دیکھیے، آپ کو میرے بھائی کے بارے میں اگر کوئی علم ہے اللہ کے لیے، آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کا واسطہ مجھے تو بتادیں۔ہم بہت پریشان ہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔دوسری طرف خاموشی چھاگئی۔

"پلیز فار گاڈ سک۔"

"آپ آج رات دس بجے فون کے پاس ہی رہیے گا۔آپ کا بھائی آپ سے بات کرے گا۔اللہ حافظ۔" اس نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

رات کے دس بجے، یہ سارہ کا دل ہی جانتا تھا۔

"سارہ! میں بالکل ٹھیک ہوں، اللہ کی مہربانی ہے۔کہاں ہوں اور کب آؤں گا۔مجھ سے یہ سوال نہ کرنا۔میں جواب نہیں دوں گا۔" انس کی آواز اس نے ڈھائی ماہ بعد سنی تھی۔

"انس! تم کسی مہم پر ہو، کسی خاص......" اس نے اندازہ لگایا۔

"یہی سمجھ لو، امی اور ابو ٹھیک ہیں۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

"امی بہت پریشان ہیں اور ابو بھی۔تم آجاؤ کب آؤ گے۔انس! پلیز......"

"میں شاید بہت جلد آؤں یا شاید کبھی بھی نہ آؤں ہوسکتا ہے، یہ میری تم سے آخری گفتگو ہو یا ابھی زندگی میں ملاقات لکھی ہو۔"

"انس! تم کیسی باتیں کررہے ہو۔کیا ہوگیا ہے تمہیں اگر تم میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں مار بیٹھتی۔" وہ رونے لگی۔

"اسی وجہ سے میں فون نہیں کررہا تھا۔چلو آنسو پونچھو میں فون بند کررہا ہوں۔"

"میں نہیں روؤں گی، پلیز، تم فون بند نہیں کرنا۔"

"سارہ! میں اتنی لمبی بات نہیں کرسکتا۔"

"کیا تمہیں کسی نے اغوا کرلیا ہے یا زبردستی اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کررہے ہیں۔"

وہ کمرے سے لاؤنج میں دیکھتے ہوئے محتاط لہجے میں بولی۔ابو ٹی وی دیکھ رہے تھے۔افغان علاقوں پر اتحادی افواج بےدردی سے بمباری کررہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں بھئی میں اپنی مرضی سے ادھر ہوں۔اللہ حا......"

"انس......انس......رکو......" وہ چلائی۔

"ہاں کیا ہے۔"

"انس! تم افغانستان میں ہونا۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔وہ چپ کرگیا۔

"جواب دونا، میں سچ کہہ رہی ہوں نا؟"

"ہاں۔" وہ تھکن زدہ لہجے میں بولا۔"مگر تم امی ابو سے ذکر نہیں کروگی۔کہہ دینا۔میں اپنے آفس کے ریسرچ ورک کے سلسلے میں ناردرن ایریاز میں رک گیا ہوں، جلد آجاؤں گا۔اپنا خیال رکھنا سارہ! تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔

امی، ابو، بھائی، گھر، اپنا شہر، لوگ، سب کو اللہ کی امان میں دیا۔" اللہ حافظ۔"

سلسلہ منقطع ہوتے ہی اس کی بھرائی ہوئی آواز ایئرپیس سے غائب ہوگئی تو سارہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے بےاختیار رونے لگی۔

"انس! یہ تم کس رستے پر چل پڑے ہو۔انس! یہ رستہ تو کانٹوں بھرا ہے۔انس! اس رستے سے تو کوئی واپس نہیں آتا۔تمہیں میرا، امی کا، اپنی زندگی کا کسی کا بھی خیال نہ آیا۔یہ تم نے کیا کیا۔" جیسے سب روٹین کی زندگی گزار رہے ہیں، تم کیوں ایسی زندگی نہ گزار سکے۔سب سے الگ رستہ کیوں چن لیا۔"

وہ ساری رات اور آنے والی کتنی بےشمار راتیں اس کی روتے گزریں۔اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتے۔افغانستان کے حالات دن بدن خراب ہوتے چلے جارہے تھے۔اس کا دل اندر ہی اندر سہما ہوا تھا۔امی ابو سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ آفس ورک کے سلسلے میں دو ماہ کے لیے تائیوان چلا گیا ہے، جلد ہی آپ سے فون پر بات کرے گا۔دونوں کو ہی اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

رمضان چپکے چپکے گزر رہا تھا۔اتنی عبادت اتنی خضوع وخشوع کے ساتھ اس نے کبھی نہیں کی تھی، جتنی اس بار کررہی تھی۔

رمضان کا آخری عشرہ بھی بس گزر ہی چلا تھا، تین چار روزے باقی تھے۔وہ سحری کے لیے

اٹھ چکی تھی۔ نوافل سے فارغ ہو کر کھانے کی تیاری کے لیے کچن کا رخ کیا کہ کال بیل بج اٹھی۔

"اس وقت کون آ گیا۔" وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ ابو نے جا کر گیٹ کھولا۔ ناصر بھیا اپنی فیملی کے ساتھ سیکنڈ فلور پر ہوتے تھے اور عامر بھیا تھرڈ فلور پر۔

"تم..... تم اس وقت کہاں تھے اتنے عرصے سے؟" ابو کی تیز آواز پر وہ دوڑ کر گیٹ تک پہنچی تھی۔ امی بھی ننگے پاؤں اس کے پیچھے کمرے سے نکلی تھیں۔

مدھم لائٹس میں اس نے انس کو پہچان لیا تھا۔ اگرچہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا مگر پھر بھی وہ اسے پہلی نظر میں پہچان گئی تھی۔

"کک..... کون آیا ہے۔" امی اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔

"آؤ اندر....." ابو اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے مڑے تو وہ سر جھکا کر ان کے پیچھے چل پڑا۔ امی کی خوشی کا تو جیسے کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ دن نکلنے تک اسے سامنے بٹھائے چومتی رہیں، پیار کرتی رہیں۔ تینوں فلورز میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ انس آ گیا، انس آ گیا۔" بچے بڑے سب اسے دیکھنے، ملنے آ رہے تھے۔

"امی! انس کو آرام کرنے دیں۔" وہ امی کے پاس آ کر نرمی سے بولی۔

انس کی ٹانگ زخمی تھی، وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ "پہاڑ سے گر گیا تھا، بیمار رہا، اسی لیے آپ کو اطلاع نہیں کی۔ آنس درک کی وجہ سے بھی رکنا پڑا۔" وہ ابو کی ساری ڈانٹ ڈپٹ اور بھائیوں کے غصے کے جواب میں یہی کہہ رہا تھا۔

"بہت غیر ذمہ دار ہے یہ ابو! اس پر آپ کی سختی کوئی اثر نہیں دکھاتی۔ ہم کبھی ایسی حرکتیں کرتے تو آپ ہمیں شاید زندہ نہ چھوڑتے۔" عامر بھیا ابو کو اور اکسا رہے تھے۔

"جاؤ تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو، میں تم سے پھر بات کروں گا۔" ابو، انس سے بولے۔

"تم اتنی جلدی کیوں آ گئے، ابھی تو جنگ جاری تھی۔ افغانستان کو فتح دلا کر آنا تھا۔" وہ اس کے ساتھ کمرے میں آئی تھی، طنز سے بولی۔

"کاش یہ میرے بس میں ہوتا۔ سارہ! ہمارا جذبہ جہاد ہمیں دنیا میں کہیں بھی پسپا نہیں ہونے دے سکتا۔ اگر ہماری صفوں میں اس قدر بدنظمی، بے اتفاقی نہ ہو۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ہم دشمن کے ہاتھوں کبھی نہیں مرتے، ہمارے اپنے ہمیں مارتے ہیں۔ ہم کبھی شکست نہ کھائیں، اگر ہماری آستینوں میں پلنے والے صادق و جعفر ہماری شکست کی بازی سجا کر ہمارے دشمنوں کے حوالے نہ

کر دیں۔ سارہ! ہم اپنوں کے ہاتھوں برباد ہونے والی شکست خوردہ قوم ہیں۔ ہم فتح یاب کیسے ہو سکتے ہیں اب اس وقت، ادھر رہ کر لڑنا جذبہ جہاد کی بھی توہین ہے۔ وہاں جہاد نہیں، قتل و غارت ہو رہا ہے۔ انسانی سروں کی بولیاں لگائی جا رہی ہے لاشوں کی گنتی نہیں، ان کے ڈھیروں کی گنتی کی جا رہی ہے۔ انسان انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ زندہ جیتے جاگتے انسانوں کو، مسلمانوں کو ہمارے اپنے مسلمان بھائی کینٹیروں میں..... نہیں نہیں..... زندہ قبروں میں بھر بھر کر جلتے صحراؤں اور گوانتانا موبے کے حوالے کر رہے ہیں۔ بس کرو سارہ! جاؤ یہاں سے۔ مجھے نیند کی تین چار گولیاں دے جاؤ، میں بہت دنوں تک سونا چاہتا ہوں، یہ سب کچھ بھول کر....." وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھا۔ وحشت اس کے چہرے کے ایک ایک عضو سے جھلک رہی تھی۔

"واپسی کے اس سفر میں کئی بار مجھے لگا، میں زندہ نہیں ہوں۔ میری روح، میرا مردہ جسم محو سفر ہے۔ تم جاؤ، مجھے نیند کی ٹیبلٹ لا دو پلیز....." تو وہ آہستگی سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔

"ہائے پھپھو! کن خیالوں میں گم ہیں۔" پنکی کی چہکار اس کے کانوں میں پڑی تو وہ ماضی کے دھندلکوں سے باہر نکلی۔

"کہیں بھی نہیں، یہیں ہوں۔" ہو پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

"پھپھو! اتنی ٹھنڈ میں اوپر کیا چلہ کاٹ رہی ہیں۔ یکا یک سردی سی ہو گئی ہے، چلیں نیچے۔"

"ہاں چلو، تم کہاں گئی تھیں۔"

"پیزا ہٹ۔ ہم نے عزم سے ٹریٹ لی ہے۔ پتا ہے آج ان کی برتھ ڈے تھی۔ میں نے الٹا ان سے گفٹ لیا۔ وہ کہتے ہیں۔ اپنی برتھ ڈے پر گفٹ لیتا نہیں، دیتا ہوں، وہ بھی اپنی فیورٹ ہستی کو۔ میں نے کہا۔ وہ فیورٹ ہستی میں کیوں نہیں ہو سکتی۔ فیورٹ کے لیے مجھ میں کیا کمی ہے۔ وہ فوراً مان گئے۔ یہ انہوں نے مجھے لے کر دیا ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی مخملیں ڈبیا کھول کر آگے کر دی۔ کندن کا دمکتا لشکارے مارتا سیٹ تھا۔

"میرے بلیک سوٹ کے ساتھ زبردست لگے گا۔ لائبہ کی منگنی پر پرسوں پہن کر جاؤں گی۔" وہ جوش سے بولتی رہی تھی۔

"پنکی....." سارہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی پھپھو! اچھا نہیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"اچھا ہے مگر....."

"آپ لے لیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں، مجھے نہیں چاہیے مگر اس طرح کسی سے گفٹ لینا وہ بھی...... پنکی! یہ اچھی بات نہیں۔ ان سے کون سا ہمارا قریبی تعلق ہے جو تم یوں گفٹ لیتی پھر رہی ہو۔" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

"قریبی تعلق بنتے کون سی دیر لگتی ہے۔ یہ بات تو ان کو بھی معلوم ہے، میں نے اصرار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنی مرضی سے لے کر دیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی لے کر دیا ہوگا، ہے نا۔" وہ رک رک کر بولی۔

"تمہیں عزم اچھے لگتے ہیں۔" سارہ اسے دیکھنے لگی۔

"ان میں برا لگنے والی کوئی بات ہی نہیں، آپ کو نہیں لگتے۔"

"تم نے بھابھی کو دکھایا یہ سیٹ۔" وہ بات ٹال کر اترنے لگی۔

"نہیں، پہلے آپ کو دکھا رہی ہوں۔ ویسے مما ذرا اعتراض نہیں کریں گی، مجھے پتا ہے۔ چلیں نیچے، آپ کے لیے ہم پیزا پیک کروا کے لائے ہیں۔ عزم اور ان کی بھابھی تو رات کا کھانا کھا کر جائیں گے۔ آ جائیں آپ بھی۔" وہ اس سے پہلے سیڑھیاں پھلانگتی آگے آگے اتر گئی تھی۔ سارہ کے اٹھتے قدم جیسے جم سے گئے۔

☆☆☆

پھر انس کتنے دنوں تک ڈسٹرب رہا، بیمار رہا اور کھویا کھویا اپنے کمرے میں چت لیٹا چھت کو بغیر پلکیں جھپکے وہ یک ٹک دیکھے جاتا۔ کئی کئی دن تک اسے شیو کرنا یاد نہ رہتا۔ کمرے سے تو وہ بہت ہی کم نکلتا تھا۔ دونوں بھائی اب اس سے اور نالاں ہو گئے تھے اور ابو کو تو جیسے ثبوت مل گیا تھا اس کی تمام تر نالائقیوں اور ناکامیوں کا۔ اٹھتے بیٹھتے امی کو سناتے رہتے۔

"انس! میرے بچے! اٹھو۔ کمرے سے باہر نکلو۔ اس مردوں کی سی حالت کو خود سے اتار پھینکو۔ زندگی کی طرف آؤ، اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ اس کا شکر ادا کرو۔ بہن بھائیوں میں بیٹھو۔ بچے تمہاری شکل دیکھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو خیال کرو۔" امی دن میں دس بار اس سے التجا کرتیں مگر وہ بے تاثر نگاہوں سے انہیں تکتا رہتا۔ زیادہ اصرار کرتیں تو کروٹ بدل لیتا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"انس! پلیز اٹھو نا۔ کل شاید عید ہو جائے، مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ مارکیٹ تک لے چلو۔" سارہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

"وہ لوگ جن پر دن رات بمباری ہو رہی ہے، ان کے گھروں کو مسمار کیا جا رہا ہے، روزے کی حالت میں انہیں منوں ملبے تلے دبایا جا رہا ہے۔ ان کے بازو، ہاتھ، ٹانگیں ان کے جسموں سے کٹ

کٹ کر دور گر رہے ہیں۔ سوچو، ان کی عید کیسی گزرے گی۔ ہم کیسی امت مسلمہ ہیں جو اپنے بھائیوں کو اس حال میں دیکھ کر بھی عید کی خوشیاں منانا چاہ رہے ہیں۔" وہی ہراس وہی وحشت پھر سے اس کی آنکھوں میں تیرنے لگتی۔

"پلیز انس! بس کرو، آخر کب تک یوں اپنی حالت پاگلوں جیسی حالت بنائے رکھو گے جس کا فائدہ نہ تمہیں ہو رہا ہے، نہ تمہارے اردگرد کے لوگوں کو، نہ ان لوگوں کو جن کے غم میں تم گھلے جا رہے ہو۔ تمہارے والدین تمہاری وجہ سے کس درجہ پریشان ہیں، کیا تمہیں اس کی خبر ہے۔ ایک صحابی رسول نے بیمار والدہ کو چھوڑ کر جہاد پر جانے کی اجازت مانگی تھی۔ آپ ﷺ نے منع کر دیا کہ نہیں، تم جا کر اپنی والدہ کی خدمت کرو۔ تمہیں ان دونوں کا خیال کیوں نہیں آ رہا۔ تمہاری وجہ سے ان کے دلوں کی کیا حالت ہے۔ جوان، توانا، صحت مند، پڑھا لکھا بیٹا یوں دن رات بستر پر پڑا رہے تو سوچو ایسے بیٹے کے باپ کی کیا حالت ہوگی۔" سارہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"رات بھی سحری کے لیے اٹھی تو ابو باہر باغیچے میں چہل رہے تھے۔ حالانکہ باہر بہت سردی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اس وقت نوافل پڑھا کرتے تھے۔ جائے نماز اسی طرح چھوڑ کر باہر آ گئے تھے۔ میں نے اندر جانے کو کہا کہنے لگے۔ انس اٹھا ہے روزہ رکھنے کے لیے۔ اس سے کہو، ابھی روزہ نہ رکھے، کمزوری ہے، بہت اور اس کی ٹانگ کا زخم کیسا ہے اب۔ وہ تم سے خفا ہیں مگر پھر بھی تمہارا خیال ہے۔ کچھ تو سوچو، پلیز انس! تم تو اتنے زندہ دل ہوتے تھے، اتنے خوش باش۔ تمہاری خوشی، چہکار، زندہ دلی کہاں گئی۔ زندہ ہو تو زندگی کا ثبوت دو۔ جو ان حالات سے نبرد آزما ہیں، ان کے لیے اللہ سے دعا کرو۔"

"ہاں، ساری قوم محض دعا ہی تو کر رہی ہے۔ اس میں بھی چھٹکارا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم چلو، میں چینج کر کے آتا ہوں۔ تمہیں شاپنگ کروانے لے جاتا ہوں۔" اس پر کچھ اثر ہوا تھا یا نہیں مگر اس نے سارہ کو شاپنگ کروائی۔ شام کو سب کے ساتھ روزہ بھی افطار کیا اور رات کو دیر تک امی ابو کے کمرے میں بھی بیٹھا رہا۔

چاند رات تھی، پنکی اور سارہ کو طلحہ کے ساتھ چوڑیاں پہنانے بھی لے گیا۔

"عید کے بعد اب تم جاب کے لیے کوشش کرو، میں نے فیروز اینڈ کو سے بات کر لی ہے۔ ایک ویکنسی ہے ان کے پاس۔ وہ انشاءاللہ تمہیں رکھ لیں گے۔" ابو اس کی تبدیلی سے خوش تھے۔ خوشی خوشی اسے بتا رہے تھے۔

"ہاں چلا جائے گا، جاب کرے گا تو زندگی کی طرف لوٹے گا۔ میں عید کے بعد ثریا سے بھی

بات کر رہی ہوں۔'' امی کو اس خوشی کے عالم میں نئی سوجھی۔

''کیسی بات امی؟'' سارہ نے جانتے بوجھتے پوچھا تھا۔

''ارے بھئی نیلی کی بات انس کے لیے۔ بہت ہوگئی اس کی جہاں نوردی، اب شادی کرے، بیوی کی زنجیر پیروں میں پڑے گی تو گھر میں ساری کائنات دیکھنے لگے گا۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں نا'' امی نے ابو کی تائید چاہی۔

''میں تو خود ان دونوں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہ رہا ہوں، زندگی کا کیا بھروسا۔''

''اللہ آپ کی لمبی عمر کرے، میری عمر بھی آپ کو لگے۔ انشاء اللہ دونوں کا اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔'' پر لگتا تھا اللہ نے امی کی دعا کو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ عید کے ایک ہفتے بعد جب انس بھی زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا، فیروز اینڈ کو میں اسے جاب مل گئی تھی، امی نے خالہ جان سے نیلما کی بات بھی کر لی تھی، چھ ماہ بعد شادی کا بھی سوچ لیا تھا۔ اس دوران سارہ کا بھی کوئی اچھا رشتہ مل جاتا تو دونوں کی اکٹھا کرنے کا بھی سوچ لیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ ٹھیک ہونے جا رہا تھا کہ جیسے سب کچھ غلط ہو گیا، الٹ پلٹ۔

''ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا اور ہاسپٹل پہنچنے سے پہلے ہی وہ ہر دعا سے غافل ہو گئے۔ ایک اچانک قیامت تھی جو ان سب پر ٹوٹ پڑی تھی۔ امی کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ ان کا زندگی بھر کا ساتھی بیچ رستے میں چھوڑ گیا تھا، ان کی شوگر کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ نیم بے ہوشی، نیم غنودگی ہر وقت ان پر طاری رہتی۔ ان دنوں انس اور سارہ کی سرگرمیوں کا محور امی کی ذات تھی، دونوں کو ان ہی کی فکر لگی رہتی تھی۔

''سارہ! میں آفس جا رہا ہوں، امی سو رہی ہیں، تم ان کا خیال رکھنا۔'' صبح جانے سے پہلے وہ یہ فقرہ ضرور دہراتا تھا۔

''پھر غم کی پرچھائیاں مدھم ہونے لگیں۔ زندگی کی گہما گہمی نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ امی کو بھی کچھ قرار آ گیا۔ کوئی کسی کو کتنی دیر تک رو سکتا ہے۔ وہ بھی ابو کو یاد کر کے بہت روئی تھیں مگر پھر سارہ اور انس کی خاطر خود کو سنبھال لیا۔

''سونیا! سارہ کا کہیں رشتہ دیکھو۔ تمہارے ابو بھی حسرت دل میں لیے چلے گئے۔ میں اس فرض سے جتنی جلدی ممکن ہو، فارغ ہونا چاہتی ہوں۔'' اب دوسری فکر امی کو دامن گیر ہوئی۔

''ان ہی دنوں امریکہ نے اتحادی افواج کی مدد سے عراق پر حملہ کر دیا۔ سب نے دیکھا، سب نے سنا، سب کو صدمہ بھی ہوا اور دلی رنج بھی۔ باقی دنیا کے مسلمانوں کی بے حسی پر غصہ بھی آیا جو عراق کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ دن تک عراق کا موضوع ہاٹ کیک کی طرح رہا۔ ٹی وی، اخبار و جرائد لوگوں کی محفلوں میں ہر جگہ۔ پھر وہی اجتماعی بے حسی جس کا سب شکار ہو چکے ہیں۔ روزمرہ کی فکروں میں یہ احساس بھی دبتا چلا گیا۔

انس آج کل کیا سوچ رہا ہے، اس نے اس نئے ستم کو کس طرح سے لیا ہے، سارہ کو کچھ پتا نہیں چل سکا۔ ایک تو اس کے فائنل ایگزام ہو رہے تھے، دوسرے انس بھی صبح کا گیا رات کو لوٹتا تھا۔ پوچھو تو ایک ہی جواب۔

''امی! آفس میں کام بہت بڑھ گیا ہے، میری نئی جاب ہے، میں کوئی کوتاہی نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ امی کو ٹال سکتا تھا مگر سارہ کو نہیں۔ اس کے ایگزام تمام ہوئے بھی ایک ہفتہ ہو چلا تھا مگر انس کی تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اس روز چھٹی تھی۔ سارہ نے اسے صبح گھر سے نکلتے پکڑ لیا۔

''یہ تم کہاں جا رہے ہو؟ آج تو چھٹی ہے۔'' وہ لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ جب انس جانے لگا۔

''کہیں بھی نہیں، ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا اور مجھے کہاں جانا ہے۔'' وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔

''دوست مصروفیات، تمہیں زیادہ عزیز نہیں ہو گئے تم نے پوچھا بھی نہیں سارہ! تمہارے پیپرز کیسے ہوئے ہیں۔''

''اچھے ہی ہوئے ہوں گے، مجھے معلوم ہے۔ دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ سی این این پر عراق کی صورت حال دکھائی جا رہی تھی۔ بمباری سے اٹھتا دھواں مسمار ہوتی خاک کا ڈھیر بنتی بلند و بالا مضبوط پتھروں کنکریٹ کی عمارتیں، سرسبز لہلہاتے درخت دور سے خاکستری رنگ کے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف آگ، شعلے، دھواں مٹی، گرد و غبار، چیخ و پکار، وحشت کے عالم میں بھاگتی ہوئی دوڑتی چیختی چلاتی خلق خدا، زخمی سالم، ادھوری، دم توڑتی اللہ کی پیدا کردہ پیاری مخلوق۔ اشرف المخلوقات دم توڑتی، سسکتی انسانیت۔

انس یک تک سانس روکے مبہوت سا تیزی سے بدلتے مناظر خاک و خون کا کھیل اور

فرائٹے بھرتی نیوز کاسٹر کی زبان میں تازہ صورت حال کو سن رہا تھا یا نہیں، سارہ نے ایک نظر اسے دیکھ کر جلدی سے چینل بدل دیا۔

''نچ پنجابن نچ۔ پنجابن نچ......'' ایک دم ہی منظر بدل گیا۔

''ہاں یہ کام بہت آسان ہے۔ چینل بدل دینا، ذہنی خلجان سے جھٹ پٹ نجات حاصل کر لینا کس قدر آسان کام ہے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا۔'' اس نے کہتے ہوئے تھک کر صوفے سے ٹیک لگائی۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے، تم سب لوگوں کی طرح کیوں محسوس نہیں کرتے۔ روٹین کی زندگی جیسے سب گزارتے ہیں، تم کیوں نہیں گزار سکتے۔ مجھے لگتا ہے آج کل پھر تمہارے دماغ میں وہی کیڑا کلبلا رہا ہے۔'' سارہ چڑ کر بولی۔

''میرے ساتھ مسئلہ پتا ہے کیا ہے۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سارہ بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''سارہ! مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ اذیت زدہ لہجے میں بولا۔ سارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''سارہ مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''مجھے اس دن سے ڈر لگتا ہے جب محشر کی گھڑی ہو گی اللہ کے حضور اس کائنات کے سب اتار چڑھاؤ کی بزم بجی ہو گی۔ میزان کے پلڑے میں اچھائی برائی دھڑا دھڑ تولی جا رہی ہو گی۔ انسانوں کے اعمالوں کا حساب کتاب دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو رہا ہو گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس روز جب میرا اللہ پوچھے گا۔ انس! تم اس روز کہاں تھے جب میرے کلمہ گو بندوں پر قیامت توڑی جا رہی تھی۔ میرے نام لیواؤں کو مٹی کے تودوں کی طرح مسمار کیا جا رہا تھا۔ تم اس روز فوڈ اسٹریٹ میں باربی کیو کھا رہے تھے۔ سی ڈیز پر مارلن منرو، ایشوریا رائے، شاہ رخ خان کی موویز دیکھ رہے تھے۔ مزے سے اپنے لگژری بیڈ روم میں آرام کر رہے تھے۔ اے سی کی ٹھنڈی ہواؤں میں اینٹھ رہے تھے۔ میرے بندے، میرے نام لیوا بندے بموں، گولوں اور ٹینکوں کی زد میں تھے۔ تم سب جانتے تھے، سن رہے تھے، دیکھ رہے تھے۔ مگر کسی تماش بین کی طرح، کسی راہ گیر کی طرح، کسی دروازے کے اجنبی ہمسائے کی طرح۔ تمہیں ایک بار بھی میرا خوف نہ آیا۔ ایک بار بھی تمہیں مجھ سے ڈر نہ لگا۔ ایک بار بھی میرے قہر کے خیال سے تمہارا کلیجہ نہ کانپا، نہ تمہیں میری پرسش کا خیال آیا کہ اللہ پوچھے گا کہ تم اٹھتے اپنے بھائیوں کے درد کا احساس کرتے۔ ان کے شانہ بشانہ جا کھڑے ہوتے۔ دو چار کے زخموں پر مرہم رکھتے، کسی ایک ہی کی جان بچا

لیتے تو شاید میں بھی آج تمہاری طرف نگاہ کر لیتا مگر تم تو اپنی مستیوں میں مست تھے، خوشیوں میں مگن تھے۔ تم نے میرے فرمان کو، میرے نام کو کچھ سمجھا ہی نہیں۔ لو میں بھی آج تمہیں نہیں جانتا۔ جیسے دنیا میں تم مجھے نہیں جانتے تھے، لو میں بھی اپنا منہ پھیرتا ہوں تم سے جیسے تم میرے حکم جہاد کو سن کر منہ پھیر لیا کرتے تھے۔ بتاؤ سارہ! میں اس دن کیا کروں گا، کیسے اپنے اللہ کا سامنا کروں گا، کیسے ان کے پیارے محبوب سے آنکھیں ملاؤں گا، کیسے اپنی شفاعت کی امید رکھوں گا۔ سارہ! مجھے اس دن سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ہم پر...... ہم پر تو کھانا پینا حرام ہو چکا ہے۔ حکم جہاد ہم پر لاگو ہو چکا ہے پھر کیسے ہم مزے سے روٹین کی زندگی گزار سکتے ہیں کیسے......'' وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑا۔

''میرا اللہ میری طرف نہیں دیکھے گا، میرے پیارے نبی ﷺ میری جان ان پر قربان، وہ مجھ سے اپنا رخ مبارک پھیر لیں گے۔ سارہ! میں تو خوار ہو گیا۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ مجھے وہ دن، وہ لمحے ڈراتے ہیں۔'' وہ منہ چھپائے روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا بھائی، اس کا انس چھ فٹ سے جب اس کا قد اور نکلنے لگا تو گھر والوں نے بے تحاشا اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

''تمہاری عقل تو اب گھٹنوں سے بھی رخصت ہونے کو ہے۔ سنبھالو اپنے اس عالم چنا جیسے قد کو۔'' وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ سارہ دم بخود بیٹھی تھی۔

''انس! اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں، ہم انفرادی طور پر تو کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تو حکومتیں......'' وہ اسے سمجھانے لگی۔

''حکومتیں...... کون سی حکومتیں۔'' اس نے شعلہ بار نگاہیں اٹھائیں۔ ''حکومت تو ہمارے اوپر ہمارے نفس کی ہے، جو جہاد کا نام سن کر ہی بدکتا ہے اور میرے آقا ﷺ کا فرمان ہے جیسے تم خود، ویسے تمہارے حکمران۔ ان کو الزام مت دو آئینے میں اپنی صورتیں دیکھو۔ جہاد کے نام سے ہراساں اس پلے ہوئے نفس کو آئینے میں دیکھو جو خود کو ایک کانٹا چبھونے کا بھی روادار نہیں۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا، خود غرض کون ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''ایک کولیگ سے ملنے۔ اگلے ہفتے ہمارے آفس کی میٹنگ ہے اسلام آباد میں، مجھے بھی جانا ہو گا، تین چار دن لگیں گے۔ اس سلسلے میں بریفنگ تیار کر رہا ہوں اپنے کولیگ کے ساتھ مل کر۔ شام تک آ جاؤں گا۔ تم امی کا خیال رکھنا۔ شام کی چائے اکٹھے پییں گے۔'' وہ رکا نہیں، کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

پھر اگلے ہفتے جو وہ اسلام آباد گیا تو آج تک نہیں لوٹا۔ ڈیڑھ سال سے اوپر ہو گیا اسے گئے ہوئے اور گھر والوں کو اسے تلاشتے ہوئے۔ اس کی کہیں خبر نہیں ملی تھی اور سارہ کو تو اس کی تلاش سے بھی جیسے کچھ غرض نہ تھی۔ اسے معلوم تھا، وہ کہاں گیا ہوگا۔

"امی! پھر آپ کا کیا خیال ہے عزم کے پروپوزل کے بارے میں پنکی کے لیے۔" ناصر بھیا کی آواز پر اس کے خیالوں کے بھاگتے گھوڑے یک لخت تھم گئے۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی تھی اور کمرے میں امی کے پاس عامر بھیا اور سیما بھابی بھی تھے۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں، اس کی والدہ کو تو آنے دو۔ پنکی ابھی چھوٹی ہے اور......"

"چھوٹی کوئی نہیں ہے، پورے انیس سال کی ہے لڑکیوں کے لیے شادی کی آئیڈیل عمر ہے پھر جو ذرا ایک دو سال اور گزر جائیں تو ڈھنگ کا رشتہ ملنا محال ہو جاتا ہے، بیٹھی رہ جاتی ہیں۔" سیما بھابی بولیں۔ "اور آسیہ آنٹی تو آج کل میں آنے والی ہیں، وہ بھی بات کریں گی۔"

"سونیا سے مشورہ کر لو۔" امی نے بے دلی سے کہا۔ اس کو معلوم تھا، امی کے لہجے میں کوئی آس چمک رہی ہے۔

"کیوں، سونیا ہم سے اپنے گھر کے مشورے کرتی ہے۔" سیما بھابی "نہ" سننے کو تیار نہ تھیں۔

"چلو جو تم مناسب......"

"مما، پپا دادو...... آپ نے نیوز سنی۔" طلحہ اپنے کمرے سے نکلا تھا اور تقریباً دوڑتا ہوا ان کے کمرے میں آیا تھا۔

"کیوں کیا، آفت آ گئی ہے نیوز میں۔ پہلے کیا کم مصیبتیں ہیں۔" سیما بھابی بولیں۔

"مما! انس چاچو کو عراق کی ایک جہادی تنظیم نے دو اور پاکستانیوں کے ساتھ یرغمال بنا لیا ہے، ابھی سی این این پر نیوز الرٹ میں آیا ہے۔" وہ جلدی جلدی بولا تو سارہ اپنی جگہ سے چھلانگ لگا کر اٹھی۔

"کیا......؟ کہاں......؟" وہ طلحہ کا کندھا کھینچ کر بولی۔

"طلحہ! کیا کہہ رہے ہو، میرا بچہ انس......" امی بے قراری سے بیڈ سے اترنے لگیں تو طلحہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"وہ دادو کچھ نہیں، وہ چاچو کے دوست ہیں۔" ناصر بھیا اسے گھور رہے تھے۔ وہ جلدی سے بولا پھر سب نے باہر آ کر ٹی وی آن کیا تو یہی خبر تھی۔ انہوں نے بہتر گھنٹوں کی مہلت دی تھی، کچھ شرائط گورنمنٹ سے منوانا تھیں جن کے نہ ماننے کی صورت میں تینوں کے سر قلم کر دیے جائیں گے۔ سارہ کو تو جیسے حوصلے ہی ڈھے گئے۔ وہ وہیں نیچے کارپیٹ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"سارہ...... سارہ...... کیا ہوا ہے، میرا بچہ کہاں ہے۔" امی آہستہ آہستہ بمشکل چلتے ہوئے باہر آ رہی تھیں۔

"سارہ! سنبھالو خود کو، امی کو کچھ ہو گیا تو...... ہوش کرو۔" ناصر بھیا نے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا تو اس نے جلدی سے چہرہ صاف کر لیا۔ عامر بھیا اور غزل بھابی بھی آ چکے تھے۔

"میرا ایک دوست ہے ڈیفنس منسٹری میں، سیکرٹری ہے۔ اس کی طرف جاتا ہوں، مجھے پتا تھا، ایک دن یہ یہی گل کھلائے گا۔" عامر بھیا جلدی جلدی اپنی گھڑی، موبائل اور والٹ لیتے باہر کی طرف بڑھے۔

"میں بھی اعتزاز الحق کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ آج کل ایم این اے ہیں اور حکومت میں خاصے اہم بھی۔"

ناصر بھیا کو یاد آیا تو فوراً اٹھے۔ اسی وقت عزم اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے کی اڑتی رنگت سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بھی یہ خبر سن کر آ رہا ہے۔

"ناصر بھیا! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" وہ ان سے مصافحہ کرتے ہوئے پریشان لہجے میں بولا۔"

"بس عزمی! دعا کرو، اللہ خیر کرے۔ سال بھر سے تو اس کی کچھ خبر نہیں تھی اور اب...... اللہ خیر کرے۔ اب خبر ملی تو زندگی بھی ہوا اس کی۔" ناصر بھیا متفکر چہرہ لیے باہر کی طرف بڑھ گئے۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" عزم ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ طلحہ پہلے ہی عامر بھیا کے ساتھ جا چکا تھا۔ وہ امی کو سمیٹے بیٹھی تھی جو بے آواز آنسوؤں سے روئے جا رہی تھیں۔

"امی! پلیز روئیں نہیں، دعا کریں۔ میں بھی نفل پڑھ کر دعا کرتی ہوں۔" سارہ کہتے ہوئے اٹھی ہی تھی کہ امی کی عمر کی ایک اجنبی خاتون انیلا بھابی کے ساتھ اندر داخل ہوئیں جنہیں دیکھتے ہی امی کی سسکیاں بند ہو گئیں۔

"آپا خالدہ! میں کس موقع پر آپ کے گھر آئی ہوں۔ اتنے برسوں سے ارادہ باندھ رہی تھی، آج آئی بھی تو کس کڑے مرحلے پر۔ اللہ بچے کی خیر کرے، اسے اپنی امان میں رکھے۔" وہ امی سے لپٹ کر رونے اور تسلی دینے لگیں۔ سارہ امی کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا!" وہ امی سے علیحدہ ہوتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئیں۔ "تم سارہ ہو نا، میں آسیہ ہوں، عزم کی والدہ۔

وہ اپنا تعارف کرانے لگیں تو سارہ سلام کر کے باہر نکل آئی۔ اس وقت تو اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار نظروں کے سامنے انس کا کمزور وجود، مرجھایا ہوا چہرہ، اندر کو دھنسی آنکھیں آ رہی تھیں۔

"یا اللہ...... میرے بھائی کی خیر ہو، اسے میری عمر بھی لگا دینا۔ اس کے جذبے کی تجھ کو خبر ہے، اس جذبے کے طفیل اسے زندگی دینا۔ وہ ہمارے پاس لوٹ آئے۔ میرے اللہ میرے بھائی کو بچا لینا۔ اس کی نگہبانی فرمانا۔" سجدے میں گر کر اس کی ہچکی بندھ گئی۔

آج پہلا روزہ تھا اور اسے تو رمضان کے شروع ہوتے ہی امید بندھ گئی تھی کہ اب انس آ جائے گا جیسے وہ پچھلے رمضان میں لوٹ آیا تھا۔ اس کی خبر تو مل گئی تھی مگر اس حال میں...... پھر اڑتالیس گھنٹے گزرے گئے۔ کیسے گزرے جیسے کوئی لحہ لحہ کند چھری سے ذبح ہوتا ہے، اسی طرح ان کی گردنیں وقت کی کند چھری کے نیچے آئی ہوئی تھیں۔

"سارہ! آپ حوصلہ کریں، اللہ بہتر کرے گا۔ آنٹی کا خیال کریں، دو دن میں وہ آدھی رہ گئی ہیں۔ آپ ان کے سامنے اس حلیے میں جائیں گی تو ان کا دل اور برا ہوگا۔"

رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ملگجے لباس میں بکھرے حلیے کے ساتھ وہ امی کے لیے دلیہ لے کر جا رہی تھی۔ جب عزم نے اسے دروازے پر ہی روک لیا۔

"پلیز اس وقت مجھے کچھ مت کہیں، میں کچھ نہیں سنوں گی، مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ میرا بھائی، میرا دوست عزم! میرا وہ بھائی بہت اچھے دل والا ہے، میرے اللہ اسے بچا لینا میرے اللہ۔" وہ کھڑے کھڑے جیسے بکھر سی گئی تھی۔ دروازے کا سہارا لیتے ہوئے لڑکھڑا سی گئی۔ عزم نے اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔

"پلیز بی بریو۔ آپ تو بہت ہمت والی ہیں پھر اس طرح خود کو بکھیرنا۔ سارہ! میں آپ کی

ہمت دیکھ کر رشک کیا کرتا تھا پھر یہ بزدلی کیوں پھر آپ کا بھائی تو اللہ کے راستے میں ہے، اسے کچھ بھی نہیں ہوگا۔" وہ اسے بہت نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ سارہ کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

"نہیں میں اتنی بہادر نہیں ہوں، نہیں ہوں، نہیں ہوں۔" وہ شاید وہیں گر پڑتی کہ طلحہ کی پکار نے دونوں کو چونکا دیا جو ادھر ہی آ رہا تھا۔

"پھپھو! مبارک ہو۔ انہوں نے چاچو کو چھوڑ دیا۔ انس چاچو کو چھوڑ دیا۔ ابھی ابھی نیوز آئی ہیں۔ انہوں نے انس چاچو کو کچھ شرائط منوا کر چھوڑ دیا ہے۔" طلحہ کی پرجوش آواز پر جیسے سارے گھر میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ پل بھر میں پورے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہا تھا۔ امی خوشی سے کبھی ہنس دیتیں، کبھی روتیں۔ آسیہ آنٹی کل سے ادھر ہی تھیں۔

"سارہ، سیما، غزل...... جلدی کرو، روزہ افطار ہونے کو ہے۔ میری بہن کل سے آئی ہے، کیا انتظام کیا ہے افطاری کا۔" امی کی پرجوش آواز پر خواتین کچن کی طرف بھاگیں۔

"مبارک ہو سارہ!" عزم نے اسے خوش دیکھ کر کہا۔

"تھینک یو۔" وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ناصر بھیا اور عامر بھیا ابھی انس کو پاکستان لانے کے انتظامات ہی کر رہے تھے۔ ان کی خوشی کو ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ انس کی شہادت کی خبر مل گئی۔ روضہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قریب جو اتحادی افواج کا کیمپ تھا، انس نے اپنے چند ساتھیوں سمیت خونی ہتھیاروں اور بموں کے ساتھ رات کے تیسرے پہر حملہ کیا تھا۔ اس نے خودکش حملہ نہیں کیا تھا بلکہ دشمن کے کیمپ پر حملہ کیا تھا۔ گیارہ فوجیوں کی جان اس حملے میں گئی اور کیمپ آدھے سے زیادہ تباہ ہو گیا تھا، وہاں سے نکلتے ہوئے دشمن نے مارٹر گولوں سے ان جانبازوں کو آن کی آن میں راہ حق کے بلند ترین درجے پر فائز کر دیا تھا۔

پہلے روزہ کو انس کے زندہ ہونے کی خبر آئی تھی اور تیسرے روزہ کو اس کی شہادت کی۔

"امی! وہ ہم سب سے علیحدہ تھا۔ منفرد ممتاز۔ اس نے اپنے لیے علیحدہ ہی رستہ چنا اور اس میں کامیاب ہوا۔ اللہ کے پسندیدہ رستے پر امی آسمان پر اڑتے پرندے کی طرح اس کی روح ہلکی پھلکی ہو کر اسے اس دنیا کی آسودگی سے بہت اوپر اعلیٰ مقام کی طرف رواں ہے امی! آپ خوش قسمت ہیں۔ آپ شہید کی ماں کہلا رہی ہیں۔ آپ روتی کیوں ہیں۔ اسے دکھ ہوگا آپ کے آنسوؤں سے۔" عامر

بھیا امی سے لپٹ کر رو پڑے۔

"یادوں کی بازگشت اسے وادی وادی بھٹکا رہی تھی، بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی بھرپور جوانی اور موت کے اندھیروں کے حوالے انس میں اب تمہیں کبھی دیکھ نہ پاؤں گی۔" وہ اسے یاد کرتے پھر رو پڑی۔

"سارہ! اٹھیں نا یہ کون سی جگہ ہے یوں بیٹھ کر رونے کی۔ میں آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ آیا ہوں۔ سب آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔" طلحہ اس کے پاس کھڑا تھا۔

"تم چلو، میں آتی ہوں۔" وہ رخ پھیر کر بولی۔ آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

روزے بھی گزر گئے اس کے ایگزام بھی ہو گئے مگر آنکھ کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے اس کے پیپرز اچھے نہیں ہوئے تھے، مگر اسے جیسے پروا نہیں رہی تھی اور آج تو چاند رات تھی۔ صبح ہی سے دل کا پیالہ بھرا جا رہا تھا، روزہ، افطار کرتے ہی وہ اوپر آ گئی تھی۔ چاند نظر نہیں آیا تھا، مگر نظر آنے کا اعلان ہو گیا تھا۔ پٹاخے، شور، آوازیں، ہنگامے اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"اُفوہ طلحہ تم! ابھی اوپر آ کر سو گئے ہو۔ چلو نیچے، سب بلا رہے ہیں۔" پنکی کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اوپر آ کر بولی۔

"بھئی پھپھو کا بھی ابھی ہوا خوری کا موڈ ہے، میں کیا کروں۔" طلحہ بے بسی سے بولا۔

"ہٹو تم، آئیں سارہ نیچے۔ باقی کی ہوا اور کسی روز کسی اور کے ساتھ کھا لیجیے گا۔" وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی سیڑھیوں تک لے آئی۔

"پنکی! یہ کیا زبردستی ہے، صبر کرو میں آ رہی ہوں۔" وہ جھنجلائی۔

"زبردستی تو ابھی آپ کے ساتھ ہونے جا رہی ہے۔ آپ نیچے تو چلیں۔" پنکی بولی۔ طلحہ ان کے پیچھے تھا۔

نیچے لاؤنج کی ساری لائٹیں آن تھیں۔ سب ہی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ آسیہ آنٹی، انیلا بھابھی اور عزم کے علاوہ باقی گھر کے سب لوگ بھی بیٹھے تھے۔

"آؤ آؤ سارہ بیٹا! بہت راہ دکھائی۔ بھئی خالدہ! ہماری بیٹی تو بہت کمزور ہو گئی ہے اسے۔"

"یہ روزے رکھ رہی ہیں۔" طلحہ نے لقمہ دیا۔

"روزے تو تم نے بھی رکھے ہیں اور پنکی نے بھی، بلکہ پنکی نے تو لگتا ہے چالیس روزے

رکھے ہیں۔" عزم کا اشارہ شاید پنکی کی برقرار صحت کی طرف تھا۔

"سارہ نے خضوع و خشوع سے رکھے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" طلحہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

"خضوع و خشوع سے روزے رکھو تو دعائیں جھٹ پٹ قبول ہو جاتی ہیں۔"

"بیٹا! تم ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔" آنٹی نے امی اور اپنے درمیان اس کے لیے جگہ بنائی۔ اس نے بیٹھتے ہوئے سامنے دیکھا۔ سیما بھابھی آخری صوفے پر بجھی بجھی سی بیٹھی تھی۔

"دیکھو بھئی خالدہ! اب تو کوئی اعتراض نہیں۔ انس اللہ کی راہ میں گیا خوش بختی ہم سب کی۔ وہ ہوتا تو دوگنی خوشی ہوتی سب کو۔ وہ ایسی راہ پر گیا ہے جو مومن کے ایمان کی معراج ہے، خوش قسمت ہے وہ جو اس کو پا گیا۔ وہ زندہ ہے مگر ہم اس کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ سارہ بیٹی! آپ پڑھی لکھی ہو، سمجھ دار پھر بھائی کو اللہ نے اتنے اچھے منصب پر فائز کیا۔ یوں رو دھو کر اس کے جذبے کی توہین مت کرو۔" وہ رکیں۔ "اب میں نہ دیکھوں کسی کو روتے دھوتے۔ وہ تو سب کا بیڑا پار لگا گیا۔ اللہ اس کے درجات بلند کرے۔

تو ناصر بیٹا! عامر بیٹا اور خالدہ بہن! اجازت ہے میں اپنی بچی کو اپنی نشانی دوں۔" کہتے کہتے پتا نہیں کدھر سے انہوں نے مخملیں ڈبیہ نکالی ایک لمحے کو سب کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے ڈبیا میں سے انگوٹھی نکالی اور اسے پہنا دی سب نے مبارک باد دی۔ سارہ سر جھکائے حیران سی رہ گئی۔

"آج سے سارہ میری بیٹی، عید کے بعد انشاء اللہ ہم اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جائیں گے۔" وہ اسے ساتھ لپٹا کر پیار کرنے لگیں، اب سیما بھابھی کے بجھے بجھے چہرے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

"امی نے مجھ سے پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔" اس نے گلہ آمیز نظروں سے امی کو دیکھا۔

سونیا آپی خوب چہک رہی تھیں۔

"بھئی سونیا! آج اپنے ہاتھوں کی زبردست سی کافی تو پلواؤ۔" عامر بھیا نے ان کا موڈ اچھا دیکھ کر فوراً فرمائش جڑ دی۔

"صرف کافی۔" سونیا ہنسی۔ "آج تو آپ کافی کے باغوں سے کافی لانے کو کہتے تو مجھے تیار پاتے۔"

"کیوں کیا عمران بھائی تمہیں آج کل ٹارزن بننے کی تربیت دے رہے ہیں۔"

"چاچو! مسز ٹارزن کہیں۔" طلحہ بولا۔

"تم لوگوں کو کافی چاہیے کہ نہیں۔" سونیا نے دھمکایا۔

"بھئی میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" انہوں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔

"ایکسکیوزمی۔ مجھے ذرا اندر جانا ہے آنٹی۔" سارہ کو گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ معذرت کرتے ہوئے اٹھی اور سیڑھیوں کی طرف آ گئی۔ اس وقت اسے اپنا کمرہ ہی جائے پناہ نظر آ رہا تھا۔ عزم نے گردن موڑ کر اسے اوپر جاتے دیکھا۔ پنکی نے عزم کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلا کر اٹھ گیا۔

"پنکی! یہ کیا مذاق ہے یہ سب۔" پنکی جیسے ہی اوپر آئی، وہ اس پر برس پڑی۔

"کیسا مذاق۔" پھپھو یہ تو انگوٹھی ہے مذاق تو نہیں۔"

"پنکی پلیز، بی سیریس، میں بچی نہیں ہوں کہ مجھے یونہی بہلایا جا سکے۔ میں جانتی ہوں۔ انیلا بھابھی نے تمہاری بات کی تھی سیما بھابھی سے اور انہوں نے امی سے بھی بات کر لی تھی، پھر فیصلے میں یہ اچانک تبدیلی کیوں؟" وہ پھٹ پڑی۔

"مائی ڈیر پھپھو! انیلا بھابھی ان بہوؤں میں سے ہیں جو اپنی ساسوں کو تکلیف دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں، چاہے اس کھیل میں وہ دوسروں کی عزت نفس سے کھیل جائیں۔" پنکی کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔

"انہوں نے صرف عزم کی ماما کو تیز کرنے کے لیے یہ شوشا چھوڑا تھا حالانکہ عزم نے آپ ہی کا نام لیا تھا۔ انہوں نے آپ کا نام لے کر ہی بھابھی کو بھیجا تھا۔ انہوں نے بالکل ہی غلط بیانی کر دی بغیر سوچے سمجھے۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ "اور بعد میں سب سے معذرت کر لی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"اور تم..... تمہارا چہرہ بھی غلط بیانی کر رہا ہے۔" سارہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"پھپھو! عزم صاحب اور میری عمروں میں فرق کا آپ کا علم ہے نا۔" وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ان جیسے شخص کو ہم لاابالی لڑکیاں آئیڈیلائز تو کر سکتی ہیں مگر ان کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار سکتیں۔ یہ ڈیشنگ اور ہینڈسم نظر آتے ہیں، اور مائنڈ ان کا ہوتا ہے پچاس برس کے بوڑھوں کا اور آپ چاہتی ہیں آپ کی پنکی ایک بڈھے کے ساتھ زندگی گزار کر پنک سے وہائٹ بلکہ بلو ہو جائے۔" وہ پھر ہنسی۔

"پنکی! جھوٹ مت بولو مجھ سے۔"

"کیوں میں کیوں جھوٹ بولوں گی آپ سے۔ بتائیں مجھے۔"

"ہاں تاکہ....." سارہ کو جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ "مجھے یہ شادی نہیں کرنی بس۔" وہ الجھ کر بولی۔

"تو آپ اپنے فیانسی سے اس سلسلے میں بات کریں۔ آ جائیں فیانسی صاحب۔" وہ کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھی تو ساتھ ہی عزم اندر داخل ہوا، پنکی اسے گڈ وشز کا اشارہ کرتی باہر نکل گئی۔

"باہر آ کر وہ نیچے جانے کے بجائے اوپر بھاگ گئی، کیونکہ اس وقت رونے کے لیے دل کا غبار نکالنے کے لیے اسے تنہائی کی سخت ضرورت تھی، نوعمری کا پہلا پہلا دکھ تھا جا۔ تے جاتے ہی جائے گا۔" اس نے خود کو دلاسا دیا۔

"آپ کیوں شادی نہیں کرنا چاہتیں مجھ سے۔" وہ براہ راست اس سے آ کر بولا۔

"یہ غلط ہے۔ پہلے آپ لوگوں نے پنکی کے لیے بات کی اور اب یہ کوئی مذاق ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

"نہیں یہ واقعی مذاق نہیں۔ یہ زیادتی ہے، اور غلط حرکت بھی جس کے لیے میں نے، امی نے، انیلا بھابھی کی طرف سے معافی بھی مانگی ہے، آپ سے بھی مانگ لیتا ہوں۔ یوں بھی شادی کے بعد تو یہ کام تواتر سے ہونا ہے۔ میری ابھی سے پریکٹس ہو رہی ہے۔" وہ اس کے مذاق پر بھی نہ مسکرائی۔

"آپ کو معلوم ہے، اس طرح کتنے لوگ ہرٹ ہوئے ہیں، صرف آپ کی غلط بیانی سے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"معلوم ہے مجھے، اسی لیے تو سب سے معافیاں مانگتا پھر رہا ہوں۔ کیا میں آپ کو پسند نہیں۔" چند لمحوں بعد وہ بولا۔

"یہی سوال میں آپ سے کروں گی، مگر ذرا اور طرح..... اگر میں آپ کو پسند تھی یا آپ کا ایسا ارادہ تھا تو پنکی کے ساتھ کیا تھا۔"

"پلیز سارہ! پنکی میری بھتیجی کی طرح ہے۔ میں اس رشتے کے بارے میں مزید اور باتیں نہیں سن سکتا۔ پہلے ہی خاصی خجالت اٹھا چکا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "آپ مجھے پہلے دن سے پسند آ گئی تھیں یہ بھی چانس کی بات ہے کہ امی نے مجھے جن لوگوں کے پاس بھیجا تھا، آپ ان میں سے ہی

تھیں میں تو خود سے یا انیلا بھابھی کے ذریعے یہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ امی کا انتظار کرتا تھا کہ انیلا بھابھی کی عجلت پسند طبیعت نے اور آپ کو میری پنکی کے ساتھ فرینک نیس نظر آ گئی۔ میری آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی نظر نہیں آئی؟"

"میں لوگوں کی آنکھوں میں نہیں جھانکتی پھرتی۔"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے۔ اسی لیے تو اس قدر دکھ اٹھاتی ہیں۔ سچ کا ادراک دیر سے ہوتا ہے آپ کو۔ مفروضوں سے خود کو گھائل کرتی رہتی ہیں۔"

"مگر میں نے آپ کے ساتھ اپنے لیے کبھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔"

"سارہ! میں کہہ چکا ہوں لو ان فرسٹ سائٹ والا معاملہ ہوا تھا میرے ساتھ...... کافی حد تک مگر میں اسے جھٹلاتا رہا۔ محبت کے ہاتھوں کون ٹریپ ہونا چاہتا ہے پھر آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، آپ کی شخصیت کے اچھے پہلو نظر آئے تو میرا چونکنا لازمی تھا، ایسی...... ایسی ہی لڑکی کی تو مجھے تلاش تھی، جو کسی کے درد کو محسوس کر سکے جس طرح تم آنٹی کی خدمت کرتی ہو۔ ان کے لیے تم نے اپنا کیریئر تک قربان کر دیا۔ میں اس سے بہت انسپائر ہوا ہوں میری دونوں بھابیاں...... میری والدہ کو کبھی انہوں نے وہ مقام نہیں دیا جس کی وہ مستحق تھیں۔ اس لیے میں نے دل میں پختہ عہد کر رکھا تھا کہ شادی اس لڑکی سے کروں گا جو میری امی کو کم از کم اپنی ماں نہ سہی میری ماں تو سمجھے گی۔"

"تو آپ اس لیے مجھ سے شادی کر رہے ہیں اگر میں شادی کے بعد ویسی نہ نکلی تو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کے بارے میں میرے دل نے گواہی دی ہے اور دل کی گواہی جھوٹ نہیں ہوتی۔"

"عزم! مجھے یہ سب ذرا اچھا نہیں لگا۔"

"اس سادگی سے یہ منگنی۔"

"نہیں، میری رائے لیے بغیر...... پنکی! سیما بھابھی کیا سوچتی ہوں گی میں نے ان کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔" اس نے دل کی الجھن کہہ ڈالی۔

"کم آن سارہ! کوئی کسی کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالتا۔ ہر کوئی اپنا نصیب کا لکھا پاتا ہے اور یہ تمہاری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے، جو یہ محسوس کر رہی ہو، ورنہ ایسا تو انہیں سوچنا چاہیے تھا۔ زندگی میں سب چھین جھپٹ کر نہیں ملتا۔ کچھ نصیب کا لکھا بھی ہوتا ہے۔"

"مگر مجھے یہ پسند نہیں۔"

"میں تو پسند ہوں نا۔"

"ابھی بھی الجھ رہی ہو۔ یار! چھوڑ دو اب ان الجھنوں کو اور کوئی اچھی بات کرو۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ کافی بن چکی ہے اور آپ دونوں کو نیچے تلاشا جا رہا ہے، اس سے پہلے کہ کوئی اوپر آ جائے۔ عزم پھپھا! آپ نیچے تشریف لے جائیں۔" پنکی کافی کے دو مگ ہاتھ میں لیے اندر آ کر بولی۔ "اور مزید اچھی باتوں کے لیے انتظار فرمایئے۔" وہ ایک مگ سارہ کو پکڑا کر خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ظالم سماج کے روپ میں تم ذرا اچھی نہیں لگ رہیں۔" عزم نے کہا۔

"آپ بھی مجنوں بنے ذرا اچھے نہیں لگ رہے۔"

"تمہیں تو میں پوچھ لوں گا غدار لڑکی۔ او کے سارہ تم دونوں۔" وہ جاتے جاتے رکا۔ "تیار ہو جاؤ، چاند رات ہے، شاپنگ پر چلیں گے، میں نیچے سے اجازت لے کر ابھی آتا ہوں۔"

"واؤ سچ پھوپھا۔" پنکی خوشی سے چلائی۔

"شٹ اپ پنکی۔ اگر تم نے دوبارہ مجھے پھوپھا کہا تو تمہیں لے کر نہیں جاؤں گا۔" وہ دھمکی دے کر باہر نکل گیا۔

"پھوپھا۔" پنکی کہہ کر خود ہی ہنسی۔ "اچھا ہے نا سارہ۔" وہ سارہ سے بولی جو اب کافی پی رہی تھی۔

"پنکی! تم خوش تو ہو نا۔" وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

"ہائے پھوپھو! میں آپ کی خوشی میں خوش نہیں ہوں گی تو اور کون ہو گا آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تو سارہ کے دل میں ڈھیر سارا اطمینان اترا آیا سا لگا۔ بہت بہت دنوں بعد پرسکون لمحے اس پر مہربان ہوئے ہیں۔ اس کے وجود کی ساری تھکن کافی کی بھاپ کے ساتھ اڑنے لگی۔

"اور پھپھو! اس کھیل میں کسی ایک کو تو دکھ ملنا تھا نا۔ مجھے یا آپ کو۔ اور آپ تو پہلے ہی بہت دکھ اٹھا چکی ہیں، اب کچھ دکھ میرے حصے میں اگر آ جائیں تو کیا برا ہے۔" پنکی کافی کے گھونٹ اتارتی سوچ رہی تھی۔

"انس تم ہوتے آج تو کتنا خوش ہوتے۔" سارہ کی ذہنی رو پھر بھٹکی۔

"یہیں تو ہوں تمہارے پاس۔ کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا۔" ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کا

پردہ سرسرایا تھا، خوشبو کا ایک جھونکا اندر آیا تھا۔ سارہ میں تمہارے پاس ہوں۔ تمہارے بہت قریب۔ زندہ کیا تم اس کا شعور نہیں رکھتیں۔'' یہ سرگوشی اتنی نمایاں تھی کہ سارہ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پنکی سامنے لگی پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے کافی پی رہی تھی۔

''ہاں انس! تم میرے پاس ہو، بہت پاس۔ میں محسوس کرسکتی ہوں تمہارا خون، تمہاری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ سب کو ایک دن احساس ہوگا امت مسلمہ ایک دن ضرور متحد ہوگی جب حق اور باطل آمنے سامنے ہوں گے پھر تم جیسے شہیدوں کو ضرور خراج تحسین پیش کیا جائے گا انس تم سرخرو ہو گئے۔''

ملت اسلامیہ کی زخمی عروس۔
رخسار پر لہو رنگ غازہ۔
آنکھوں میں حزن کی سیاہی، زلفوں میں سیاہ شبی کا ماتم
ہونٹوں سے رستا شہیدوں کا لہو۔
ماتھے سے لٹکا ہزیمت کا جھومر۔
اپنی بے بسی پہ نوحہ کناں ہے۔
صیہونیت کی خون آشام چڑیل۔
اپنے کریہہ پنجوں سے اس کی بچی کھچی قبا کو تار تار کرتی ہے۔
کوئی ہے کوئی ہے۔
کوئی ہے۔
جو مجھے مٹنے سے بچائے۔
میرے سینے میں سسکتے نوحے اس سے پہلے کہ دم گھٹ کر رہ جائیں۔
کوئی ہے۔
بھگتی رات جیسے کہہ رہی تھی، کوئی ہے۔

☆☆☆